میرا پسندیدہ افسانہ

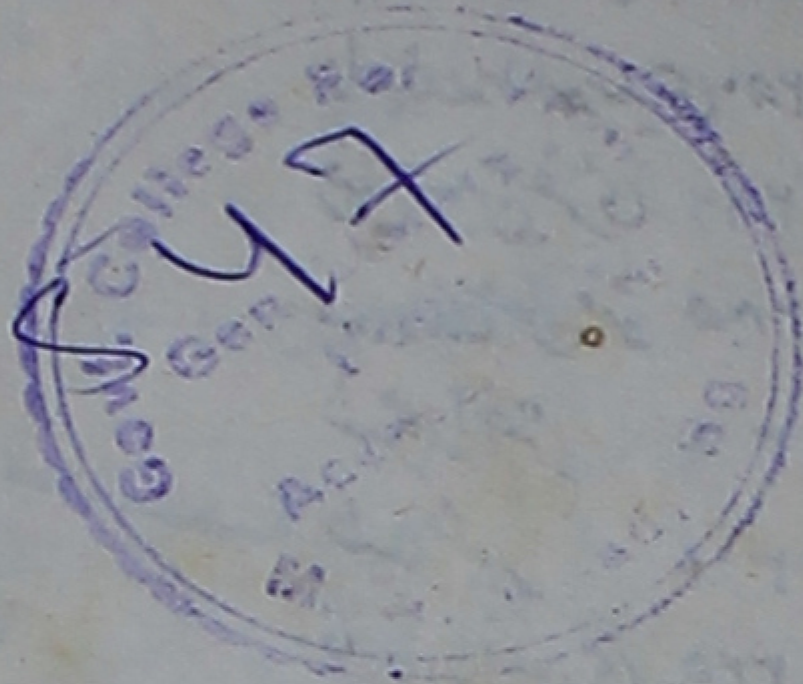
مُرتّبہ :

!-

بار موت ہی میرے کمزور کاندھوں سے اتارے گی --!!

اپنی زندگی کے قرض اور اس فرض کے نام ——!

جس کا بار موت ہی میرے کمزور کاندھوں سے اتاریگی ——!!



پیش نامہ

کیفیت

ابوالفضل صدیقی ۲۷

احتشام حسین ۶۸

احمد ندیم قاسمی ۷۵

ادیب ۹۲

اعظم کریوی ۱۰۵

اوپیندر ناتھ اشک ۱۳۲

بلونت سنگھ ۱۵۱

چندر کانت ۱۷۰

خلیق ابراہیم ۱۸۵

دیوانہ مصطفیٰ آبادی ۱۹۶
دیوندر ستیارتھی ۲۳۴
راجندر سنگھ بیدی ۲۵۰
رفیق حسین جعفری ۲۶۶
سعادت حسن منٹو ۲۸۵
شبیر محمد اختر ۳۰۱
شیلا شمیر ۳۰۷
قیسی رامپوری ۳۲۵
کرشن چندر ۳۴۲

This book is good for nothing

پیش نامہ

میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے۔ کہ اپنے دور کے تمام اچھے اچھے ادیبوں کی ذہنی کاوشوں کو محفوظ کر دوں۔ اور آنے والے نقاد کے لئے ایسے مواقع پیدا کروں۔ کہ اسے ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔ اور مجھے اس بات کی خوشی ہے۔ کہ آج میری دیرینہ آرزو کا ایک حصّہ پورا ہو رہا ہے صرف ایک حصّہ۔

یہ صرف افسانوں کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ ہماری آپ بیتیاں ہیں۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں ہیں ہمارے ماحول کی داستانیں ہیں۔ ہماری جدوجہد کے روشن اور تاریک پہلو ہیں۔ اور اگر میں مبالغہ سے کام نہیں لے رہا۔ تو ہمارے ان آنسوؤں اور مسکراہٹوں میں آپ نہ صرف اپنے گرد و پیش کی زندگی کا عکس پائیں گے۔ بلکہ آپ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہو جائے گا۔ کہ ہمارا آج کا افسانہ نگار افلاکی نہیں بلکہ خاکی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ آسمان سے زیادہ اس زمین کو دیکھنے کا عادی جس پر وہ کھڑا ہے۔ اور اسے سنی سنائی سے زیادہ آنکھوں دیکھی عزیز ہے، اور وہ جانتا ہے۔ کہ ادبی تخلیق کے لئے خلوص ایک لازمی شرط ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہے۔ کہ ادب کے لئے محض صداقت اور خوش مذاقی سے کام نہیں چلتا۔ وہ واقعات کو ہمدردانہ تخیل سے

دیکھتا ہے۔ لیکن وُہ اپنے مشاہدہ پر اس وقت تک بھروسہ نہیں کرتا۔ جب تک وُہ اسے ماہرین فن کے مقرر کردہ ضابطہ و تکنیک کی روشنی میں اچھی طرح دیکھ نہ لے۔ اِس کے بعد وُہ ان واقعات کو ایک ابدی حیثیت سے وابستہ کر دیتا ہے۔

زندگی ہم سب کے لئے یکساں ہے۔ کیونکہ یہ افراد میں تمیز نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اِن افسانہ نگاروں کے یہ افسانے پڑھ کر یوں محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے یہ سب کے سب میری ہی زندگی کی تصویریں ہیں۔ ہاں میری اپنی ہی زندگی کے چند بکھرے ہوئے ٹکڑے اور چونکہ آپ بھی اسی زندگی کے ایک مسافر ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ انہیں پڑھ کر آپ کو بھی یہی محسوس ہوگا ہاں آپ کو بھی ان میں قدم قدم پر کسی نہ کسی صورت میں اپنی ہی زندگی جھانکتی ہوئی دکھائی دے گی۔

کیفیت

انسان کی تخلیق کے ساتھ اس کے جذبات وخیالات کے ارتقا کی تاریخ بہت پرانی سہی لیکن معلوم نہیں یہ کیا بات ہے ۔ کہ آج تک اس پر قبرستان کا سکوت طاری ہے ۔ ماہرین حیاتیات کی تحقیق کے مطابق موجودہ انسان کی عمر ۵۰ ہزار سال سے زیادہ نہیں ۔ مگر اس دوران میں اس کی زندگی مختلف سمتوں میں کٹتی، سمٹتی، پھیلتی اور الجھاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی کئی دور گزرے، کئی انقلاب آئے ۔ انسانی تاریخ کے اوراق خون سے لت پت ہوئے نسلیں تباہ ہوئیں ۔ زمین نے کئی روپ بدلے ۔ لیکن وہ زلزلوں، آتش فشانیوں بربادیوں اور اپنے مستقبل سے بے پروا ہو کر کولھو کے بیل کی طرح اپنی زندگی کے گرد چکر کاٹتا رہا ۔

ادبیات کی تاریخ پر روشنی ڈالنا بڑا کام ہے ۔ لیکن اس کو انسانی زندگی سے ــــ وہی زندگی جس پر قبرستان کا سکوت طاری ہے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ مگر افسانہ اتنی ہی پرانی چیز ہے ۔ جتنی یہ دنیا یہ انسان اور یہ زندگی ۔ گو اس زمانہ کا نقشہ سامنے لانے کے لئے تجسس لاحاصل ہے اور تحقیق بے سود ۔ مگر ہماری چشم تخیل تہذیب وتمدن کے اس

دور کو دیکھ سکتی ہے کہ شکاری شیر مار کر لایا ہو یا گھائل ہو کر آیا ہو۔ تو اس نے اپنے بال بچوں یا قبیلہ کے لوگوں کو سارا واقعہ کس انداز سے سنایا ہو۔ مگر انسانی فطرت کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ کہ ان واقعات کی یاد سینہ بسینہ افسانوی رنگ اختیار کرتی گئی۔ افسانہ ہمیشہ حقیقت کے شانہ بہ شانہ رہا ہے۔ یوں تو دنیا کی لائبریری میں جو کتابیں سب سے پرانی ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے قصے اور کہانیاں ملتی ہیں۔ لیکن آج سے تین ہزار برس پہلے کا بھوج پتر پر لکھا ہوا افسانہ اس بات کا بین ثبوت ہے۔ کہ افسانے کا خالق مشرق ہے۔ مشرقیوں سے یونانیوں، یونانیوں سے فرانسیسیوں، فرانسیسیوں سے روسیوں، روسیوں سے امریکیوں، امریکیوں سے انگریزوں اور پھر جرمنوں اور دوسرے ممالک نے اسے اپنے اپنے مخصوص ماحول کے مطابق اپنایا۔

قدیم یونانیوں اور مصریوں کے علم الاصنام کی دلآویز رنگینی ان کے افسانوں میں مضمر ہے۔ فرانس نے اس کی ہیئت کو یکسر بدل دیا۔ اطالیہ کے سب سے بڑے افسانہ نگار "بوکاچیو" کے رومانی افسانوں "ڈیکیمرون" کا درجہ نہایت بلند ہے۔ گو اس کے سو افسانوں میں ایک بھی ایسا نہیں۔ جہاں معاملہ کی بات عریانی یا بازاری پن کی حد تک نہ پہنچتی ہو۔ لیکن اس میں "بوکاچیو" کا قصور نہیں۔ آرٹسٹ ہمیشہ اپنے زمانے کی صحیح تصویر کھینچا کرتا ہے۔ اور اس نے بھی اپنا فرض ادا کیا۔

"بوکاچیو" کے متعلق چند باتیں قابل ذکر ہیں۔ وہ ۱۳۱۳ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ ایک اطالوی سوداگر سیر کی غرض سے پیرس آیا تھا۔ کہ وہ ایک فرانسیسی عورت کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس ناجائز تعلق کا نتیجہ یہ لڑکا تھا۔ اس کا باپ اسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ نیپلز میں اس لڑکے کو کاروباری تربیت دی گئی۔ سفری تاجر کی حیثیت میں اسے نئے نئے ملک اور شہر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ازمنہ وسطیٰ میں فرانس اور اٹلی کی سماجی زندگی سے وہ بخوبی واقف ہو گیا۔ چودھویں صدی میں یورپ کا اخلاقی معیار بہت پست تھا۔ بازاری عشق ہیرو

کامرغوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ "بوکاچیو" کے بہترین افسانوں کا موضوع عصمت فروشی ہے
اس کے زمانہ میں نوجوان واقعی محبت کی راہ میں جان دے دیتے تھے۔ منکوحہ عورتیں
خاوندوں اور خاوند اپنی بیویوں کی آنکھوں میں دھول ڈالتے تھے۔ یہ عجیب وغریب زمانہ تھا
کہنے کو تو عورت ایک قابلِ پرستش ہستی تھی۔ لیکن فی الحقیقت اسے جذبۂ شہوانی کی تسکین
محض کا صرف ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ نوخیز لڑکیوں کو ان کے باپ یا بھائی اِن کی مرضی کے
خلاف کسی اوباش امیر کے پلے باندھ دیتے تھے۔ ایسی حالت میں جو کچھ بھی ہو کم ہے۔ امیر
شراب کے نشے میں خراٹے لے رہا ہے۔ اور بیوی چپکے سے دروازہ کھول چاندنی رات
میں گلگشت کرتی ہوئی درخت کی گھنی چھاؤں تلے اپنے محبوب کے پہلو میں پہنچ جاتی تھی۔
عاشق اپنے ساتھ ایک چارہ گر بھی رکھتا تھا۔ جس کا یہ کام تھا۔ کہ خاوند کو گھر کی طرف آتا
دیکھ کر فوراً طنبورہ بجانا شروع کر دے۔ یہ خطرے کا سگنل تھا۔

"بوکاچیو" کے زمانہ میں محبت، مرد اور عورت کے ملاپ کا نام تھا۔ اس کے رومانی
پہلو سے سماج بالکل ناآشنا تھی۔ مگر اس آتشین جذبے سے مشتعل رہنا اور اس کی تسکین
کا فوری ذریعہ ڈھونڈنا معمولی بات سمجھی جاتی تھی ——— "بوکاچیو" کا کمال یہ ہے کہ اس نے
اس سماجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچ دی ہیں۔

۱۳۴۸ء میں طاعون نے اٹلی کو تباہ کر ڈالا تھا۔ لوگوں پر ایک ہیبت طاری تھی۔
زندگی ایک المیہ بن گئی تھی۔ "بوکاچیو" نے اپنے رنگین افسانوں سے دلوں کو پھر سے گرما
دیا۔ لوگوں میں زندگی کے فطری ذوق کو بیدار کر دیا۔ موت کو مضحکہ بنا دیا۔ "ڈیکیمرون" دراصل
ایک سو کمروں کا محل ہے۔ آرٹ کے اعتبار سے اِن کمروں کی عمارتی طرز قرونِ وسطےٰ
(اخلاقی لحاظ سے اس کا بیسویں صدی سے کوئی تعلق نہیں) کی ترجمان ہے۔ کشادہ دالان میں، شاداب
باغ ہیں۔ دریچے ہیں۔ حسین عورتیں ہیں۔ قمقمے اور قندیلوں کی روشنی ہے اور ———
کیوپڈ ہے۔ کہ تیر پر تیر چلا رہا ہے۔

میں نے "بوکاچیو" کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ وہ ترقی پسند فن افسانہ نگاری کا مسلمہ پیشرو ہے۔ لیکن آج بیسویں صدی کے تکنیک نے اس درجہ ترقی کر لی ہے۔ کہ "بوکاچیو" کی صرف دو کہانیاں معیاری مختصر افسانوں کی ذیل میں آتی ہیں۔ ایک تو دوسری کہانی جو دوسرے دن سنائی گئی۔ اور پھر چھٹی کہانی جو نویں دن سنائی گئی۔

فرانسیسی افسانوں میں افسردگی اور یاس پائی جاتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے ٹریجڈی پر ختم ہوتے ہیں۔ لیکن بعض نقادوں کا خیال ہے۔ کہ ان کی قنوطیت پسندی دراصل ان کی زندہ دلی کا پرتو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بہترین مختصر افسانے کے خاتمہ پر بھی پڑھنے والا ایک خلا سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن وہ تلذذ، شگفتگی۔ تاثر اور طرز نگارش کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔

روسی افسانے فرانسیسی رنگ و بو کے علاوہ وسعت اور گہرائی کے مظہر ہیں روسی افسانہ نگاروں کا رجحان ہمیشہ سے رجائیت کے خلاف رہا ہے۔ مطلق العنان حکومت کے خلاف ان کی حریت پسندی کا فطری جذبہ رہ رہ کر مشتعل ہوتا ہے لیکن پھیلتا نہیں۔ انقلاب کے شعلے دھوئیں کے بادل میں چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور یہ محض ازمنہ ماضیہ کے تخیل کی خصوصیت ہے جس کے باعث روسی ادب کا پس منظر ایک ختم نہ ہونے والے افق کی وسعت رکھتا ہے۔ اس میں گہرائی بھی ہے۔ اور بلندی بھی۔ جس کے باعث ان کے کردار اور پس منظر محض تصویر کے بجائے آرٹ کے سنگین مجسمے نظر آتے۔

امریکی افسانہ نگاروں میں اڈگر ایلین پو کا درجہ نہایت ممتاز ہے۔ اس نے مختصر افسانہ کو پروان چڑھایا۔ وہ طرز نو کے مختصر افسانوں کا حقیقی موجد ہے "پو" نے اپنی فنی خوبیوں سے دنیا بھر کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔

انگریزی افسانوں میں تصوف۔ مادیت اور اخلاق پسندی پائی جاتی ہے۔ مگر انگریزی مختصر افسانہ نگاروں میں کپلنگ کا اثر اس کی شاہیت پرستی کے باعث زائل ہو رہا ہے۔ ورنہ

وہ کبھی افسانہ نگاری کا خدا اور او ہنری اس کا پیغامبر سمجھا جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ او ہنری کے تکنیک کا اثر ۹۰ فی صدی انگریزی مختصر افسانوں میں اب بھی نظر آتا ہے۔

جرمن افسانے تو ہم پرستی اور تخیلاتی ہوتے ہیں۔ مگر آج امریکہ اور جرمنی کا افسانوی ادب ایک ہی سطح پر ہے۔

گزشتہ چند سال سے بلکہ درحقیقت ۱۹۲۷ء سے مختصر افسانہ نگاری میں ایک نئی روح کارفرما ہے۔ روسی ادیبوں نے زندگی ـــــ عورت اور سرمایہ داری کا تجزیہ کیا۔ کیونکہ بین الاقوامی تعلقات ان کے سامنے اتنا وسیع میدان لے کر آئے کہ پرانی چیزیں انہیں بے کار نظر آنے لگیں۔ ان کے ترقی یافتہ دماغ نے نئی راہیں دیکھیں۔ گویا پہلا انسان ختم ہو چکا ہے۔ اور ایک نئے انسان ـــــ ایک عالمگیر انسان نے جنم لیا ہے۔ وہ آرٹ کو مزدور کی جھونپڑی تک لے آئے۔ انہیں چاروں طرف کسان ہی کسان نظر آنے لگے۔ کدال ان کے لئے نئی تہذیب کا نشان بن گیا۔ روسی قنوطیت پسندی کا رجحان رجائیت کی طرف ہو گیا۔ اور ان کے قلب کی گہرائیوں میں درد و کرب کی چیخوں کے بجائے عالمگیر شادمانی کے قہقہے بلند ہوئے۔ انسان کی افسردگی میں ایک دل کشی سی آ گئی۔ اور انسانی فطرت کے تجزیہ میں پہلی سی درشتی اور تلخی نہ رہی۔

۱۹۱۷ء کے انقلاب کی حیرت انگیز کامیابی کے احساس کے زیر اثر انہوں نے آرٹ کے خدوخال میں ایک نئی دلآویزی پیدا کر دی۔ "بو کاچیو" اور زولا کی حقیقت نگاری اور "پو" کی تکنیک ایک نئی ہمہ گیر شان سے جلوہ آرا ہوتی۔ انہوں نے ہر ایک چیز کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ کہ ترقی پسند آرٹ باغیانہ عناصر اور یاس پسندی کا مظہر نہ رہا۔ بلکہ انقلاب تعمیر کا ترجمان بن گیا۔ اس ترقی یافتہ ادب کے ماتحت افسانہ نگار کا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ وہ تمام دنیا کے چھوٹے چھوٹے واقعہ کو گہری نظروں سے دیکھے۔ زندگی

کی باریکیوں پر نظر ڈالے اور دکھتی رگوں کو ٹٹولتے ہوئے زندگی کی بھیانک تصویروں کو شارع عام میں لٹکا دیتے۔ وہ انسانی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ پر اپنے تخیل کی بنیاد رکھ دے۔ وہ پھاوڑے کو ازرہ تکلف زرعی آلہ کہنے کی بجائے پھاوڑہ کہے۔ تہذیب انسانی کے رستے ہوئے ناسوروں کا خون اور پیپ دکھانے میں حجاب سے کام نہ لے۔ اور خاکی سے افلاکی غرور کو مٹا کر افسانہ کو زندگی کی تفسیر بنا دے۔ کیونکہ عالمگیر اخوت و آشتی کی یہی راہ ہے۔

ہندوستانی افسانہ نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جاتک کتھائیں۔ پنچ تنتر اور شکاسپتی ہمارے اولین افسانے ہیں۔ دوسرے دور کی بعض کتابیں زبان۔ فصاحت۔ طرز نگارش اور شیرینی کی وجہ سے آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ لیکن یہ سب کتابیں شاعرانہ دماغ کی پیداوار ہیں۔ ان کی کہانیاں ہماری کہانیاں نہیں۔ بلکہ کسی اور دُنیا کی ہیں جسے نہ تو ہم نے دیکھا ہے اور نہ کبھی دیکھنے کا امکان ہے۔

۱۸۵۹ء میں چند انگریزی افسانوں کے تراجم ہوئے۔ اس کے بعد دوسری یورپین زبانوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اس زبان کی بدولت ہندوستان میں مختصر افسانہ نگاری کا چرچا ہوا۔ مگر ہندیوں کو تخیلات کی دُنیا سے نہ نکلنا تھا اور نہ نکلے۔ وُہ تخیلات کی بھول بھلیاں میں بھٹکتے رہے۔ رفتہ رفتہ انسانی مذاق۔ تمدن اور ماحول کے ساتھ ساتھ افسانے بھی نئے نئے سانچوں میں ڈھلتے رہے۔ آخر ۱۹۳۶ء میں ایک نئے انسان — ایک عالمگیر انسان نے جنم لیا۔ اس نے ایک نئی دنیا بسائی جس کے عناصر کسی شخص کے محکوم نہیں بلکہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح اس کی بھی تخلیق ہو رہی ہے۔ اور اس کے خالق میں اس کا انتہائی نمونہ موجود ہے۔ اور آج روشنی کے زمانے میں افسانوں کی دُنیا بھی روشن ہے۔ ہمیں آج اپنی زبان کے افسانوں پر فخر ہے۔ یہ افسانے دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں پیش کئے

جا سکتے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار اپنے احساسات، مشاہدہ اور تخیلات کو اچھے سے اچھے انداز
میں پیش کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اور ساز ہستی کے ہر تار کو چھیڑتے
ہیں۔ ہمارا آج کا افسانہ زندگی کا مصوّر ہے اور اس کے افسانے ہماری زندگی کی تصویریں ہیں۔

(چودھری) ابوالفضل صدیقی

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے!
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

"میں کون ہوں؟" اس کا صحیح اور حقیقی جواب کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر تو
آج تک دے نہیں سکا۔ البتہ انبیا کرام اور اولیاء گرامی اس درجہ تک پہنچ گئے
کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ "میں کون ہوں" تو میرا شمار بھی مافوق البشر ہستیوں میں
ہوتا۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ "قارئین مجموعۂ ہذا کی معلومات کے لئے تو اتنا ہی
کافی تھا کہ لوگ مجھے "ابوالفضل" کہہ کر پکارتے ہیں اور میں کبھی کبھی اپنے ماحول کے تاثرات
کو کاغذ کے صفحات پر مستقل صورت دینے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میں جو کچھ ہوں
میرے لکھے ہوئے صفحات خود بتا سکتے ہیں ؎ ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا
مگر بشیر صاحب کی تعمیلِ ارشاد بھی ناگزیر ہے اس پر خودنوشت کی شرط اب۔ ذرا مشکل
کام ہے۔ حقیقت نگاری کا پہلو چھوٹنا نہیں چاہئے کہ یہ سوانح نگار کا فرض
اولین ہے۔ پھر ساتھ ہی ساتھ مشرقی انکسار بھی ملحوظ رہنا ضروری ہے۔ اگرچہ
اپنے یہاں انکسار کی گنجائش ہی نہیں۔ انکسار وہ کرے جو مایۂ افتخار ہو کیونکہ ؎
"تواضع زگردن فرازاں نکوست" اور اس گدائے بے نوا کے پاس بے مائیگی کے

سوا اور سرمایہ بھی کیا ہے لہذا اس عاصی کو سراپا انکسار ہونا چاہیئے۔ "گدا گر تواضع کند خوئے اوست" اس مختصر تمہید سے مع عراشتی کی معافی چاہتے ہیں بغیر اس کے کیا عرض کروں کہ میں ایک بے پڑھا لکھا گمنام آدمی ہوں جسے ہندی صاحب کی نظرِ انتخاب نہ معلوم کیوں منصۂ شہرت پر لانا چاہتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں نے جس گھر میں جنم لیا اور جس خاندان میں آنکھ کھولی اس کا ماحول علمی و ادبی ضرور تھا اور ہے۔ مگر میرے سینۂ عریاں پر نہ یونیورسٹیوں کے تمغۂ امتیازات ہیں نہ میری بوسیدہ کلاہ پر کسی دارالعلوم کا طُغرائے فضیلت! نام میرا "ابوالفضل" ضرور ہے مگر میری ذاتی قابلیت و علمیت کو اس نام سے اور اس ہمہتم بالشان ہستی سے جس کا محض میں ہم نام ہوں کوئی مناسبت نہیں۔

عارف پور نوادہ مضافاتِ بدایوں میری جائے سکونت ہے یہ میرے مورثِ اعلیٰ "محمد عارف" صاحب کی بسائی ہوئی ایک بستی ہے جو اب ایک قصبے کی شکل میں کہئے یا شہر کا ایک محلہ بتائیے بشرطیکہ شہر کو حدود چنگی تک محدود نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ بستی شہر سے نصف میل تین پختہ سڑکوں کے جنکشن پر واقع ہے اور چنگی سے باہر ہے۔ اور اس کو اچھے قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ دیہات کی پُرسکون زندگی کے ماحول کا امتیاز حاصل ہے۔ ہم لوگ سید علاؤ الدین کے وقت بدایوں میں آباد ہیں اور ہمارے مورث ان کے ہمراہ آئے تھے اور فوجی خدمات کے عوض ایک بڑی جاگیر اور "چودھری" کا خطاب شاہ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ حضرت شیخ محمد عارف کے والد شیخ مہتاب علی صاحب سید علاؤ الدین کے سپہ سالار تھے۔ اور یہ تھوڑے بہت قانون و تلوار کی پیہم زدوں سے بچے ہوئے مواضعاتِ زمینداری جو اس وقت ہم لوگوں کی روزی کے ظاہری اسباب کفالت ہیں اور چودھری کا لقب اس خاندان کے آثارِ شکستہ میں سے مسافر جا چکا لیکن ہے اس کا

نقش پا باقی۔ باعتبار نسب ہم لوگ شیوخ صدیقی ہیں۔ راقم کے مخصوص گھرانے کو ہمیشہ سے علم و ادب کی شوقیہ پرستش کا فخر حاصل ہے۔ میرے جد امجد جناب حاجی چودھری احمد حسن صاحب مرحوم جو اپنی بزرگ شخصیت اور ذاتی وجاہت اور اقتدار کی بنا پر شہر کے رکن سمجھے جاتے تھے۔ فارسی و عربی کے عالم و فاضل اور ایک اچھے ادیب اور فارسی و اردو کے خوش کلام شاعر تھے۔ اور اپنی علمی و ادبی قابلیت کی بنا پر شہر کی قابل ترین ہستیوں میں بھی سمجھے جاتے تھے۔ میرے والد صاحب قبلہ چودھری محمد ابوالحسن صدیقی بصیر ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) ۱۹۱۱ء کے گریجویٹ ہیں اور بدایوں کے ایک کامیاب اور کہنہ مشق وکیل۔ میرے دو چھوٹے بھائی ہیں۔ جن میں ایک مشہور ادیب چودھری ابو مسلم صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل بی ہیں۔ اور دوسرے ڈاکٹر ہیں اور ادبی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ میرے والد صاحب قبلہ ۱۹۱۰ء کے مخزن وغیرہ کے نامہ نگار ہیں اور فی الحال ملک کے سر برآوردہ ادیب و شاعروں کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں ؛

میری ولادت ۵ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ہوئی۔ والد معظم غالباً اولاد اکبر ہونے کی وجہ سے مجھ سے غیر معمولی انسیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے میری تعلیم کی اسکیم بھی کچھ علیحدہ مخصوص بنائی۔ غالباً یہ انہوں نے خود میری طبیعت کا رجحان دیکھ کر کیا ہوگا۔ کیونکہ میری طبیعت کو بدایوں کے اسکول کی فضا گولڈ اسمتھ کی طرح راس نہ آئی۔ طبیعت فطرتاً آزاد واقع ہوئی تھی۔ بچپن میں فارسی و قرآن مجید ختم کرنے کے بعد اسکول میں قدم رکھا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد سینئر کیمبرج تک پڑھا اور سینئر کیمبرج کے امتحانات کے بعد گویا خود کو فارغ التحصیل سمجھ لیا۔ مگر میرے تعلیم کے کفیل مجھ کو یوں چھوڑنے والے کب تھے انہوں نے ہمہ وقت اپنی معیت میں رکھا اور براہ راست تعلیم و درس کا طریقہ تو متروک ہو گیا مگر بالواسطہ خود بخود تعلیم ہوتی رہی

کیونکہ وہ خود ایک بلند پایہ ادیب اور خوشگو شاعر ہیں - یہانتک کہ مجھے
اور میرے ساتھیوں کو محسوس ہونے لگا کہ دماغ میں کچھ علمی شُد بُد پیدا ہو چلی -
طبیعت فسانہ نویسی کی جانب فطرۃً مائل تھی - لہذا ۱۹۳۲ء میں ڈرتے
ڈرتے اور اپنا اصلی نام " ابوشاہد " وغیرہ کے پردوں میں چھپاتے ہوئے
نیم مزاحیہ اصلاحی مضامین اور فسانہ نویسی اخبار " ریاست " وغیرہ میں
کرنے لگا - یہانتک کہ یہ سلسلہ بغیر توانا و بغیر تسلسل کے ۱۹۴۱ء تک
پہنچا - اور اب ادبی دنیا، صوفی، شاعر، وغیرہ رسائل میں انمل بے جوڑ
واقعات و مشاہدات کو فسانوں کی صورت میں لاکر شائع کرا دیتا ہوں -
یہ ہے مختصر خاکہ میری اُردو نویسی کا مگر آپ سوانح حیات چاہتے ہیں
لہذا اس کے لئے ضروری ہے کہ کچھ اپنے پرائیویٹ حالات بھی تحریر
کروں اور چند سطروں میں اپنی زندگی کا خلاصہ تحریر کر دوں - تاکہ یہ چیز
مکمل ہو جائے -

بچپن میں طبیعت کے اندر انتہائی شوخی اور شرارت تھی - بازووں
پر تھوڑے سے اعصاب اور چہرہ پر چند بالوں کا اجتماع ہوتے ہی بچپن
کی معصوم شرارتیں زندگی سے زیادہ ملحق نظر آنے لگیں - اور ذی اختیار
اور خود مختار شکل میں زیادہ منظم ہو گئیں - خونخوار کتوں، سبک رفتار گھوڑوں
اور آہنی و آتشی آلات کی مدد سے جنگل کی سنسان وسعتوں میں بے زبان
مخلوق کے خون سے ہولی کھیلنا شروع کی اور قانون قبضۂ آراضی کے ہنٹروں
سے تاریک و غیر متمدن انسان نما حیوانوں کی بستیوں میں مزدور کسان
کی دولت کی لوٹ مار کا آبائی کام ہاتھ میں لیا - تخریبی قوتیں پوری پوری
طرح بیدار ہو گئیں اور آج بھی ارتقائی منازل طے کر کے جزو حیات اور

فخرِ زندگی بن رہی ہیں۔ ایک نے Sportsman کا لقب دیا اور
دوسری نے منتظم سیاست دان زمیندار وغیرہ القاب دیئے۔ ایک تو محض
لہو گرم رکھنے کا بہانا ہے اور دوسری وجۂ معاش۔ اور خدا کے فضل سے دونوں
آج بھی ویسی ہی روز افزوں زندہ ہیں جیسی کہ روزِ اول تھیں۔ اور اس کے گریز
ہیں قلم سے سر دھنتا ہوں جسے لوگ فسانہ نویس کہہ دیتے ہیں۔ غرض ایک
ایسا آدمی ہوں جس کے اقوال اس کے افعال سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے
اور جو غالباً کسان کے کلیجے کی ٹیس اسی معیار سے محسوس کرتا ہے۔ جس معیار
سے اُڑتی ہوئی مرغابی کے بندوق مارنے کے بعد فضا میں اس کا رقصِ بسمل طبیعت
فطرتاً دنیوی ذمہ داریوں سے مبرا ہے۔ حالانکہ بیس سال کی عمر میں بنتِ عم
سے منسلک کر دیا گیا جو قدیم عرب رسم کے مطابق یوں بھی ایک شاعر و ادیب
کا قدرتی حق ہوتی ہیں۔ اور اب صحیح معنی میں شریک زندگی ثابت ہو رہی ہیں۔
چار بچوں کا باپ ہوں مگر اپنے سب غیر شادی شدہ آزاد دوستوں سے زیادہ
آزاد ہوں۔ تعقلاً کبھی بندوق اور کبھی قلم۔ جیسا آپ حضرات میرے قلم کا اندازہ
کرتے ہیں۔ اس سے کچھ زیادہ میرے شکاری ساتھی میری بندوق کا۔ پھر بھی
باعتبارِ مشاغل جسم جثہ عادات و خصائل اہلِ قلم سے زیادہ اہلِ سیف کہلانے
کا مستحق ہوں ٭

بارہ

میں دل ہی دل میں خوش ہو ہو کر منشی سلامت رائے کو شاباش دے رہا تھا۔
بھلا مصطفیٰ گنج کی دو تین دکانیں ہستی ہی کیا تھی! ایسا آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا گاہک
پھانسا کہ پورے سولہ ہزار میں معاملہ کیا۔ واقعی پُرانا ملازم نمک حلال ہوتا ہے۔ آخر
دادا جان مرحوم نے کچھ دیکھ ہی تو لیا تھا جب ہی تو اتنی چھوٹی عمر اور ایسے نازک حالات
میں مختار عام بنا دیا تھا۔ خوب سودا کیا۔ پھر یہ سکنی جائداد مجھے ایک آنکھ تو بھاتی نہیں۔
ابھی ذرا سا زلزلہ کوئٹہ اور بہار میں آیا تھا۔ نہ معلوم کیسی کیسی عالیشان اور سنگین عمارات
تباہ و برباد ہو گئیں۔ بس ایک ہی جھٹکے میں ساری ریاست ختم۔ اور یوں بھی دن گذرے گا
پرانی ہو گی اور جمع گلے گی۔ بھلا ہماری زرعی جائداد کے کیا کہنے جتنا جُوتو کھودو اتنی ہی
قیمت بڑھے گی۔ پرانے کسانوں کا قول ہے کہ کھیتوں میں سونے کی سلاخیں ہاتھ
بھر گہرے پر دفن ہیں جو ہاتھ بھر زمین کھود لے گا۔ سونا نکال لے گا۔ پھر زرعی جائداد
کوئی مرمت نہیں مانگتی۔ آسمان سے پانی برسا اور زمین نے گھر بھر دیا نہ چور چرائے
نہ سادھو سنکے۔ حکومت کی حکومت، مشہور بات ہے کہ زمیندار طبقہ ہمیشہ سے ہندوستانی

حکومتوں کی ریڑھ کی ہڈی بنا رہا ہے اور سلطنت برطانیہ کی تو روح رواں ہے۔ اس
سکنی جائداد میں نہ کوئی عزت ہے نہ حکومت بھلا ایک دکان جس میں تو ایک پانوں والا
بیٹھتا ہے۔ وہ تمولی تو شاید مجھے پہچانتا بھی نہیں ہے! دوسری دکان میں وہ بساطی ہے
جب کبھی اُدھر سے نکلو تو دکان پر بیٹھے ہی بیٹھے "بندگی جناب" کے سلام کا جوتا سا رسید
کرتا ہے۔ بھلا یہ تو درکنار کسی لالہ بھائی زمیندار کے سرکش سے سرکش کاشتکار کی
بھی اتنی مجال ہو سکتی ہے کہ اس قسم کا سلام چوپال پر بیٹھے ہی بیٹھے دُور سے تار پر بھیج دیا
کرے۔ سولہ ہزار یہ مل گئے۔ بس چار ہزار کا انتظام اور کر لوں اور اسی سال فقیر آباد رہن
سے چھڑا لوں۔ بھلا غور تو کرو پردادا مرحوم ڈھائی ہزار سالانہ کی بچت کا موضع بیس ہزار
روپے میں رہن دخلی کر گئے تھے۔ وہ تو اگر کہیں رہن سادہ ہوتا تو ابھی ہم بے علم، جہاں سینکڑوں
موضعے نیلام ہوئے یہ بھی ہو جاتا اور آج ہمیں اس کا نام بھی نہ معلوم ہوتا۔ فقیر آباد پوری
ڈھائی ہزار روپیہ سالانہ کے منافع کی جائداد ہے۔ بھلا ان دکانوں سے کیا ہاتھ آتا تھا۔
پانسو روپیہ سالانہ اور اس میں بھی پچاس ساٹھ روپیہ ہر سال دسہرے پر منشی جی شکست و
ریخت کی مد میں حساب جمع خرچ میں دکھا دیتے تھے۔ بمشکل چار سوا چار سو روپے پلے پڑتے
تھے۔ چلو چھٹکارا ہوا، اور بہت اچھے چھوٹے۔ فقیر آباد!! آہا کیا اچھا گاؤں ہے۔ گھر سے کتنا
قریب پھر بھینٹ بے گار کے لئے کس قدر موزوں چمار کسان مراؤ گڈریوں سے آباد جتنا
دباؤ اتنے ہی تابعدار، وہ تو بنیئے نے کچھ بگاڑ دیا ہے ـــ بقایا لگان پر تین آنے روپے
کا سود لینا ہے بھلا! مگر گاؤں میرے یہاں کے قدیم رواجوں سے واقف ہے اور ابھی
تو چار چھ بوڑھے کاشتکار پردادا مرحوم کی آنکھیں دیکھے ہوئے بھی زندہ ہیں۔ ذرا دیر میں
سب کو ٹھیک کر لوں گا۔ مگر بار تو بیس ہزار ہے اور روپیہ سولہ ہی ہزار یہ چار ہزار کہاں
سے ملیگا؟ دو ہزار روپے کا تو بیگم کا فضول قسم کا زیور ہے۔ اب دو ہزار کا سوال رہ جاتا
ہے۔ ایک ہزار میں شہر کا مکان رہن کر دوں گا۔ دو تین روپے ماہوار کرایہ آتا ہے۔ سال

دو سال نہ سہی، پھر تو فقیر آباد کی آمدنی ڈیڑھ سال ہی میں زیور بھی بنوا دے گی۔ اور مکان بھی چھڑوا دے گی۔ حالانکہ محض ایک ہی سال کا قرضہ ہے۔ بھلا مجھے فقیر آباد کی آمدنی کو ہاتھ لگانے کا حق کیا ہوگا وہ تو میری آمدنی سے علیحدہ میرے اخراجات سے بالائر ایک نئی چیز ہوگی مگر یہ ایک ہزار کا سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہاں سے پورا ہوگا۔ ایک شکل سمجھ میں آتی ہے۔ چار سو روپیہ میں گھوڑی بک جائے گی! ایک سال دو سال کرایہ ہی کی سواری سہی پھر تو فقیر آباد موٹر خرید وا ہی دے گا۔ بیلوں کی بڑی جُٹ فروخت کرکے چھوٹی سو روپے والی لے لوں گا۔ دو سو روپیہ اس میں بچ رہیں گے۔ اب رہا چار سو روپے کا سوال یوں تو عنایت گنج کے کاشتکاروں سے برساتی ادھر ہی وصول کرکے پورے کر سکتا ہوں مگر پھر ادھر ساون بھادوں میں جاکر کیا سارے گھر کو فاقے کراؤں گا۔ گھر میں تو یہ حالت ہے کہ روپیہ بعد کو آتا ہے اور خرچ پہلے ہو چکتا ہے۔ ہم تو محض شمار کرنے کے گنہگار ہوتے ہیں۔ دراصل گھر کی بیوی ہی کسی قابل نہیں۔ اتنی بڑی آمدنی سال بھر میں کم و بیش سات آٹھ ہزار روپیہ ہاتھوں میں آتا ہے مگر سب توے کی بوند۔ مجال کیا کہ سو دو سو روپے بھی آڑے وقت میں نکال دیں۔ ان ہی پر کیا منحصر ہمارے خاندان کی سب لڑکیاں ایسی ہی غیر منتظم ہیں۔ کسی غریب گھر کی لڑکی ہوتی تو اتنی بڑی آمدنی پر چار ہزار تو چار ہزار دس ہزار نکال کر پھینک دیتی۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ چاہے کہیں سے لاؤ۔ ہمارے اخراجات پورے کرو۔ جب کوئی گھر میں وقت بے وقت بیمار پڑتا ہے تو یہی دیکھا کہ منشی سلامت رائے بیچارہ گھبرایا گھبرایا پھرتا ہے۔ کبھی عنایت گنج کے برساتی کاشتکاروں پر ہتھ پھیری ہوتی ہے اور کبھی چندن نگر اور دراب نگر کے بقایاداروں پر جوتا اترتا ہے۔ نام بڑا اور درشن تھوڑے گھر میں دس بیس چھوٹی بڑی میز کرسی اور صاحب کے سوٹ اور میم صاحب کے غرارے اور ساڑیوں کے سوا اور کچھ بھی ہے۔ اب یہ چار سو کیسے پورے کروں سوائے اس کے کہ پیاؤ والی بغیا کٹوا دوں۔ انگشت نمائی ضرور ہوگی مگر کیا کروں۔

کنوئیں پر دو درخت گولر کے کھڑے ہیں۔ وہ رہنے دوں گا۔ لوگ زیادہ اعتراض کریںگے تو
قلمی باغ نصب کر دوں گا۔ بھلا میں ہما شما کے اعتراضوں کو دیکھوں یا اپنی جائداد
کے بار کو آٹھ دس بیگھہ کا باغ ہے ایک سال بیچ ایک سال بہار دس پانچ روپے میں
بک جاتی ہوگی بے کار سی چیز ہے۔ راہگیروں کو البتہ گرمی کے موسم میں سائے کا ذرا
آرام رہتا ہے۔ چار سو روپے میں لکڑی فروخت ہو جائے گی ٹوٹل پورا ہو گیا۔ بھلا
جس وقت اپنے پردادا کا رہن کیا ہوا موضع چھڑا کر پہلی مرتبہ اس میں داخل ہوؤں گا
تو کیا عجیب سماں ہوگا۔ میرے خاندان کی ہسٹری میں پہلا موقع کہ قرض کی ادائیگی ہوئی
اور جائداد بار سے پاک ہوئی جس وقت میرا رتھ گاؤں میں داخل ہوگا تو کیسی خوشی کا
موقع ہوگا۔ تمام کاشتکار گاؤں سے میل ڈیڑھ میل باہر سوانہ پر میرے استقبال کے لئے
آئیں گے۔ میرے رتھ کے پیچھے پیچھے منشی سلامت رائے کا ٹٹو ہوگا اور آگے آگے ڈال سنگھ
اور فیض خاں مقدم گلے میں رنگ برنگی کارتوسوں کی پیٹیاں ڈالے کاندھوں پر بندوقیں
رکھے دائیں بائیں برچھے اور لاٹھیوں سے مسلح درجن بھر سپاہیوں کی قیادت کرتے
پورب والی گلی سے داخل ہوں گے۔ بوڑھے اور جوان سینکڑوں کاشتکار غول کے غول
بنا کر چوپالوں اور راستوں کے کنارے کھڑے ہوں گے۔ پھر باری باری سے نذر دے
کر میرے پاؤں چومیں گے۔ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے بنئے کے مظالم کی گویا شکایت
کریں گے اور پھر آہا ہا میں مجمع عام میں کھڑے ہو کر بقایا لگان پر سود کی منسوخی کا اعلان
کروں گا تو تمام گاؤں میں یک دم خوشی کی لہر بن کر یہ خبر دوڑ جائے گی اور سب کے
سب فرطِ مسرت اور میری محبت سے بے تاب ہو کر میری حمد و ثنا اور لاکھوں دعاؤں
کے پُرجوش نعرے بلند کریں گے۔ عورتیں چھپروں کے جھروکوں اور ٹٹیوں کی آڑ سے کھڑی
ہو کر میرے درشن کریں گی اور آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرتے ہوئے میرے اوپر تبصرہ کرینگی
اور رات کو گھر گھر ڈھول بجا کر میری تعریف کے گیت گائیں گی۔ وہ گیت جن میں حاکم

کے محصول معاف کرنے کا ذکر ہے۔ بھلا کجا فقیر آباد اور کجا یہ اُوجڑ بازار کی دُکنیاں!
لاحول ولا قوۃ! یہ جائداد تو کچھ ان ہی لالہ لوگوں کے لئے موزوں ہے۔ کھڑے ہوتے پہلی
تاریخ کو بھیک سی مانگ رہے ہیں "لاؤ کرایہ نہیں تو سود چلے گا"۔ مَیں اِن ہی خیالات
میں غلطاں و پیچاں تھا کہ منشی سلامت رائے نے رسید کی عبارت ختم کر کے روپے شمار
کئے اور رسید میری جانب بڑھا دی اور شمار کا سلسلہ توڑ کر میرے ہاتھ میں قلم دیتے ہوئے
جلدی سے بولے "چار ہزار نقد زرِ بیعانہ"۔ مَیں نے بہ غور رسید پڑھی۔ مبلغ چار ہزار روپیہ
زرِ بیعانہ کی رسید تھی بقیّہ بارہ ہزار بوقت تکمیل بیع نامہ دفتر رجسٹری پر دو ہفتہ بعد ادا
کرنے کا وعدہ تحریر تھا۔ مَیں نے ٹکٹ پر، حاشیئے پر، اور رسید کی عبارت کے اختتام پر
دستخط کئے اور منشی سلامت رائے نے بحیثیت کاتب و گواہ دستخط کئے اور روپیہ
ملازم کے حوالے کیا اور رسید لالہ کے۔ اور سب کام سے فراغت ہونے کے بعد
کہا "چاکرانہ"۔

"کیسا چاکرانہ؟" لالہ نے جواب دیا۔ اور رسید تجوری میں گھُسِ دی۔

"جی کیسا چاکرانہ! آپ نہیں جانتے! ہمارا حق ایک روپیہ سینکڑہ" منشی جی
نے ذرا سنبھل کر کہا۔

"مگر یہ طے تو ہُوا نہیں تھا" لالہ نے کہا۔

"طے ہونے کی اس میں کونسی بات تھی ــــــ ساری دُنیا جانتی ہے کہ ہماری
سرکار میں خواہ خرید ہو یا فروخت ہمارا روپیہ سینکڑہ جو ہم سے معاملہ کرنے آئے گا
ساتھ لائے گا۔ ہماری سرکار میں پشتینی رواج ہے۔ بہار باغ اور زمین کے پٹے تک اس
سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔" منشی جی نے کہا۔

"مگر منشی جی آپ نے کچھ یہ بھی اندازہ کیا کہ سودا کتنا کڑا ہوا ہے۔ آپ کی سرکار
میں اتنے کڑے سودے کا بھی تو رواج نہیں ہے۔ اگر آپ ہم سے پہلے کہہ دیتے تو روپیہ

سیکڑہ تو روپیہ سیکڑہ دو روپیہ سیکڑہ کی گنجائش رکھتے۔ وہ تیل تو تلوں میں سے ہی نکلے گا۔ وہی تین بیسی وہی ساٹھ" لالہ نے کہا۔

"کیا بکتے ہو! تم کو تو بے ایمانوں سے پالا پڑا معلوم ہوتا ہے۔ ہم کائستھ بچے ہیں۔ آقا کے ساتھ دھن پٹی اور دلالی کر کے ثابت نہیں رہ سکتے۔ حرام کا مال ہم کو نہیں پچ سکتا (کان سے قلم نکال کر) ہم تو اس کے مرد ہیں اور اس سے زور سے کھاتے چلے آئے ہیں اور کھائیں گے۔ اگر ہم پہلے سے طے کر کے مالک کی رقم کاٹ کر چاکرانہ لیں تو بہت جلد کوڑھی ہو جائیں۔ مالک کی موجودگی میں در میدان مانگتے ہیں۔ اگر چھپا کر ایک کوڑی بھی کھائیں گے تو گئو کے برابر ہے!" منشی جی نے کہا اور پھر میری جانب داد طلب نظر اور تنے ہوئے سینے سے دیکھا۔

لالہ نے منشی جی کی گرما گرم اور بے لوث تقریر سے متاثر ہو کر ذرا دھیمے پن سے جواب دیا۔ "منشی جی آپ نے پہلے ہمیں سودے ہی میں اس قدر کس لیا کہ ایک پیسے کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ ابھی پچھلے سال نیاز محمد خاں کی دکانیں خاص آپ کی دکانوں کے میل کی بارہ ہزار کو لکھائی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے لالہ دکان کے اندر کے حصے میں گئے اور بڑبڑاتے ہوئے ایک کاغذ نکال کر لائے اور ذرا جوش میں آ کر فتحمندانہ انداز سے منشی جی کے سامنے ڈال دیا۔ جو منشی جی نے بغیر ہی پڑھے ہوئے اُلٹا پھینک دیا۔ اور نہایت زہریلے تیوروں سے کہا "یہ تم مجھے کیا دکھاتے ہو۔ مَیں نے نہ معلوم تم جیسے کتنے آدمی چکا کر پھینک دیئے۔ ہماری دکانیں تو آپ کو سولہ ہزار میں مل گئیں نیاز محمد خاں کی دکانیں تو آپ کو اٹھارہ ہزار سے بھی زیادہ میں پڑی ہیں۔"

"دیکھئے تا یہ بیع نامہ پڑا ہے اس میں اٹھارہ ہزار لکھے ہیں یا بارہ ہزار؟" لالہ نے کہا۔

منشی جی نے اور بھی زیادہ کڑوے تیوروں سے کہا" جاؤ! جاؤ! لالہ جی۔ معاف

کرو سونا ضرور تمہارے پاس زیادہ ہے۔ یہ قابلیت تمہاری ہمارے سامنے نہیں چل سکتی۔ تم جیسے نہ معلوم کتنے بنئے بقال ہماری اُنگلیوں میں پڑے ہیں۔ اسٹامپ بچانے کی غرض سے قیمت بارہ ہزار دکھائی ہے (میری جانب دیکھ کر) ہم ایسے گدھے ہیں کہ لالہ صاحب ہمیں نیاز محمد خاں کا بیع نامہ پڑھائیں اور ہم پڑھے جائیں۔ چہ خوش۔ لالہ صاحب ابھی تو آپ کی سات پشت پچھلی اور سات پُشت اگلی کو سبق دینے کے قابل ہوں۔"

لالہ نے دھیمے ہو کر کہا "اچھا، تو پھر اس کا تو کوئی علاج نہیں ہے کہ رجسٹری شُدہ دستاویز جھوٹی ہے۔ اور آپ سچے ہیں۔"

"اجی بکتے کیا ہیں آپ۔ ہاں رجسٹری شُدہ کاغذ جھوٹوں کا لکھا ہوا ہے اور جھوٹا ہے اور اس سے بھی ہمیں کیا بحث ہماری سرکار ہیں تو آج تک کوئی سودا بغیر چالیس آنہ کے ہُوا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

"تو منشی جی اس سودے میں تو گنجائش ہے نہیں" لالہ نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

"جی آپ! آپ بچارے تو سوا روپیہ سیکڑہ دیں گے اور اس کا سود بھی اگر معاملہ کریں گے تو ——" منشی جی نے سینہ نکال کر کہا اور چل پڑے۔ میں نے اور منشی جی نے چند قدم سڑک پر بڑھائے تھے کہ لالہ نے کہا۔ "منشی جی آپ تو مفت میں ناراض ہو گئے —— لو بات تو سُنو۔"

"جی بس سُن لی بات کیا ہے۔" منشی جی نے پلٹ کر نہایت کڑوے اور بے پروائی کے انداز سے کہا "سرکار کھڑے ہیں تکلیف ہو رہی ہے۔"

لالہ دُکان سے نیچے اُتر آئے اور منشی جی کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولے "چار آنہ سیکڑہ لے لو۔"

"واہ لالہ واہ! یہ بھی گاجر مولی کرلی ہے یا کوئی گٹھیا چٹکیا مقرر کیا ہے۔ منشی جی نے کہا اور نہایت حقارت اور طنز کی نظر ڈالتے ہوئے لالہ کی جانب سے مُنہ پھیر کر میرے سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔ اور منشی جی نے تقریر شروع کی۔

"سرکار یہ مہاجن کی قوم! خدا پناہ میں رکھے۔ ہمارے یہاں تو اس قوم کو کتا س سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ اب سرکار زمانہ ذرا آزاد ہوگیا ہے۔ ورنہ پچھلے زمانے کے اُونچی ذات کے ہندو انہیں چارپائی اور چلم نہیں دیتے تھے۔ اور سرکار سمرتیوں میں اس قوم کو جس قدر ذلیل بتایا گیا ہے اتنا اچھوت کو بھی نہیں لکھا ہے۔ اب بھی پُرانی چال کے ہندو انہیں اچھوت سے بدتر خیال کرتے ہیں۔ زمانہ آزاد ہوگیا ہے۔ ورنہ پہلے تو ان چیزوں کا عام طور پر بہت زیادہ لحاظ رکھا جاتا تھا۔ کیا عرض کروں سرکار پٹھانوں اور ٹھاکروں کے علاقوں کی تو انہیں بے ایمان سود خواروں نے دھجیاں اُڑا دیں۔ حضور دُور کیوں جائیں ابھی پچھلی سندیں خود سرکار کے پاس موجود ہیں سرکار کے جدّ امجد کو سیّد بادشاہوں نے فوجی خدمات کے صلے میں از بھرتانہ تا بھرتول نوسو نواسی گاؤں کا علاقہ جاگیر معافی دوام عطا فرمایا۔ یہ سب بنیوں نے سود کے زور سے فتح کرلیا یا کوئی ٹھاکر جاٹ غریب تلوار لے کر آیا؟ اور سرکار یہ لالہ بدری نرائن جو آج حضور کے سامنے باتیں بگھار رہے تھے یہ باتیں نہ ماریں گے تو کون مارے گا۔ انہیں کے دادا کے سود کے مطالبے میں چودہ گاؤں نیلام ہوئے تھے۔ حضور کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ میری مسیں بھیگتی تھیں۔ سکندر نامہ اور رقعاتِ ابوالفضل ختم کرچکا تھا اور اسی سال اُردو مڈل کا امتحان پاس کیا تھا۔ حضور آج بس بُڈھا ہوگیا۔ رہتا میں بیٹھا ہوں۔ پلک مارتے زمانہ گذرتا ہے میرے چچا جا منشی نہال چند نے جس روز امتحان کا نتیجہ معلوم ہوا۔ اسی روز سرکار حاجی میاں کے حضور میں پیش کیا۔ اہا سرکار حاجی میاں

بھی کیا ہی مشفق بزرگ تھے۔ دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے اور چاچاجی کو فوراً کام سکھانے کا حکم صادر فرمایا۔ اور پوری تنخواہ پر تقرر فرما دیا۔ دو ہی سال بعد مجھے غربی حلقہ سپرد ہو چکا تھا اور میں کام میں اچھی طرح طاق ہو گیا تھا کہ حاجی میاں کی نظر بی برق منیر سے لڑ گئی۔ اخراجات کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور سرکار کو روپے کی ضرورت پیش آئی پہلے تو چاچاجی نے ڈرتے ڈرتے اپنے ہم مکتب ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ادب و لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر مہذب پیرائے میں بہت کچھ سمجھایا بجھایا اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ مگر سرکار عشق کی آگ بُری ہوتی ہے حاجی میاں پر بھوت سوار ہو چکا تھا۔ پھر کیا تھا خبر پاتے ہی مہاجن روپوں کی تھیلیاں لے کر دوڑے اور من مانے سود اور شرائط پر کفالتی تمسک تحریر ہونا شروع ہو گئے۔ حضور یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی چیز تباہ ہونے والی ہوتی ہے تو اس کے ویسے ہی سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ عین اُسی موقع پر چاچاجی کا انتقال ہو گیا اور بی برق منیر کا پورا پورا دور دورہ ہوا۔ وہ نوجوان طوائف تھی سرکار کی آخیر عمر تھی جدھر چاہتی موڑ دیتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے ایسی پٹی پڑھائی کہ سرکار کو مستقل لکھنؤ لے گئی اور وہیں سکونت اختیار کر لی تمام علاقے میں بدنظمی اور بدانتظامی کا دور دورہ ہوا۔ چاچاجی کے انتقال کے بعد میر شیر علی قلتبان برق منیر کے ماموں ریاست کے جنرل منیجر ہوئے اور یہی سبب غالباً اس کا تھا کہ اس طوائف نے حاجی میاں کو یہاں کی سکونت چھوڑنے کی پٹی پڑھائی اور شیر علی کے لئے میدان خالی کرا دیا۔ لکھنؤ جیسا شہر اور پھر بڑے آدمی، یوں بھی عزت سے رہنا سہنا فرض اور حاجی میاں جیسا طمطراق کا رئیس سیکڑوں برابر کے نواب زادوں اور راجوں کا جھمگٹا ہم چشموں میں کمتر ہو کر کرایہ کے مکان میں رہ سکتا تھا؟ لکھنؤ کے ماحول میں بی برق منیر کو محبوب محل کا خطاب عطا فرمایا اور رہنے کے لئے نہایت عالیشان کوٹھی محبوب منزل کے نام سے تعمیر ہوئی۔ یہاں میدان خالی پا کر شیر علی نے پرانے

کارندے سب اپنے حکم خاص سے برخاست کر کے چاروں حلقے اپنے بھائی بھتیجوں میں تقسیم کئے کہنے کو ہم عربی حلقے کے سپردار تھے وہ بھی ہمیں جاٹوں کی سرکشی کے خیال سے پڑا رہنے دیا تھا مگر حضور جیسے سپردار تھے دل ہی جانتا ہے۔ دراصل ہم سب کو اپنا افسر خیال کرتے تھے اور میر شبیر علی صاحب بہادر کو تو ان داتا سمجھنا پڑتا تھا۔ غرض سرکار کیا عرض کروں ع سگ وزیر دگر بہ میر دموش دربانی کند، کا مضمون تھا۔ نہ کوئی حق تھا نہ حساب، تمام ریاست پر شبیر علی کی شخصی حکومت تھی اور تمام علاقے میں اسی کے نام کا سکہ رواں تھا اور اس کے بھائی بھتیجے سیاہ و سپید کے مالک تھے وہ ایک گرگ باراں دیدہ بھنڈوا تھا۔ لکھنؤ کے تمام اخراجات کا دارومدار مہاجنوں کی تھیلیوں پر تھا اور شبیر علی اور اس کے بھائی بھتیجے ان مہاجنوں کے دلال تھے اور خاطرخواہ معاہدہ کرا کر درمیان میں مہاجنوں سے خوب رقمیں اینٹھتے تھے۔ علاقے کی آمدنی کا پتہ نہ تھا کہ کدھر جاتی ہے۔ ہمیں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اچھے اچھے ذی عزت کاشتکاروں کی اور پرانے پشتینی مقدموں اور ٹھکینوں کی جو ہمیشہ سے ریاست کے نمک حلال جاں نثار رہے تھے۔ بھنڈوے آبروریزی کرتے تھے۔ اور ان غریبوں کی آواز سرکار کے کان تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ ہر طرف ظلم و تعدی، فسق و فجور۔ بے ایمانی اور بددیانتی کا بازار گرم تھا۔ اور انتہائی بدانتظامی اور بدرعبی کا دور دورہ تھا۔ پانچ چھ سال اسی طرح گذرے۔ مہاجن لوگوں نے جس دن کی اُمید میں قرض دیا تھا۔ پلک مارتے آگیا عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بھلا سرکار کفالتی قرضے۔ نہ کوئی جواب دہی نہ عذرداری، لمبے لمبے سود اور خرچوں کے ساتھ منہ مانگی یکطرفہ ڈگریاں ہوگئیں۔ جب مہاجنوں کی آمدنی کا دروازہ بند ہوگیا۔ اور اس کے اثرات لکھنؤ تک پہنچنے لگے تو حضور ایک روایت تو یہ ہے کہ اس طوائف نے حاجی میاں کو ہیرے کی کنی دے دی یا واللہ اعلم بالصواب کیا ہوا۔ غرض میاں کا لکھنؤ ہی میں وصال ہوگیا۔ اور جنازہ تابوت کر کے یہاں لایا گیا۔ تین روز تک تو ایک قیامت کبریٰ برپا رہی

سوئم کے روز شام کو مولوی حبیب الرزاق وکیل نے آپ کے دادا صاحب قبلہ خلد آشیانی سے تذکرۃً کہا کہ لکھنؤ والی کوٹھی سرکار مرحوم حاجی میاں کے نام تھی وہ وراثتہً آپ کو پہنچی ہے۔ بڑی اچھی جائداد ہے بار کفالت سے بھی بالکل پاک ہے۔ منشی سلامت رائے کو بھیج کر فوراً قبضہ کرا لیجئے۔ حضور کیا عرض کروں۔ بھولے میاں نام کے ہی بھولے میاں نہیں تھے۔ واقعی اسم بامسمی تھے اور خاندانی شان وشکوہ اور پشتینی روایات کے پورے پورے حامل کیا جواب دیا "مولوی صاحب آپ کی ہمدردانہ قانونی رائے کا شکریہ مگر ہمیں تو ایسا خیال بھی دل میں لاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے بھلا ایک چیز ہمارے باپ کسی کو دے گئے اور ہم اسے قانون کی آڑ سے چھین لیں کیا انہوں نے یہ ہمارے ہی لئے بنوائی تھی جو آج ہم اس پر قبضہ کریں اور لکھنؤ جیسے شہر میں جہاں وہ اپنی دھاک بٹھا گئے ہیں اور جھنڈے گاڑ گئے ہیں۔ رنڈی بھنڈوں سے مقدمہ بازی کر کے ان کے نام کو بٹہ لگائیں۔" آہ سرکار! آج بھی بیان کرتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا معلوم ہو رہا ہے۔ ایک ایک دن میں بیس بیس مواضعات کا نیلام ہوا جس کے صدمے سے بھولے میاں کا عنفوان شباب ہی میں انتقال ہو گیا۔ آج سرکار میری ستر کے قریب عمر ہو چکی گو آئی۔ چتا میں بیٹھا سمجھئے۔ صرف مرنا باقی ہے۔ اس وقت میری شروع جوانی تھی پچاس سال کی بات کل کی سی معلوم ہوتی ہے۔ یہ لالہ بدری نرائن جو آج حضور کے سامنے بڑھ بڑھ اور تن تن کے آنکھیں نکال نکال کر باتیں بنا رہے تھے انہیں کے دادا نے دس ہزار روپیہ میر لڈن قلتبان کی معرفت ادھنی روپیہ کے سود در سود پر قرض دیئے۔ اور بیس ہزار کا تمسک کفالتی تحریر کرایا۔ سرکار کا یہ حال تھا کہ دستخط کرتے وقت اچھی طرح تمسک کی تحریر کو پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہ فرماتے تھے۔ اور سب رجسٹرار مسکن پر جا کر تکمیل رجسٹری کیا کرتا تھا اگر تحریر پڑھ بھی لیتے تھے تو وہ قلتبان ان کو کچھ ایسا شیشے میں اتار کر مطمئن کرتے کہ چپکے سے ایک کے دو لکھنے پر راضی ہو جاتے اور اصلی

بات یہ تھی کہ طوائف کی ضروریات اتنی اہم ہوتی تھیں کہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے انہیں آگا پیچھا سوچنے یا سخت و نرم دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہونے دیتی تھیں ہاں سرکار تو یہ چودہ مواضعات والے پور، حسن پور، میاں گنج، چوہان پور، نظام پور، شمس پور، جاٹ نگر، اینلگڈھ، حاجی پور، راٹھور نگر، گردھر پور، بہاری پور، مصطفیٰ آباد ایک ہی تاریخ میں نیلام ہوئے۔ دس ہزار کے بیس ہزار تو اسی وقت پانسو روپیہ رشوت کہیئے یا دلالی کا کمیشن، مسر لڈن قلتبان کو دے کر لکھائے تھے، پھر سرکار سود در سود اور بالائے سود لگا کر نہ معلوم پانچ لاکھ کی ڈگری کرائی یا دس لاکھ کی اب مجھے تو تفصیل یاد نہیں سب یک طرفہ کارروائی۔ وہ تو خدا مولوی میاں (والد صاحب قبلہ) کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اپنی پامردی اور دماغ کے زور سے سرکار کے لئے اتنی پیدا کر گئے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ نہ معلوم کیا کچھ کر جاتے۔ ان مہاجن مردودوں نے تو سرکار جیسے لاکھوں رئیسوں کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا تھما دیا۔ اور خود سرکار کے پاس ہی کیا رہا۔ جتنی اشرفیاں تھیں اتنی کوڑیاں ہی ہیں سرکار کے جدّ امجد کا تلوار کا پیدا کردہ علاقہ، جاں نثاروں کے خون سے سینچی ہوئی کشت زار سب سود میں لوٹ کر لے گئے۔ سرکار پرانی مثل ہے۔

ایک سنارا سو ٹھگا، لاکھ ٹھگا سو بامن ایک
ان سب کو میل نچوڑ کے گڑھو مہاجن ایک

بوڑھا منشی سلامت راے جو کچھ بیان کر رہا تھا۔ وہ شاید بچپن سے لے کر اب تک سیکڑوں مرتبہ کی تو خود منشی جی کی بیان کردہ اور ہزاروں دفعہ کی خاندان کے دوسرے بزرگوں کی کہی ہوئی کہانی تھی، ندرت کوئی نئی چیز نہ تھی۔ مگر اس وقت کچھ تو منشی جی کے طرز ادا سے اور کچھ واقعات کی زندگی کی وجہ سے اس حکایت میں ایسا لطف آرہا تھا کہ یہ بیان کئے جائیں اور میں سنے جاؤں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

بڈھا مختار عام کھسیانہ ہو ہو کر بیان کر رہا تھا۔ اور میری طبیعت میں لالہ بدری نرائن کی جانب سے غیظ پیدا ہو رہا تھا۔ اور اس کی شکل اور حلیہ دماغ میں گھوم گھوم کر سینے میں نفرت اور حقارت کے جذبات بھڑکا رہے تھے۔ بڑی گومڑی دار بے ایمان کی سی فربہ، اونچی توند، گھٹی ہوئی چاند پر مٹھی بھر موٹی چوٹیا، کثیف دھوتی جو میل کی وجہ سے مٹیالا سا چکٹا ہوا مستقل رنگ اختیار کر گئی ہے —— باچھوں میں سفید سفید پھٹا ہوا جیب زدہ تھوک جو بات کرتے وقت دونوں جانب سے بڑھ کر نصف دہن سے زیادہ گھیر لیتا ہے اور گفتگو کے وقت منہ سے بدبو کا گرم گرم بخارہ کھچڑی مونچھوں کے جڑاؤ پر ناک سے نکلے ہوئے چلم کے دھوئیں کا پہلا داغ —— پیچھے میلا سا گاؤ تکیہ اور نیچے کثیف چکٹی ہوئی چپاتی سی گدی جن کے غلاف سال کے سال دسہرے پر بدلے گئے ہوں گے۔ سامنے صندوقچہ پیتل کی دوات اور ریت دانی، بیٹھنے کا انداز ایسا کہ گویا جسم کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے دھڑی دو دھڑی گوشت کی موجودگی کا احساس نہیں ہے —— داہنی جانب بڑی اونچی تجوری —— چھوٹے بڑے خانوں میں روپیہ، زیور، نوٹ، اشرفیاں، تمسک، رسیدیں، پرونوٹ، بہی، کھاتہ —— دوسرے الفاظ میں بھالے، کٹاریں، تلواریں، خنجر، بندوقیں، توپیں —— پھر چند کھلی ہوئی ہتھیلیاں، اس کے بعد کانپتی ہوئی انگلیوں کے دستخط اور تھرتھراتے ہوئے انگوٹھوں کے نشان، گویا لالہ کے ضمیر پر روسیاہی کے دھبے اور پھر ان دھبوں سے ساری دنیا فتح! اور ہزاروں میل زمین پر قبضہ!! —— انسانی آزادی کا معیار بھی وہی جو گائے بیل بھینس کا!! —— اور پھر! پھر!! ڈاکو قاتل اور مقروض سب کے لئے وہی ایک دروازہ!! یہاں کا خدا سونا!! یہاں کا انصاف دولت!! یہاں کا حاکم روپیہ!! یہاں کی عدالت نیلام گھر! انصاف کی میزان زنگ آلود! در عدالت پر دادخواہی کی ڈھار کیا

اور عدل کے سینے پر بندوق کی باڑ ہیں! سود کی لعنت کا دور دورہ اور شائیلاک
ترتیب دیئے ہوئے قانون کا جواز! ـــــ چمک دار سکوں کے عوض ضمیر انسانی کی
خرید و فروخت کا بازار گرم! ـــــ ایک وہ بھی دنیا ہے جہاں انچ انچ بھر زمین پر
لاکھوں سر اُڑ جاتے ہیں مگر مخالف کو بستی بستی کی شکل ہیں، زمین زمین کے حلیے ہیں آدمی
تو در کنار جانور جانور کی صورت میں نہیں ملتا۔ نہ معلوم وہ کونسی دنیا ہے جہاں کا
نظام لوہے کی سختی اور سونے کی نرمی دونوں کے ماتحت چلتا ہے۔ یہاں لوہے اور
سونے دونوں کا جوہر سونے کے حصے میں آگیا ہے۔ لالہ کی تجوری میں کتنا سخت سونا
ہے کہ جس کے نشتروں نے جسم انسانی کا ریشہ ریشہ علیحدہ کر کے رگ رگ کا خون چوس
کر ہڈی ہڈی کا گودا چاٹ کر ختم کر دیا۔ فولاد کی آب سونے کی چمک کے سامنے ایسی ماند
ہوئی کہ فولاد کا جوہر بھی پورا پورا سونے کے حصے میں آگیا اور لالہ ”یک جہاں در بغل
بے حرب و ضرب!!“ کا مصداق بنے دکان پر پڑے ہی پڑے توند سہلا سہلا کر ہوا کو
بدبودار بناتے رہتے ہیں۔ میں انہیں خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا۔ میرے دل میں
عام طور پر ہر مہاجن کی طرف سے نفرت اور غصے کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور لالہ
بدری نرائن کی طرف سے تو اس قدر غیظ بھرا ہوا تھا کہ اس کی توند کی چربی میں اپنے
بڑے رائفل کی پوری پانچوں گولیاں یک دم پلا دوں۔ میرے کانوں میں
منشی جی کے بیان کردہ چودہ موضعوں کے نیلام کی بولیاں گونج رہی تھیں۔
منشی سلامت رائے گرگ باراں دیدہ کا نسخہ اور پھر میں اس کے سامنے
پیدا ہو کر جوان ہوا۔ گفتگو کے وقت برابر میرے چہرے کو پڑھتا رہا تھا۔ آناً فاناً میں فتن
مکان پر پہنچ گئے۔ منشی سلامت رائے سمجھ گیا تھا کہ تیر نشانے پر صحیح بیٹھا اور بجائے
دفتر کی کوٹھڑی میں جانے کے خلاف معمول میرے پیچھے پیچھے نشستگاہ کے کمرے تک
چلا آیا اور میرے دائیں بازو کے قریب بید کا مونڈھا کھینچ کر بیٹھ گیا اور انداز سے

معلوم ہوا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میرے آنکھ کے اشارے کے استفسار پر منشی جی نے ایک عجیب فخریہ انداز میں جیب سے نکال کر میری اقراری رسید جو ابھی چند منٹ پیشتر میں لالہ کی دکان پر دستخط کر کے دی تھی۔ میرے سامنے نہایت مودبانہ انداز سے پیش کر دی۔ مجھے اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لالہ بدری نرائن نے آج ہی میرا آبائی علاقہ نیلام کرایا ہے اس کاغذ کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا اور بوڑھے مختار عام کی پیٹھ ٹھونکی، منشی جی نے اپنی گپھے دار سفید مونچھوں کے اندر مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت سرکار ان بے ایمان سود خواروں نے خون پیا ہے۔ آج حرامزادے سے یہ چار ہزار وصول کرایا ہے۔ چالیس لاکھ میں یہ چار ہزار ہاتھ لگا ہے۔" میرے دوسرے آنکھ کے اشارے کے استفسار پر کہا۔" وہ جس وقت نیاز محمد خاں کا بیع نامہ لینے اندر گیا ہے بس سرکار اسی وقت" میں نے جیسا کہ ہر بنی نوع انسان سے توقع ہونی چاہئے۔ بوڑھے مختار عام کو خوب شاباش دی جس پر منشی جی نے فخریہ انداز میں کہا۔

"سرکار پھر حکم ہو تو کر دوں چراغ الدین کے سپرد۔"

میں نے جواب دیا۔ دیر بھی کیا ہے آخر اس میں پوچھنے کی کونسی بات ہے در کارِ خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست۔

منشی جی نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور اسی اطمینان کے ساتھ جس اطمینان کے ساتھ وہ بیڑی سلگایا کرتے ہوں گے۔ رسید سلگا دی اور راکھ جوتے سے مسل دی اور یہ کام انجام دیتے وقت بڑبڑا کر ادب ولحاظ بالائے طاق رکھ کر لالہ بدری نارائن کی ہمشیرۂ عزیزہ اور دخترِ نیک اختر کو یاد فرماتے ہوئے کچھ نہایت قریبی رشتے قائم فرمائے۔

(۲)

تکمیل جبٹری کے موعودہ دن سے ایک روز پیشتر لالہ بدری نرائن بُرے جیون

بُرے حالوں ہانپتے کانپتے میرے یہاں پہنچے۔ ظاہر بات ہے کہ میرے ملنے کی تو کوئی تک رہی نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بقول نیازو دربان "میاں تو شکار میں تشریف لے گئے ہیں" مگر منشی جی بھی نہ ملے۔ ممکن ہے کہ اس آنے والے خطرے کے لئے انہوں نے بھی تھوڑی بہت تیاری کی ہو ورنہ وہ اس معاملہ میں بہت بے ہراس بیٹھے کیونکہ آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک۔ شام کو لالہ پھر نازل ہوئے۔ نیازو دربان نے وہی صبح والا جملہ دہرا دیا۔ "میاں تو شکار میں ہیں۔" لالہ نے پوچھا کہاں جس پر بوڑھے دربان نے نہایت رکھائی سے کہا۔ "لالہ یار تمہاری تو کچھ عقل ماری گئی ہے ـــــ مثل مشہور ہے کہ شکاری اور بھکاری کا کیا ٹھیک ابھی پورب کو جا رہے ہیں۔ ذرا دیر میں پچھم کو پلٹ پڑے۔" لالہ دربان کے اس خشک اور قدرے خودسرانہ انداز پر ذرا خفیف سے ہوئے۔ دو مرتبہ ہونٹوں پر زبان پھیری سیدھے ہاتھ سے چمکتی گھٹی ہوئی چاند کھجائی اور ذرا ہمت کر کے کہا۔ "بڑے میاں یہ تو بتاؤ واپسی کب تک ہوگی۔

"واقعی یار تمہاری مت میں پھیر ہے" اپنی کہے جاتے ہو۔ دوسرے کی نہیں سنتے وہ کسی کے باپ . . . . . کے نوکر تو ہیں نہیں جب جی چاہے گا آئیں گے" نیازو نے کہا اور دوسری جانب مُنہ پھیر کر بڑبڑائے "مفت میں کان چاٹ گئے" اور گردن جھٹک کر حقارت کے ساتھ نیچے کا ہونٹ نکال کر ترچھے تیوروں سے لالہ کی جانب دیکھنے لگے۔ اتنے میں کہیں حسن اتفاق سے پھاٹک کے اندر صحن میں منشی سلامت راۓ چلتے پھرتے نظر پڑ گئے لالہ یک دم بے تاب سے ہو کر باوجود نیازو دربان کے "ہیں ہیں" کہنے کے جھپٹ کر اندر دکھائی دیئے اور منشی جی کو سلام کیا۔ ہم یہ سب قصر پھاٹک کے چھت والے بالاخانے سے دیکھ رہے تھے لالہ اندر صحن میں پہنچے ادھر ہم بجائے سیڑھی والے دروازے کے بالاخانے کے پشت والے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ ہم

سمجھ رہے تھے کہ منشی جی لالہ سے جھجک کر بات کریں گے۔ مگر خیال غلط نکلا ہم لے غور کیا کہ منشی جی غیر معمولی دانتوں کی قوت اور پنجوں کی تیزی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اور محض مبلغ چار ہزار روپیہ اور رسید بیعانہ کا تذکرہ کرنے پر ہی لالہ کو دفعہ ۵۰۰ تعزیرات ہند اور حرجے کے قانون کی اس دفعہ کا خاص طور سے حوالہ دیا جس میں عدالت دیوانی سے ازالہ حیثیت کی ڈگری صادر ہوا کرتی ہے اور لالہ کے کچھ اور کہنے پر فرمایا "تم نے ہمارے سرکار کو کوئی ایسا ویسا سمجھ لیا ہے حرجے کے مارے تو ندگروی رکھتے پھروگے اور بڑا گھر سود میں دیکھو گے۔ خبردار جو ایسی بات زبان سے نکالو گے تو تم ہی جانو گے جیسے خود بے ایمان ہو ویسا ہی دوسرے کو سمجھتے ہونا۔" اس کے بعد منشی جی اپنی شعلہ ساں آنکھوں کو اور زیادہ پھیلائے خاموش ایک منٹ کا منٹ ٹھہرے رہے اور اس کے بعد اپنی اکڑی ہوئی ترچھی گردن کو اسی انداز میں دوسری جانب موڑتے ہوئے نہایت تحکمانہ اور کڑک دار آواز میں کہا "کوئی ہے"۔ جس پر لالہ تو اچھل کر دو قدم پیچھے جا پڑے۔ ایک مسٹنڈا سپاہی جلدی سے سامنے آکر کھڑا ہو گیا لالہ یہ دیکھ کر کہ منشی جی نے سپاہی کو محض مونڈھا لانے کا حکم دیا مطمئن کھڑے ہو گئے۔ سپاہی ایک ہاتھ میں مونڈھا۔ دوسرے میں منشی جی کی لمبی لگالی والی فرشی لئے ہوئے باہر آیا منشی جی نے اظہار غیظ کے بطور دو مرتبہ مونڈھا زور سے زمین پر ادھر ادھر پٹخا اور لالہ کی جانب سے قریب قریب پشت سی کر کے نہایت فرعونیت کے انداز میں حقہ ٹھانس کر بیٹھ گئے اور اس انداز کے ساتھ گویا انہیں لالہ کی موجودگی کا ان کاشتکاروں سے زیادہ احساس نہیں ہے جو ان سے بقایا لگان میں مہلت لینے آئے تھے۔ سپاہی سے کہا "گنا دباؤ اور چلم کی آگ دھو دو۔" مشہور بات ہے کہ اپنی گلی میں تو کتا بھی شیر ہوتا ہے۔ بھلا منشی سلامت رائے تو منشی جی تھے۔ اور وہ بھی گلی میں ہیں خاص اپنے آقا کے مکان کے اندر ایک مرتبہ کو تو لالہ کو ایسا قائل کر دیا کہ خود کو بے ایمان سا تصور کر کے گنہگار بن کر

کھڑے ہو گئے۔ منشی جی نے غور کیا کہ لالہ باوجود سیاسی غصے کے اور ذلت کے ساتھ کھڑا رکھنے کے بھی مکان کے باہر نہیں گئے تو انھوں نے اخیر صورت اختیار کرنے سے پیشتر یہ صورت اختیار کی کہ جو کاشتکار ان کے پاس بقایا لگان میں مہلت لینے کی غرض سے آئے تھے۔ ان کی سزا کے بطور سپاہیوں سے جوتے کاری کرانا شروع کر دی اور سیاسی غصے میں عام پھینک چاروں طرف کو کہنا شروع کر دی اور بغیر کسی کا نام لئے ہوئے نہایت مغلظات گالیاں محض آنے والوں کو دینا شروع کیں۔ لالہ نے جو یہ رنگ محفل دیکھا تو دھوتی سنبھالتے ہوئے پھاٹک سے باہر ہو گئے۔

یوں تو ہماری اور لالہ بدری نرائن کی ملاقات منشی سلامت رائے اور نیاز دو دربان نے ناممکن کر دی تھی مگر وہ اس جگہ کی ملاقات کو کیسے روک سکتے تھے جہاں ہر ایک سے ہر ایک کو لابد کرنا ہی پڑتی ہے۔ چنانچہ لالہ نے درعدالت پر دستک دی اور عدالت دیوانی میں میرے خلاف تکمیل معاہدہ اور مبلغ چار ہزار کی دست گرداں زر پیشگی کی مجرائی کا دعویٰ دائر کیا۔ لالہ سمجھتے تھے کہ میں اپنی بدنامی کے خوف سے اور شہر میں انگشت نمائی کے خیال سے عدالت میں جھوٹا حلف نہ اٹھاؤں گا۔ اور مجھے بھی اپنی یہ کمزوری بڑی حد تک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر جب میں نے غور کیا کہ نمک حلال مختار عام کے دم قدم کی برکت سے لالہ بدری نرائن کی بے ایمانی اور بد دیانتی اور میری بے گناہی کے چرچے نالش دائر ہونے سے پیشتر ہی تمام شہر میں ہو رہے ہیں تو مجھے اطمینان ہو گیا۔

مقدمہ کی تیسری پیشی کی تاریخ آ گئی۔ اس دوران میں میرے کانوں میں چاروں طرف سے اس قسم کی نہایت معتبر خبریں آ چکی تھیں کہ لالہ بدری نرائن مہاجن نے مجھ پر بے ایمانی سے چار ہزار کی جھوٹی نالش کر دی ہے اور اس دباؤ میں میری بیس پچیس ہزار کی قیمت کی دکانیں بارہ ہزار میں ہضم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس خصوص میں میرے ہمدرد

اور دوست میرے ساتھ اظہار ہمدردی اور رسمی اظہار تاسف کر چکے تھے۔ صبح کا وقت
تھا منشی سلامت رائے میرے پاس ایک مسودہ لے کر آئے اور بولے "سرکار! یہ
حضور کے بیان تحریری جواب دعویٰ کی نقل ہے جو پچھلی تاریخ پر عدالت میں وکیل صاحب
نے داخل کر دیا تھا آج حضور کا بیان اس کے مطابق ہوگا۔ حضور اس کو ذرا غور سے پڑھ
لیں تنقیحات بھی ہو چکی ہیں آج قطعی کی تاریخ ہے۔ آج حضور کی تشریف آوری نہایت
ضروری ہے۔ بس ایک ذرا کی ذرا اجلاس تک تکلیف فرمانا پڑے گی۔ ایک دو لفظ
کہنے کے لئے۔ اور بس کام ہو جائے گا۔ ذرا اول وقت وکیل صاحب سے بھی ملاقات
فرما لیں تو بہتر ہے۔ میں نے اپنے جواب دعویٰ کی نقل پڑھنا شروع کی اور تسلیم و عدم تسلیم
پڑھنے کے بعد جب بیانات زائد کی اس مد پر پہنچا۔ "یہ کہ دکانات متنازعہ کی قیمت
بیس ہزار طے ہوئی ہے مگر مدعی نے بدنیتی سے عرضی دعوے میں صرف سولہ ہزار طے ہونا
ظاہر کی ہے۔۔۔۔۔" تو میرا ماتھا ٹھنکا اور منشی جی سے استفسار کیا تو جو کچھ منشی جی نے
فرمایا وہ تو ہمیں یاد نہیں۔ البتہ ایک فقرہ یاد ہے "مرگش بگیر تا بہ تپ راضی شود" بس یہ
ہمارے گلے اتر گیا اور خاموش ہو گئے۔

قریب بارہ بجے ہم عدالت کے روبرو پیش ہوئے پیچھے سے چپراسی نے کہا۔
"کہئے میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا جھوٹ نہیں کہوں گا۔
نہ کوئی سچ بات چھپاؤں گا۔ خدا میری مدد کرے۔" یہ رسمی الفاظ میں نے نہایت تن کر
ادا کئے۔ "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا۔ جھوٹ نہیں کہوں گا
نہ کوئی سچ بات چھپاؤں گا۔ خدا میری مدد کرے۔" میرا بیان شروع ہوا۔ لالہ کے وکیل
نے جرح میں نطق کی پوری طاقتیں ختم کر دیں۔ مگر میں جیوں کا تیوں رہا اور میرے بیان
سے سوا اس کے کہ مبلغ بیس ہزار کا معاہدہ، زر پیشگی کی ادائیگی غلط لالہ نے بیس ہزار
کا مال بارہ ہزار میں ہضم کرنے کی غرض سے جھوٹا دعویٰ دباؤ ناجائز ڈالنے کے لئے کیا ہے

اور کچھ نہ نکل سکا۔ منشی سلامت رائے کا بیان بھی میری طرح لفظ بہ لفظ بالکل سچ ہوا۔ اس کے علاوہ منشی جی تین راس گواہان مبلغ تین روپیہ ہی کرایہ کر کے خاص لالہ کے محلے سے لائے تھے، جن کی شکل منشی جی نے ہم کو وہیں عدالت کے برآمدے میں دکھائی اور آہستہ سے اشارہ کر کے تینوں کے اسمائے گرامی بتائے کلن، واجد، راموں۔ ان غریبوں کو بے پڑھا سمجھ کر لالہ کے وکیل صاحب نے منطق کا بڑا لمبا چوڑا جال پھیلایا اور جرح میں گویا اُٹھا اُٹھا کر بٹھا دیا اور یہ نہ سمجھے کہ وہ ہمارے وکیل صاحب کے دفتر کے اسکول میں پڑھے ہوئے تھے۔ اور منشی سلامت رائے ان کا امتحان لینے کے بعد پاس کر کے یہاں تک لائے تھے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں چلائے مگر ان میں سے بھی کوئی نہ پھنسا۔ اور مثل ایک طوطے کے اپنا سبق پڑھتا ہی رہا۔ مقدمے کی تجویز ہو گئی اور نتیجہ وہی ہوا جس پر اینگلو انڈین قانون مبنی ہے۔ یعنی تھیٹر کے اسٹیج پر جو اپنا پارٹ صحیح ادا کر آیا وہی ایمان دار ہے۔ اور اسی کا ڈائرکٹر قابل۔ لالہ بے ایمان، فریبی، جھوٹے، ٹھگ، وغیرہ وغیرہ قسم کے نہ معلوم کتنے معزز خطابات سے سرفراز کیے گئے۔ میاں کے بیان کا لفظ لفظ سچ، منشی سلامت رائے اور ان کی معزز پارٹی یعنی کلن، واجد، راموں کے بیانات آیاتِ حق ہمارے وکیل صاحب ارسطوئے زماں و سولن وقت، بیس ہزار کی جبریہ رجسٹری کی ڈگری صادر ہوئی اور زر پیشگی ایک پیسہ بھی ادا ہونا ثابت نہ ہو سکا۔ مدعا علیہ کا خرچہ کے علاوہ دفعہ نمبر ۳۵۔ الف کا ہرجہ ذمہ مدعی مزید رہا وغیرہ تجویز کا خلاصہ تھا۔

(۳)

بھلا مبلغ آٹھ ہزار روپیہ نقد!! پہلے تو بارہ ہزار کی مالیت کی دکانیں سولہ ہزار میں طے ہوئی تھیں۔ آٹھ ہزار سودے کے رونگ ہیں، در اصل پوری بارہ ہزار کی بچت ہو گئی۔ بارہ ہزار میری ساری جائداد کی ڈیڑھ سال کی آمدنی ہے۔ چلو بی بی کا زیور

بچا۔ شہر کا مکان بچا، گھوڑی، بیل، باغ مکان سب ہی کچھ بچ رہا اور جائداد کا بار بھی صاف ہو گیا اور چار ہزار نقد بچ رہا۔ مقدمہ کی تجویز سے دو ڈھائی مہینہ بعد دفتر رجسٹری سے بعد تکمیل بیع نامہ گھر جا رہا تھا۔ اور دماغ میں یہی خیالات چکر لگا رہے تھے۔ لالہ بدری نرائن جو میری روانگی سے چند منٹ پیشتر اپنے یکہ پر چل دئے تھے۔ سڑک پر دُور سے میری فٹن آتی دیکھ کر یکے سے اُتر کر ایک جانب پٹڑی پر کھڑے ہو گئے جیسے ہی فٹن برابر آئی لالہ نے جھک کر سلام کیا "میاں سلام" میرا ہاتھ سلام کے جواب کو اُٹھ نہ سکا۔ سامنے سیٹ پر منشی جی بیس ہزار نقد کی پوٹ پر ہاتھ رکھے نہایت اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ لالہ کے اس انداز سے سلام کرنے پر زیر لب کچھ بڑبڑائے غالباً گالیاں دیں اور بجائے نگاہ چرانے یا محجوب ہونے کے کئی مرتبہ فٹن سے جھانک کر لالہ کو دیکھا۔ اور جب تک فٹن اتنی نہ گذر گئی کہ لالہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے برابر کلمات خیران کی شان میں کہتے ہی رہے۔ شام کا وقت تھا اور سردی کا موسم فٹن پھاٹک کے اندر داخل ہوئی۔ کمپاؤنڈ میں ایک جانب کوالاؤ پر چند بے کار ملازم اور کاشتکار بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ نیچا نیچا دھواں نکل کر جہاں کا تہاں گھٹ رہا تھا۔ ایک ملازم بھینس دوھ رہا تھا۔ دوسرا اس کے بچے کو پکڑے کھڑا تھا۔ ایک گھوڑی کا راتب تیار کر رہا اور ایک تھان صاف کر کے سڑی ہوئی گھاس نکال کر سوکھی گھاس بچھا رہا تھا۔ موسم سرما کے غروب ہونے ہوئے سورج کی زرد الوادعی کرنیں مکان کے میناروں پر ایک قسم کی اُداسی لئے ہوئے سنہرا رنگ پیدا کر رہی تھیں۔ میں ان سب پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا مویشی خانہ کا صحن طے کر کے مردانے مکان کی فصیل پر چڑھ گیا میری طبیعت کچھ گندسی ہو رہی تھی۔ جسم بھاری بھاری سا تھا۔ اور دماغ پر ایک غیر معمولی قسم کا دباؤ اور تکان محسوس ہو رہی تھی۔ میں خلاف معمول بجائے نشستگاہ کی جانب جانے کے سیدھا ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ بچوں نے گھر میں اودھم مچا رکھی تھی۔ میرے پہنچتے ہی سب

"میاں آگئے" میاں آگئے پکارتے میری جانب متوجہ ہوئے چھوٹی بچی پیروں سے لپٹ گئی مگر نہ معلوم میرے جذبات کیوں اس قدر پست ہو رہے تھے کہ کسی چیز میں دلکشی ہی نظر نہ آتی تھی۔ بیگم مسکراتی ہوئی بڑھیں اور ایک منٹ میرے چہرے پر نظریں گاڑنے کے بعد بولیں "کیوں خیر تو ہے؟ جی کیسا ہے دشمنوں؟ کچھ ماندے معلوم ہوتے ہو"۔۔۔ "نہیں تو کوئی بات نہیں ہے سردی میں آیا ہوں" میں نے جواب دیا اور دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر ایک انگڑائی لی۔ مگر میں نے غور کیا کہ بغیر کسی قسم کی فکر یا خیالی اجتماع کے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ بھول اٹھا ہوں۔ اور کچھ سوچ میں ہوں۔ رات کو کھانا بھی کچھ ایسا ہی سٹر پٹر کھایا گیا۔ جس کا الزام بیگم نے ملازم کے اچھا گوشت نہ لانے پر اور ملازمہ کے صحیح مسالہ نہ ڈالنے کے سر تھوپا۔ غرض میں تھکا تھکایا کھانا کھا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ مگر نیند ندارد، ہاتھ پاؤں میں ٹھنٹھن سی محسوس ہو رہی تھی اور بے خوابی کے آثار پیدا ہو گئے تھے، یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس قسم کی بے خوابی سے اکثر شکار اور مقدمات میں ناکامیابی کے بعد جو پہلی شب آتی تھی دوچار ہونا پڑتا تھا مگر آج عجیب بات تھی کہ اتنی بڑی کامیابی کے بعد بے خوابی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ جاگتے ہی جاگتے آٹھ نو دس گیارہ بارہ کے گھنٹے کی آواز بستر پر پڑے ہی پڑے بیگم کے کمرے کی کلاک سے سنی۔ رفتہ رفتہ "میرے سینے پر بار محسوس ہونا شروع ہوا" ارے ایک ہزار روپے میں اتنا وزن!! ہوتا ہے ۔۔۔۔ بڑی تول کا دس سیر! جیسے ایک تھیلی کسی نے اور لا دی دو ہزار کا بیس سیر وزن!" ادھو سینے پر کس قدر دباؤ ہے ۔۔۔ ارے یہ تو ایک ہزار اور رکھ دیا۔ اب تو ہماری بڑی تول کا تیس سیر ہو گیا!! ۔۔۔ اس قدر بار!! اس پر لو ایک اور ۔۔۔ ارے پورا من ہو گیا!! ۔۔۔ پوری چار تھیلیاں ۔۔۔ معاذ اللہ!! ۔۔۔ اب تو میری سانس رکنے لگی۔ بھلا چار ہزار روپیہ کا وزن اور میری کمزور ہڈیاں!! ۔۔۔ اللہ اکبر! پانچویں اور!! خدا کے واسطے میں مرا ۔۔۔ اٹھے یہ

چھٹی تھپلی۔ اور ـــــ !! غضب خدا کا! میری ہڈیاں چٹخ جائیں گی ـــــ ارے اللہ میری
سانس بند ہوئی جاتی ہے ـــــ ہائے اللہ یہ تو ساتواں ہزار اور رکھ دیا!! میرے سینے
اور پشت کی ہڈیاں ملی جا رہی ہیں ـــــ ارے خدا توبہ ہے! ـــــ میرے سینے اور پشت
کی ہڈیوں سے چٹاچٹ آوازیں آرہی ہیں۔ ایں آٹھواں ہزار!!! یہ تو میرے سرمہ کرنے
کی ترکیبیں ہو رہی ہیں ـــــ وقت آگیا ہے۔ میں نے گویا آواز نکالنے کی انتہائی کوشش
کی اور پوری طاقت سے آنکھیں پھاڑ کر کھولنا چاہیں ـــــ میں نے سب جج صاحب
کو آٹھویں تھپلی سینے پر سنبھالتے ہوئے دیکھا ـــــ مگر اس وقت اس بار سے میری
زبان بند ہو چکی تھی نہ ہاتھ حرکت کرتا تھا نہ پاؤں باوجود سخت کوشش کے اپنا ایک رونگٹا
نہ ہلا سکتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے تمام جسم کی جان نکل چکی ہے۔ میں اپنے ایک
ایک عضو کو حرکت دینے کی کوشش میں پوری پوری قوت صرف کر دیتا تھا مگر بے سود
ـــــ میں نے اپنی زبان پر پورا زور دے کر کلمۂ طیب پڑھنے کی ناکام کوشش کی اور
سب جج صاحب کی جانب دیکھ کر یہ آواز گویا اپنے حلق اور زبان پر غیر معمولی طاقت صرف
کر کے نکالنے میں کامیاب ہوا۔" ہو ہو ـــــ ہو ـــــ حضور ـــــ ڈ ـــــ ڈ ـــــ ڈگ
ـــــ ری ـــــ با ـــــ با ـــــ بان ـــــ ئے پر ـــــ د ـــــ ی اور مو ـــــ
مو ـــــ مجھ ـــــ پر بار لادا ـــــ (ڈگری بنئے پر دی اور مجھ پر بار لادا) کسی کے شانہ
پکڑ کر ہلانے کی حرکت سے میرا بار ہلکا ہوا اور ساتھ ہی بیگم کی شیریں آواز کان میں ایسی
سنائی دی جیسے تیز و تند طوفانی موسم میں کوئی دور سے بول رہا ہے۔" خدا غارت کرے
ان مقدموں اور کچہریوں کو ـــــ نہ معلوم کس قدر ہلکان ہو جاتے ہیں توبہ! توبہ!!
تمام رات دماغ پریشان رہتا ہے۔ اتنی دیر سے جگا رہی ہوں۔ دیکھو تو ٹس سے مس نہیں
ہوتے ـــــ پھر یہ حالت ہے کہ تین چار مہینے سے روز مقدمہ روز کچہری، یہ حاکم اور
وکیل موئے تو کتے کا بھیجا کھا کر آتے ہیں۔ دیکھو تو جوان کے پھندے میں پڑ جائے پاگل

کر کے چھوڑیں۔" میں بیدار ہو چکا تھا یا یوں کہیے کہ آزاد ہو چکا تھا۔ سخت اختلاج ہو رہا تھا۔ اور حلق خشک تھا۔ بیگم نے پانی دیا ایک گھونٹ سے حلق تر کر کے ذرا دم لیا۔ طبیعت سکون پر آ گئی تھی اور بار ٹل گیا تھا۔ آٹھ ہزار کے منافع کی فرحت محسوس ہو رہی تھی اور بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے سارا واقعہ بیگم کو خوب مزے لے لے کر سنایا یا منشی سلامت رائے کے جاگیرانہ والے جھگڑے سے لے کر اس وقت کے کابوس تک کا کل حال نہایت تفصیل کے ساتھ بیگم کو بتایا۔ میں نے یہ سب نہایت داد طلب انداز میں بیان کیا تھا مگر یہاں معاملہ دگرگوں ہوا واقعہ سن کر پہلے تو انہوں نے طنز کے ساتھ آنکھیں پھیلا کر گردن ہلائی۔ اس کے بعد زہر خند ہنسی کے ساتھ کہا " اچھا اب میں سمجھی یہ تین چار مہینے سے آپ اس چکر میں تھے ——" پھر اک ذرا کی ذرا میری جانب حقارت کی نظریں ڈالتے ہوئے خاموش رہیں۔ ہم سمجھ رہے تھے۔ کہ شامت آ رہی ہے اور یہ خاموشی وہی سکوت ہے۔ جو طوفان کی آمد سے تھوڑی دیر پیشتر فضا پر، لاوا نکلنے سے چند گھنٹے پیشتر جوالا مکھی پر طاری ہوتا ہے۔ چنانچہ یک دم منشی سلامت رائے پر برس پڑیں۔ بیگم کی طاقتوں کا کچھ وہی لوگ صحیح اندازہ کر سکتے ہیں جن کو بیگم صاحبہ کے ابن عم ہونے کا فخر بھی حاصل ہو یا دوسرے الفاظ میں بیگم صاحبہ حقیقی چچا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی بھی ہوں اور کچھ علیل بھی اور جو خود شیر کا شکار بھی کھیلا کرتے ہوں۔ یقین مانیے میں نے اپنی عمر میں کم و بیش درجن بھر گلدار اور چیتے مارے ہیں اور پچیس سال کی عمر سے پہلے جب مجھ میں گول بٹے دار گلدار اور لمبی دھاری والے چیتے سے شاید ہی کچھ زیادہ عقل اور شاید ہی کچھ کم دلیری رہی ہو گی۔ مجھ پر چار پانچ مرتبہ زخمی گلدار اور چیتے نے چارج کیا ہے۔ اگر میں کسی ایک حملے میں بھی اتنا بدحواس ہو جاتا جتنا بیگم کے اس کوہ شکن حملے سے ہوا تو رائفل میرے ہاتھ سے نیچے گر پڑتی اور اس کا نتیجہ ہوتا اور میرا بیٹھوا۔ بہر حال بیگم کی یہ غوں غوں جھاڑی میں پڑے ہوئے زخمی گلدار کی غوں سے کہیں زیادہ

خوفناک تھی حالانکہ ابھی تک محض منشی سلامت رائے پر نزلہ رجوع تھا اور ہم ایک بے حیائی کے اطمینان سے مطمئن بنے ہوئے چپ چاپ سن رہے تھے اور دل کو فی الحال یوں سمجھا لیا تھا کہ منشی سلامت رائے ایک مشترک سرمایہ ہے۔ تنتینی ملازم جس طرح ہم دونوں کو اپنے اپنے باپ کے ترکے سے جائداد ملی تھی۔ اس طرح منشی سلامت رائے بھی ملے تھے۔ عم بزرگوار کا بھی اتنا ہی معتمد جتنا والد صاحب قبلہ کا اس صورت میں اگر پورا نہیں تو نصف سلامت رائے بھی مثل اور چیزوں کے بیگم کے جہیز میں آیا تھا۔ اور اسی بنا پر اس کی قدامت اور بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا موجودگی میں کچھ ادب بھی کرتی تھیں اور مثل اور ملازمین کے اُس سے آواز کا پردہ بھی نہ کرتی تھیں۔ اور اس کی وفاداری اور نمک حلالی کی دل سے معترف تھیں اور منشی جی بھی اُنہیں بجائے بیگم کے کبھی بٹیا اور اکثر صاحبزادی صاحبہ وغیرہ اقسام کے نجی القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ اور ہم سے زیادہ ان کے احکامات کی پابندی کرتے تھے۔ اور ان کے معمولی اور غیر ضروری سے غیر ضروری حکم و فرمائش کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ لہٰذا ہم خاموش بیٹھے ہوئے منشی سلامت رائے کا نبراشن رہے تھے کہ یک دم یہ لاوا ہماری جانب بہتا معلوم ہوا۔ اور پیشتر اس کے کہ ہم یہ کہہ پائیں کہ میں تمام دن کا تھکا ہوا ہوں۔ اور اس وقت اس کابوسی کیفیت نے اور بھی زیادہ خستہ کر دیا ہے اب مجھے آرام کرنے دو بیگم نے نہایت کڑے تیوروں سے کہا "اور کیوں جناب —— آپ یہ روپیہ لے کر گھر میں کیسے آئے" یقین مانئے کہ میرے تمام اعصاب نے جواب دے دیا مگر میں نے بات کو مذاق میں ڈالنے کی غرض سے کہا۔ "بیگم غلطی ہوئی۔ سیونگ بنک میں کل ہی ڈیپازٹ کرادوں گا۔ گھر میں بھولے سے لے کر چلا آیا —— ارے ہاں ہاں! سیونگ بنک بند ہو گیا تھا بیگم نے بالکل سنجیدگی کے ساتھ بغیر مذاق میں ذرا بھی حصہ لئے ہوئے کہا "جی نہیں مذاق میں نہ ڈالئے میری بات کو —— جواب دیجئے۔

مَیں اس وقت مذاق کا جواب سُننے کے لئے تیار نہیں۔" مَیں نے بیگم کے دم خم دیکھ کر کہا۔" ارے بی بی تم کیا جانو ان مردودوں کو ـــــ ہمیں تو سب انہیں نے لوٹ کر برباد کر دیا۔ یہی مہاجن بے ایمان ہمارا پانچ لاکھ ڈکارے بیٹھا ہے۔ اس کی تعمیر تو ہمارا ہی خون چوس چوس کر ہوئی ہے۔ یہ تو آج آٹھ ہزار مل پایا ہے۔ اچھا پانچ لاکھ! پانچ لاکھ کیسے! بیگم نے اپنے کڑے تیوروں میں مسخرانہ انداز پیدا کر کے کہا اور پھر ایک منٹ زیر لب کچھ بڑبڑائیں۔ غالباً میرے الفاظ دہرائے اور کہا" جناب کو جو کچھ اس بوڑھے کھوسٹ کا ئستھ نے پڑھا دیا وہی آپ الاپنے لگے۔ خود رسید چرائی اور آپ سے جھوٹا حلف اٹھوا کر بے ایمانی کرائی۔ مَیں نے بیگم کی شدت دیکھ کر ذرا سنبھل کر کہا۔" اس بے ایمانی کیسی۔ جس وقت اس مہاجن کے دادا مردود نے ہمارے دادا مرحوم سے دس ہزار کے بیس ہزار ادھنی روپیہ کے سود پر لکھا کر پانچ لاکھ ڈکار لئے تھے تو میں جانوں وہ ایمانداری ہوئی تھی!"

بیگم نے زیادہ درست ہو کر کہا" جی ہاں اس وقت یہی بے ایمانی ہوئی تھی بلکہ شروع سے آخر تک سب بے ایمانی ہی بے ایمانی ہے۔ کیوں مردہ بزرگوں کی ارواح پر عذاب کراتے ہیں آپ۔ مُنہ پہ آئی ہوئی رُکتی تھی تو نہیں ـــــ ذرا یہ تو بتائیے کہ سود پر قرضہ لینا ہی کونسی ایمانداری ہے؟ ـــــ اور پھر اسے عیاشی میں صرف کرنا! ـــــ موا ایک تو کڑوا کریلا اور اس پہ نیم چڑھا! ـــــ میں جناب سے یہ دریافت کرتی ہوں کہ آپ مہاجن کے سود لینے کے فعل کو تو بے ایمانی سے تعبیر فرماتے ہیں اور اپنے سود دینے کے فعل کو عین ایمانداری تصور فرماتے ہوتے ہیں!! جس خدا کا حکم سود لینا بے ایمانی ہے اسی خدا کا حکم سود دینا بھی بے ایمانی ہے ـــــ دونوں احکام ایک ہی کتاب کے ہیں اور ایک ہی سزا دونوں کے لئے رکھی گئی ہے۔"

جس طرح ایک مُنہ زور گھوڑی کے مزاج کو پہچانتے ہوئے چابک سوار موقع موقع سے اس کی راسیں نرم و سخت رکھ کر اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل اس طرح میں نے آثار شدید دیکھ کر اپنی پوری دماغی قوت کو کام میں لاکر کہا۔ "ارے میری بھولی بیگم اتنا نہیں سمجھتیں کہ دولت تو وہی ہے میرے باپ دادا کے جاں نثاروں کے خون سے پیدا کی ہوئی۔ پھر اگر اس کو کسی نے بے ایمانی سے مجھ سے چھین لیا ہے تو اگر اس بے ایمانی سے چھینی ہوئی چیز کا ایک جزو میں کسی صورت سے بھی واپس کر لوں تو مجھے حق ہے اور فطری قانون کے مطابق تو مجھے یہ بھی حق حاصل ہے کہ میں اس سے انتقام لوں اور پھر انتقام تو ہر بنی نوع انسان کا فطری حق ہے۔"

"خوب! آپ کے دادا اور اس کے دادا امر ملتان پہنچے۔ اور آپ ہماشما سے سُن کر آٹھ ہزار روپیہ ہضم کرنے کی غرض سے انتقام اور فطری قانون اور ایمانداری اور بے ایمانی کے فلسفے کی آڑ پکڑ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا یہ بھی نہ سہی مجھے تم ایک بات کا جواب دے دو —— سود لینا بے ایمانی ہے؟ —— اچھا سود کی قیمت میں اس کے دادا نے میرے دادا کی جائداد حاصل کی تو وہ خرید ہی کب جائز ہوئی وہ تو ایک غصب ہوا حقیقتاً۔ مگر قانون اس کے اس غاصبانہ فعل کو جائز قرار دیتا ہے، لیکن یہ خدائی قانون کے بالکل خلاف ہُوا —— بس مجھے اپنے دادا کی غصب شدہ جائداد کو ہر وقت واپس کر لینے کا حق ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے میں مجھے خواہ کوئی فعل ایسا کیوں نہ کرنا پڑے جو سماج کی نظر میں معیوب ہو مگر میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ خدا اور رسول کے نزدیک میرا یہ فعل قطعاً مذموم نہیں ہے اور شرع مجھ کو اس کی قطعاً اجازت دیتی ہے۔ میں نے اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا "مجھے اپنی لُٹی ہوئی چیز کو ہر صورت سے واپس

کر لینے کا حق ہے۔"

"ارے بندۂ خدا بے ایمانی کرنا ہے تو شوق سے کرو۔ خدا اور رسول کو کیوں بدنام کرتے ہو اور شریعت پر کیوں بہتان باندھتے ہو ——— اور ہاں خوب یاد آیا شریعت تو حضور کو ہمیشہ سے حفظ یاد تھی مجھے خوب یاد ہے اس وقت میں کوئی ایسی بچہ بھی تو نہیں تھی۔ کلام مجید آدھے سے زیادہ پڑھ چکی تھی اور آپ نئے نئے کالج سے باغی ہوکر تشریف لائے تھے۔ کل کی سی بات ہے آٹھ نو برس تو ہوئے ہی ہیں جناب کی نظرِ عنایت اس ہماری غریب لڑکی شعلہ پر گھوم پڑی تھی ——— پھر تو آنجناب آقا اور لونڈی کے جنسی تعلقات کے جواز کا شرعی فتویٰ صادر فرما کر کیا کیا گرم مباحثے اور کیسی کیسی پرزور دلیلیں پیش کر کے قرآن مجید اور حدیثِ پاک کا حوالہ دیتے پھرتے تھے پہلے تو کوئی کچھ نہ سمجھا۔ مگر دادی اماں کچھ آپ کی اشارہ بازیوں سے اور کچھ جناب کی شعلہ پر غیر معمولی عنایت سے بھانپ گئیں۔ آپ کے متعلق تو محض اتنا ریمارک دیا کہ "مردوئے کا سر پھرا ہے ——— روٹیاں لگی ہیں بدمعاش کو" مگر نزلہ برعضوِ ضعیف آپ کا تو کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ غریب شعلہ کے یہ لمبے لمبے ریشم سے بال منڈوا دیئے۔ سو شریعت تو ہمیشہ سے آپ کی اپنی علیحدہ نجی رہی ہے اور ہمیشہ حرام حلال رہا ہے۔" ——— ایک نقرئی قسم کا قہقہہ بلند کر کے میری جانب فتحمندانہ نظروں سے دیکھا۔

میری نظروں میں یک دم دس سال پہلے کا زمانہ گھوم گیا۔ جب آتش جواں تھا شعلہ کے خانہ زاد ہونے کی سلسلہ دار کڑی۔ پردادا مرحوم حج سے واپسی پر وہ لونڈیاں زرخرید اور دو غلام لائے تھے۔ خاص مکۂ معظمہ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد اور مدینہ منورہ کے سفر سے پیشتر خرید کئے تھے۔ ان کی چوتھی یا پانچویں پشت میں جا کر کہیں بیر بی شعلہ تھیں۔ یکے بادیگرے سینما کے اسکرین کی طرح تمام گذشتہ واقعات دماغ پر منعکس ہونے لگے ——— بچپن کے زمانے میں شعلہ کے ساتھ وہ رومانی کھیل

وہ دُلہن بنتی تھی اور مَیں دُولہا — جب خاندان میں کہیں شادی بیاہ ہوتا تھا اور شعلہ کا یہ روحانی کھیل ایک پاک ہنی مون کی صورت میں ہفتوں جاری رہتا — پھر ایک روز وہ روٹھتی اور مَیں مناتا — اب لارڈ بائرن کا قول سچا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پانچ سال کی عمر میں لارڈ بائرن کے دل میں جنسی جذبات اتنے ہی قوی تھے جتنے پچیس سال کی عمر میں اسی طرح شعلہ پر شباب کی بے پناہ آمد — مشہور بات ہے کہ ڈھاک پر بہار اور غلام پر شباب بڑے زور سے آتا ہے۔ ادھر بچپن کی معصوم محبت کا تخم پورا درخت بن کر بار آور ہونا چاہتا تھا۔ پشتینی روایات کی بنا پر دل میں گدگدی — تاریخ کا دہرائے کے لئے کروٹیں بدلنا — دولہا بھائی سے بحث کہ شرعاً لونڈی اور غلام کی اولاد بھی لونڈی اور غلام کے حکم میں آتی ہے — دادی اماں کا ایک روز کھانے کے بعد ہاتھ دھلواتے ہوئے میرا اور شعلہ کا مذاق بھانپ جانا — اور پھر کیا ہوا دوسرے روز شام کو جب ہم شکار سے واپس ہوئے تو ایک عجیب الخلقت مخلوق گھر کے اندر دیکھی۔ بڑی بی کا غصہ استرے کی شکل میں غریب شعلہ کے سر پر گھوم چکا تھا۔ اور کاکل خمدار اور زلف عنبریں وغیرہ سب غائب ہو کر چھلا ہوا چقندر سا لال لال منہ نکلا تھا — روتے روتے آنکھیں متورم سی تھیں شکل نہ دیکھی جاتی تھی اور وہ شعلہ جس کا ہر قدم گھر کے اندر رقص کرتا ہوا پڑتا تھا اور مجھے تو دیکھ کر نہ معلوم ہر منٹ میں کتنی مرتبہ سر اور سینے سے دوپٹہ ڈھلکتا تھا اور مجھے ذرا سی چیز اٹھا کر دینے میں نہ معلوم کمر کتنے بل کھا جاتی تھی۔ گنگناہٹ زیر لب تو کسی وقت بند ہوتی ہی نہ تھی۔ آج کیسی جھینپی جھینپی سمٹی سمٹی کونے میں منہ دبائے بیٹھی تھی۔ دوپٹہ خوب احتیاط کے ساتھ منڈا سر چھپانے کی غرض سے لپیٹ لیا تھا اور اس کے بعد سے میرے کام کا پورا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ یاد کر کے بے اختیار ہنسی آگئی۔ جس پر بیگم جو چُپ تھیں۔ اُن کے چہرے پر ہماری ہنسی ترقی کرتی گئی۔ مَیں نے خوب ہنس کر اور بیگم کی

کھسیانپٹ سے پورے طور پر محظوظ ہو کر کہا۔ "اچھا تو ابھی تک تو آپ قانون میں پھانس لگاتی تھیں۔ اب شرع میں تجدید فرمانے لگیں۔ اور خدا اور رسول کے حکم میں ترمیم و تنسیخ کرنے لگیں۔" اور پھر نہایت سنجیدہ انداز بنا کر کہا "ہاں میں اب بھی کہتا ہوں کہ شعلہ کے معاملے میں سب گھر والوں کی میرے ساتھ سخت ہٹ دھرمی تھی۔ اور انتہائی بے انصافی —— سوسائٹی کی نظر میں خواہ کچھ ہو خدا رسول کے نزدیک وہ میرے لئے ایسی ہی جائز تھی جیسی تم —— اور تم تو اس لئے کہتی ہو کہ تم کو اس سے سوتیا ڈاہ قسم کی رقابت ہے۔"

"اے نوج! دور! دور! خدا نہ کرے وہ مونڈی کاٹی خصم پیٹی میری سوت ہو —— اور میں ایسی جائز ہوؤں جیسی وہ جائز تھی نگوڑی —— ہاں جیسے آپ کی شرع میں یہ روپیہ حلال ہے ویسے ہی وہ جائز تھی —— میری اس کی کیا مثال!! لونڈی بچی قطامہ کی ——" بیگم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"مگر اس میں شک نہیں کہ اگر ہم ذرا احتیاط سے کام لیتے اور میں کالج والی آزادی اور لڑکپن کو بالائے طاق رکھ کر کام کرتا تو وہ نگوڑی آپ کی سوت بھی بن جاتی اور وہ مونڈی خصم پیٹی ایسی ہی جائز ہو جاتی جیسی آپ ہیں۔ اور گھر میں تو کسی کو بھی احساس نہ ہوا تھا۔ وہ تو بڑی بی کا خدا بھلا کرے جتنی بڈھی ہوئیں نگاہیں تیز ہوئیں۔ اور اقبال ترقی کرتا گیا۔ ذرا وقت سے پہلے بھانپ گئیں اور گربہ کشتن روز اول والے اصول پر قائم رہیں۔ اس غریب کی بھد کرا کر ایسی درگت بنائی کہ توبہ ہی بھلی —— اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو اس بیٹے کی اتنی طرف داری ہرگز نہ کرتیں۔ بڑی عقلمند بی بی تھیں۔

"وہ! وہ تو ایک منٹ بھی نہ ٹھہرنے دیتیں اس حرام مال کو اپنے گھر کے اندر" —— بیگم نے کہا "اسی جذبے کے ماتحت تمہارا جی ہٹانے کی غرض سے اور

تمہیں حرام ہے۔ بچانے کے لئے شعلہ کے ساتھ یہ زیادتی روا رکھی تھی۔"

"اچھا تو یہ گویا مال حرام ہے۔ اور میرا آبائی علاقہ ہر بنئے کے لئے حلال تھا۔ اور پھر میں یہ روپیہ بھی تو فقیر آباد کے سود کے بارے میں دوں گا۔ بس تم سمجھ لینا۔ "مالِ حرام بود بجائے حرام رفت" میں نے کہا۔

"اچھا تو مجھے ایک بات کا جواب دے دیجئے کہ یہ موا کونسا انصاف ہے کہ اگر کسی نے آپ کے دادا پردادا سے سود لیا ہے تو اس کے پوتے پرپوتے سات پشت تک کے ساتھ آپ کو چوری، بے ایمانی، دغا بازی کرنے کا گویا لیسنس مل گیا۔ خدا کے یہاں تو اس قسم کی مجرائی محسوبی ہے نہیں۔ یا اللہ میاں کا دربار بھی کوئی موئے بنئے کی کتاب ہے جس میں میٹھی کانٹا چلے۔ اپنے اپنے اعمال کا ہر فرد ذمہ دار ہے۔" بیگم نے نہایت سنجیدہ تیوروں سے کہا۔

"اجی تم کیا جانو! عورت ذات چار دیواری کی بیٹھنے والی —— ہزاروں مسلمان اور راجپوت ریاستیں ان بے ایمانوں کی سود کی غذا بن گئیں۔ کوئی پھیلاتے ایک مرتبہ ہاتھ پھر کیا مجال کہ اس کی سات پشت چھوٹ تو جائے۔ ہائے کیا کریں ہم لوگ، وہ تو وقت ہی نہیں آتا۔ نہیں تو ایک مرتبہ کو تو ہندوستانی سماج کے اس بدگوشت کو ایسا چھانٹ کر دکھائیں کہ اللہ دے بندہ لے۔" میں نے جوش کے ساتھ کہا۔

بیگم نے یک دم ذرا جھنجھنتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "جی مجھے آپ اس کا جواب دے دیجئے کہ مسلمان اور راجپوت ساونت جو آج مہاجنوں کا قتل عام کر کے ہندوستانی سوسائٹی اور قانون کی اصلاح فرمانے کی رنگین اُمید لگائے مونچھوں پہ چراغ جلائے پھرتے ہیں۔ کیوں گئے تھے مہاجنوں کے دروازے پر ہاتھ پھیلانے کیا مہاجن غریب کسی کے گھر تھیلیاں پھینک کر چلے گئے تھے۔ یا زبردستی تمسک پر

دستخط کرا لئے گئے تھے۔" اری بیگم تم کیا جانو وہ زبردستی ہی ہوتا ہے گئے تو بے چارے مسلمان اور ٹھاکر ہی تھے ہاتھ پھیلاتے ۔ مگر مجبور ہو کر اپنی ضروریات سے۔ سو اس مجبوری کی یہ سزا ہے کہ خون چوس لو، ہڈیاں چباڈالو۔ پشت در پشت کی ہستی فنا کر کے آئندہ آنے والی نسلوں کے ہاتھ میں بھیک کا ٹھیکرا تھما دو۔ میں یہ پوچھتا ہوں دنیا میں قوت کا معیار سوائے روپے کے کوئی اور چیز بھی ہے؟ لالہ لوگوں نے اپنی دولت کیا سمجھ لی ہے خدا سمجھ لی ہے نعوذ باللہ۔ آج پشتوں میں تو یہ مہاجن وبا بلا ہے سو تم اس کی سعی بھرتی ہو ـــــــ ارے بیگم پرانی مثل ہے "نیبوا نبیا بانیا دابے سے رس دیئے۔"

"کیوں چپ کیوں ہو گئے ـــــ ہوں ـــــ میاں ـــــ ارے پوری مثل کیوں نہیں بیان کرتے۔ "نیبو، انبیا، بانیا، دابے سے رس دیئے۔ کائستھ، کو کر کھٹیا مردے سے کچھ لئے۔" ہاں میاں میں خوب جانتی ہوں۔ یہ ساری ہولی اسی بوڑھے کھوسٹ کائستھ کی رکھی ہوئی ہے۔ آپ کے مختار عام صاحب بہادر دام اقبالہ کی ان پیر فرتوت کو تو میں خوب ہی پہچان گئی ہوں۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جارہی ہے اور وہ زندگی سے دور اور موت سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ فطرت اور مکاری ترقی کرتی جاتی ہے اور کیوں نہ خاندانی کائستھ ہیں جتنے بوڑھے ہوں گے اتنے ہی نیچے چلے جائیں گے۔ اور مرتے دم تک نہیں سٹھئیں گے ـــــ اور پھر منشی سلامت رائے تو مشہور بات ہے اپنی کھوپری خاص طور سے اللہ میاں کے ہاتھ سے بنوا کر لایا ہے۔ میں یہ غور سُن رہی ہوں۔ آپ کے منہ کے اندر منشی سلامت رائے کی زبان رکھی ہوئی ہے۔ میں ـــــ ہاں میاں ـــــ منشی سلامت رائے کو خوب پہچانتی ہوں۔ آپ کو انگلی پکڑ کر کھلایا ہے۔ تو مجھے گود وں چڑھا کر۔ یہ سبق جو آپ اس وقت پڑھ رہے ہیں۔ انہیں بزرگوار کا پڑھایا ہوا ہے۔" "خیر وہ

کسی کا پڑھایا ہوا سبق سہی مگر آپ ذرا یہ تو بتائیے کہ یہ سبق جو آپ اس وقت پڑھ رہی ہیں۔ آپ کو یہ حماقت کی تعلیم کس نے دی؟!! آخر یہ تو بتائیے کہ آپ جو اس وقت مہاجن کی بے جا طرفداری فرما رہی ہیں ـــــ اس میں آپ کو کے رکعت کا ثواب مل رہا ہے۔ بیگم صاحبہ" ـــــ میں نے کہا۔

"جی جناب میں سعی نہیں بھرتی ہوں ـــ ہوں ـــ آں سعی بھرنے کی ایک ہی کہی ـــــ یہ نہیں کہتے کہ یہ بے ایمانی سے حاصل کیا ہوا ایک ایک پیسہ واپس کرا کر چھوڑوں گی تو دم لوں گی۔ میں تو گھر میں قیامت برپا کردوں گی۔ خاں صاحب آپ ہیں کس خیال میں۔ یہ بھی کوئی آپ نے کوئی اور وہ سمجھی ہو ـــــ کھانا پینا سب حرام کردوں، تمہارا گھر بار سب چھوڑ چھاڑ الگ ہو جاؤں، دوا پرہیز سب پر لات مار دوں۔" بیگم نے کہا۔

اس چیز کو ہم پہلے سمجھ رہے تھے یہ جملے سُن کر سینے پر گھونسا سا لگا۔ جس چیز کا اندیشہ تھا وہ صاف پیشِ نظر تھی ـــــ میں نے بیگم سے ذرا پنچائتی قسم کے لہجے میں کہا ـــــ "دیکھو بیگم ہر معاملے پر پہلے انسان غور کرے ـــــ اس میں شک نہیں کہ گھر کے اندر ہوگا وہی جو تم چاہو گی ـــــ مگر ہماری ایک بات غور سے سُن لو یہ تو ہم جانتے ہیں کہ تم اپنی ضد کی پوری ہو ـــــ میں تمہارے سامنے دو چار مرتبہ اظہار خیال کر چکا ہوں کہ ان دکانوں کی قیمت سے مجھے فقیر آباد کا رہن دخلی چھڑانا ہے۔ روپیہ سولہ ہی ہزار ہے اور بارہ جس ہزار۔ اگر تم نے رائے روپیہ واپس کرنے کی دی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا ـــــ تمام سکیم درہم برہم ہو جائے گی۔"

"جی ـــــ ہاں ـــــ کیا ـــــ کیا سکیم ـ کیسی سکیم درہم برہم ہو جائے گی ـــــ آں ـــــ پرائے مال پہ کیوں بچوں کی طرح اُمیدیں قائم کرتے ہو جو آج کھیل بگڑ جائے۔

بیگم نے تیکھے سے انداز میں کہا۔
"لو سنو!۔۔۔ تم کو اپنے زیور کی کیل کیل فروخت کرنا پڑے گی۔ سواری کی
گھوڑی علیحدہ کر کے ٹخ ٹخ یکے پر لدنا ہوگا۔۔۔ شہر والا مکان رہن رکھنا پڑیگا۔۔۔
پہاڑ والا باغ کٹوا کر تمام زمانے کی انگشت نمائی اور بدنامی اوڑھنا پڑے گی۔۔۔
اور صاحب ہم تو منہ دکھانے کے قابل رہیں گے نہیں۔۔۔ باغ کٹا کر، ہر راہ گیر
گالیاں دیتا گزرے گا۔۔۔ اور گھوڑی بیچ کر چلے جا رہے ہیں یکے پہ لدے۔
"سب منظور" بیگم نے تن کر کہا۔ اور ذرا توقف کے بعد بولیں "آخر شہر کی
مجلسوں میں مجھے بھی تو ننگی بوچی بغیر زیور کے جانا پڑے گا۔۔۔ مگر حرام کے مال سے
تو بچیں گے۔۔۔"
ان حالات میں ہم اپنی کمزوری اور بیگم کی زبردستی سے خوب واقف تھے
اور جانتے تھے کہ ہوگا وہی جو بیگم چاہے گی۔ لہذا دار خالی اور یہ آٹھ ہزار ہاتھ سے
جاتے دیکھ کر ہم نے بڑی احتیاط سے کام لینا شروع کیا۔ حالانکہ ہم سمجھ رہے تھے
کہ یہ سب طلب مجہول ہے۔ اور ہم بیگم کی ضدوں سے اس وقت سے واقف تھے
جبکہ وہ بیگم نہیں بلکہ گڑیا تھیں۔ چچی محترمہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور چچا صاحب قبلہ
کی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز وہی رہ گئی تھیں اور وہ غریب ان کی تمام تر ضدوں
کے پورا کرنے کے پورے پورے ٹھیکیدار تھے اور مرنے سے کچھ روز پیشتر ہی تمام
کو بیگم میں قلب ماہیت کر کے یہ اجارہ داری گویا وراثتاً ہمارے سر تھوپ گئے
تھے۔ اس چیز کو خوب سمجھتے ہوئے پھر بھی ہم نے ایک پینترا بدلا اور چار پائی
سے اٹھ کر بیگم کے پاس جا بیٹھے اور بالکل خالص تجارتی جذبے کے ماتحت بیگم
کی گردن میں ہاتھ حمائل کر کے دو سپاہی بوسے تمتماتے ہوئے رخساروں کے
لے کر نہایت منت کے ساتھ ایک محبت آمیز انداز میں کہا۔ "میری پیاری

بیگم دیکھو آج تم سے ایک بات ماننے کو کہتے ہیں ـــــ اچھا پہلے ہمارے سر کی قسم کھاؤ مان جاؤ گی ؟"

سنتے بھی چلے آئے تھے اور کچھ ذاتی تجربہ بھی تھا کہ مثل بچے کے عورت کی زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور ہونٹوں سے خوشامد کی جائے تو بہت جلد رام ہو جاتی ہے ـــــ لیکن یہ بھی آج غلط ثابت ہوا۔ بیگم نے جواب دیا " کہئے کہئے کیا بات ہے ؟ ـــــ اور پھر مسکرا کر میری جانب اپنی نظریں ڈالیں کہ گویا وہ میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہیں۔ میرے دوبارہ اصرار کرنے پر کہا " اچھا جائیے آپ کے سر کی قسم سوا ان روپوں کے اور جس بات کو کہو گے مان جاؤں گی۔" تو ہم کو بہت سخت نا اُمیدی ہوئی۔ مگر ہم نے ذرا سنبھل کر کہا " ذرا سنو تو صاحب۔ میں ہضم کرنے کو کب کہتا ہوں۔ ہم تمہارے کہنے کے مطابق مہاجن کو روپیہ تو ضرور واپس کر دیں گے مگر ایک خاص صورت سے جس کی تم سے اجازت مانگ رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ نصف تو اس وقت واپس کر دیں۔ بقیہ نصف یعنی چار ہزار سولہ ہزار میں شامل کر کے فی الحال فقیر آباد گروی رہن چھڑا لیں اور پھر سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی یہ چار ہزار فقیر آباد کی پہلی آمدنی سے ادا کر دیں۔ اور لالہ کا اطمینان کر دیں کہ فی الحال سال ڈیڑھ سال کے لئے یہ چار ہزار کی رقم ہم پر قرض سمجھیں۔ یا ہمارے پاس امانت خیال کریں ـــــ لالہ کا روپیہ تو نکل جائے گا۔ اور اگر کہیں یہ چیزیں چلی گئیں تو پھر فراہم نہ ہو سکیں گی ـــــ بیگم نے ایک قہقہہ مارا اور کہا بہت ٹھیک۔ میری رائے میں یہ بھی اطمینان کر دیجئے کہ بغیر مانگے ہوئے ادھنی روپے کے سود در سود کے ساتھ آپ ادا کریں گے ـــــ اے سبحان اللہ! جب سے بابا آدم اور اماں حوا کی اولاد میں قرض اور امانت کا رواج ہوا ہے۔ کسی نے کبھی سے ایسے عجیب طریقے سے کسی کو ہی قرض لیا ہوگا۔ اور ایسے رومانٹک طریقے سے امانت بھی کا ہے کو رکھی گئی

ہو گی۔ کیا کہنا۔ قربان جایئے ایسی قرضخواہی کے۔ اور قرضداری کے اور آپ ایسے امینوں کے۔ بھلا آپ اور آپ کے مختار عام صاحب بہادر منشی سلامت رائے دونوں لالہ بدری نرائن کی امانت رکھنے کے لئے کس قدر موزوں ہیں۔ وزیرے چنیں شہریارے چناں۔ جو قیامت کے روز بھی حساب کر کے کچھ نہ کچھ دنیا میں ہر فرد بشر کے ذمے عائد کر دیں اور لالہ بدری نرائن تو درحقیقت لاکھوں ڈکارے بیٹھا ہی ہے ——
ہاں میاں میری رائے بھی یہی ہے کہ لالہ سے سیدھا سادا قیامت کا وعدہ کر دو۔ تم وہاں یہ روپیہ اپنے دادا کے ادا کئے ہوئے سود میں مجرا کرا دینا۔ منشی سلامت رائے بھی موجود ہی ہوں گے۔ ذرا دیر میں حساب کتاب کر کے بتا دیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلّا ح
ایک شوکھا قہقہہ لگایا۔

مَیں نے کہا۔ "بس بس اور کچھ —— ہر وقت مذاق اور بیہودگی ——"

بیگم نے نہایت تمسخرانہ انداز بنا کر کہا "میاں ایک بات اور مان لو مقروض کے پوتے پر پوتے کو قرض خواہ کی پُشت در پُشت کے ساتھ بے ایمانی، بد دیانتی، چوری، ڈکیتی، دغابازی کرنے کا لیسنس تو مل ہی جاتا ہے۔ تمہارے پاس چار بندوقیں اور نہ معلوم کتنے چاقو چھرے تلواریں اور برچھے ہیں —— درجن بھر سے زیادہ ہٹے کٹے ملازم اور ہزاروں تنومند اور دلیر کاشتکار تمہاری آنکھ کی جنبش پر کٹ مرنا فخر سمجھتے ہیں۔ اور ماشاء اللہ خود بھی نوجوان ہو شاطر نشانہ باز ہو جانوروں کو مارتے مارتے ہاتھ بھی خوب منجھ گیا ہے۔ دو ڈھائی سو آدمیوں کا ایک گروہ بنا لو اور مہاجنوں کو لوٹتے پھرو۔ اور تمہاری جتنی آبائی جائداد نکل گئی ہے سب ایمانداری سے حساب کر کے آنہ پائی سے واپس کر لو —— جائداد تو آج کل ملنا ممکن نہیں اس کی قیمت اور منافع سب مل سکتا ہے۔

میں نے بیگم کی بات کاٹ کر کہا "آج آپ اس چیز کا کیا مذاق اُڑا رہی

ہیں بیگم صاحبہ ـــــ اب سے ایک صدی قبل زمین تلوار ہی کا عطیہ تھی۔ حکومت سود کا بدل نہیں ہے یہ خون انسانی کی قیمت ہے اور جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے زمین کی قیمت کا معیار واقعی انسانی خون ہی رہا ہے۔ یہاں تک کہ آج بھی کسی متمدن ملک میں سود کے عوض زمین نہیں ملتی۔ یہ اس وقت بھی خون کے بدلے بکا کرتی تھی جب ہمارے مورث پتھر کے ہتھیاروں سے شکار مار کر اور سبز چراگاہوں پر مویشی چرا کر تمدن و تہذیب کی داد دیا کرتے تھے۔ اور آج بھی اس کے بھاؤ میں سر مو فرق نہیں آیا ہے اور اس کی خرید و فروخت اتنے ہی سرخ خون سے ہوتی ہے جبکہ انسان حقیقی معنی میں خدا تعالیٰ کا شاہکار بن چکا ہے۔ بی بی یہ ساتوں آسمانوں سے اوپر ارادۂ پرواز رکھنے والے آہنی غلے جنہیں تم ہوائی جہاز کے نام سے پکارتی ہو اور بحر ذخار میں چلتی پھرتی بستیاں جانتی ہو گیا ہیں۔ یہ سب زمین کی خرید و فروخت کا گرما گرم بازار ہے یہ اندھیر سوائے ہندوستان کے کسی ملک میں نہیں ہے کہ سونے کی تلواروں سے زمین فتح ہوتی ہو اگر ہمیشہ سے دنیا میں اسی قانون کا نفاذ ہوتا تو آج ساری دنیا میں مہاجنوں ہی کی کارفرمائی ہوتی۔ ہر ملک کی عسکریت زمین کے بل پر اور زمین عسکریت کے زور پر قائم ہے۔ اور جب تک ہمارے ملک میں فوجی نظام قومی رہا۔ اس وقت تک زمین اور تلوار کا یہ رشتہ قائم رہا۔ مغلوں کے زمانے تک ہفت ہزاری اور پنج ہزاری وغیرہ سردار زمیندار ہوتے تھے۔ انہیں اپنی اس زمین اور اس کے کاشتکار پر پورے پورے حقوق حاصل ہوتے تھے۔ سرکاری مال گزاری انہیں بالعوض انجام دہی عسکری خدمات معاف ہوتی تھی اس رقم سے وہ سردار اپنے کاشتکاروں کے درمیان ایک فوجی نظام قائم رکھنے کے لئے مجبور ہوتے تھے۔ جو صورت زمیندار اور گورنمنٹ کے درمیان ہوتی تھی وہی صورت زمیندار اور اس کے کاشتکار کے درمیان ہوتی تھی۔ یعنی خاص قطعات اراضی

کے محصول سے کاشتکار مستثنیٰ ہوتا تھا۔ اور وقت ضرورت مرکز کو وفاداری کے ساتھ اپنی خدمات پیش کرنی پڑتی تھیں۔ اس صورت میں ہر کاشتکار کو سپاہی بننا لازمی امر تھا اور پوری طرح سے فوجی تعلیم حاصل کرنا پڑتی تھی۔ اب ایک زراعت پیشہ ملک میں تم اس کی اہمیت سمجھ سکتی ہو کہ اس نظام نے تلوار اور زمین کا رشتہ کس قدر قریب کر دیا تھا۔ اور ملکی عسکریت کا کیا معیار رہا ہوگا ــــ ارے بی بی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو یہ پتہ چلے غدر ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ جس فرقے نے برٹش گورنمنٹ کے ساتھ بغاوت کا مظاہرہ کیا وہ زمیندار اور کاشتکار تھا۔ چنانچہ غدر کے بعد سے پے بہ پے قبضۂ اراضی کے ایسے ایسے قوانین وضع کئے گئے۔ جن کی رُو سے سب سے پہلے تو کاشتکار اور زمیندار کے درمیان میٹھے میٹھے سوائے چند سکے ادا کرنے کے اور کسی قسم کا تعلق ہی باقی نہ رہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں سالار اور لشکری کے درمیان فوجی احکام کی تعمیل کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ چھوڑا۔ اس صورت سے ایک تو غدر والی بغاوت کی سزا دی کہ خواجگی یا سالاری جو کچھ بھی کہئے ختم کر دی اور دوسرے ملک کی عسکریت کا ہمیشہ کے لئے سدباب کر دیا۔ مگر پھر بھی اندیشہ باقی رہتا تھا۔ کہ کہیں کسی موقع پر جاکر یہ پھر ملک کے لئے قران السعدین نہ ثابت ہوں۔ لہذا کسی ملک کی عسکریت دفن کرنے کی بہترین شکل یہ ہے کہ زمین اور فوج کا رشتہ ہی منقطع کر دیا جائے اور ایسے قوانین وضع کئے جائیں جو زمین کی لگام ایسے ہاتھوں میں تھما دیں جنہیں روز ازل سے فوجی اسپرٹ سے محروم رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ضابطہ دیوانی مرتب کرنے میں ایسی نباضی سے کام لیا کہ زمینی بندوبستوں کے اعداد و شمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کو ایسے گھر کا راستہ دکھا دیا جس گھر کے اندر چاقو کی دھار سرخ رنگ کی نباتات پر چلنے سے منہ موڑتی ہے اور خون تو خون پیاز اور شلغم کی سُرخی سے روح فنا ہوتی ہے۔ ارے بی بی یہ میرا قول نہیں ایک مجدد وقت

کا ارشاد ہے کہ زمین کے عوض سود کے جواز کا فتویٰ دینے والی کتابیں تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اُڑا دینے کے قابل ہیں۔ تلوار اور زمین کا تعلق اور تجارت و سود کا پیوند ٹھیک ہے ـــــ زمین تلوار پر باڑھ رکھنے کے لئے ہے اور تلوار زمین کی حفاظت کے لئے۔ سود تجارت پر جلا دینے کے لئے ہے اور تجارت سود کی بقائے حیات کے لئے۔ یہ انسانی ہاتھ کی تقسیم نہیں ہے بلکہ نظامِ قدرت اور قانونِ فطرت ہے۔ جس طرح تلوار اور تجارت میں کوئی مناسبت نہیں ہونی چاہئے۔ اسی طرح سود اور زمین دو اٹل بے جوڑ چیزیں ہیں ـــــ دکان کے تختے سے جس تخت کی تعمیر ہو گی یا جس دکان کے تختے میں تخت کا ٹکڑا شامل ہو گا۔ وہ حکومت نہیں ظلم و استبداد ہو گی اور وہ تجارت نہیں لوٹ ہو گی ـــ ہیگم ـــ ہوں ـــ آں ذرا سمجھو تو خراج اور نفع دو بعد المشرقین رکھنے والی چیزیں ہیں۔ قدرت نے انہیں متوازی پیدا کیا ہے ـــــ ان کا ملانا قدرت سے جنگ کرنا ہے۔"

"وہ تو بڑی خیریت گذری کہ آپ وکیل نہ ہوئے۔ نہ معلوم کیا غضب ڈھاتے ـــ اور آپ کی اس منطق، فلسفے، اور تاریخ سے پُر تقریر کا جواب میں تو میں کوئی بڑا سے بڑا ملکی بیچارہ بھی نہ دے سکتا ـــ میں غریب کیا چیز ہوں مگر مجھے ایک بات کا جواب عنایت فرما دیجئے آپ نے یہ روپیہ اس اصلاح کے زور سے حاصل کیا ہے۔ جس کی تفصیل ابھی آپ نے فرمائی یا اُسی بے ایمان قانون کی آڑ سے جس پر سود کے جواز کا انحصار ہے جس کی کتابیں تلواروں سے ٹکڑے کر کے ہوا میں اُڑا دینے کے قابل ہیں۔ میاں یہ تو بتاؤ ـــ یوں تو فلسفہ اور منطق کے زور سے ساری دُنیا کو قائل کر کے چھوڑو گے ـــ مگر یہ سمجھ لو ـــ جی ـــ ایک غازی فاتح ہے اور ایک لٹیرا الٹیرا ـــ حالانکہ دونوں کے کاموں میں بڑی حد تک مناسبت ہے۔ آپ اپنے اس فلسفے سے ملک و آئین کی اصلاح کر رہے ہیں۔ یا جناب کا یہ

فلسفیانہ وعظ اور اشتراکیت خیز تقریر۔ آٹھ ہزار نقد ہضم کر جانے کا رام بان چورن ہے۔ سود کی جڑ قانون ہے نہ کہ غریب مہاجن البتہ اس قانون سے مہاجن قرار واقعی فائدہ اُٹھانے کا گنہگار ضرور ہے۔ اور ابھی جو آپ نے تقریر کی ہے۔ وہ قانون کے خلاف تھی۔ لہذا قانون کے خلاف آواز اُٹھایئے مہاجن غریب کا کیا قصور ہے کہ اس کے آٹھ ہزار ہضم کر لئے جائیں۔"

"میرا فلسفہ تو یہ ہے کہ اس کو ان آٹھ ہزار کو جو اس نے ایک بے جا قانون کے ذریعے پیدا کئے ہیں اپنے پاس رکھنے کا حق ہی کونسا ہے۔"

"ارے مَیں تو کہتی ہوں جڑ کو ختم کر دو، سالانہ شاخ تراشی تو مفت کی بیگار ہے۔ اور پھر آپ نے اس قانون کا فائدہ کیوں اٹھایا جو غلط بنیادوں پر قائم ہے۔"

مَیں نے ذرا جھینپ کر کہا" بس اور کچھ ——— مُنہ میں گز بھر لمبی زبان ہی تو ہے۔ اتنی بڑی آمدنی پر کوئی پیسہ بچا کر دکھاؤ تو ہم جانیں ہر وقت ایک کھائے نوکی بھوک رہتی ہے۔

"اچھا ——— ہوں ——— اور آپ ——— آپ کچھ کما کر قوتِ بازو سے پیدا کر کے دکھائیں تو ہم کہیں ——— یوں تو آبائی جائداد کے کھونٹوں میں سب رئیسوں کا نام ورانتاً بڑھتا ہی ہے۔ اور گھر گھر رئیس اعظم کہلایا ہی کرتے ہیں۔" بیگم نے خوبصورت ساتواں ناک پر جھریاں پیدا کر کے کہا۔

"بالکل صحیح ——— یہ بھی دیکھ لو ——— یہ آٹھ ہزار جو آج تم نہ اپنا کہہ رہی ہو نہ میرا یہ میں نے کمایا ہے یا جناب نے بچایا ہے بیگم صاحبہ" مَیں نے ذرا ڈھٹائی سے کہا۔

"جی ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہ جناب ہی کے غلیظ پسینے کی کمائی ہے۔

خدا نہ کرے میں ایسے دن کے لئے دنیا میں رہوں کہ ایسی بچت دکھاؤں —
یہ آپ کی کمائی آپ ہی کو مبارک رہے — میں نے ڈکیتی کی رائے دی تھی۔
اور آپ کے لواحقین نے یہ روپیہ چوری اور دروغ حلفی سے حاصل کیا ہے۔ وہ
صورت ایک ہی ہے —" بیگم نے تمام جسم پر مخصوص نسائی حرکات پیدا
کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک بے غیرتی کی ہنسی میں اپنی خفت چھپاتے ہوئے کہا۔ "ہم
کس مردود کے گھر چوری کرنے گئے تھے — وہ تو ہمیں قانون نے دلایا اور
ہم نے لیا۔"

"چوری! اس کے متعلق میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتی۔ مگر اس میں شک
نہیں کہ جس قانون نے تم کو یہ روپیہ دلایا ہے۔ وہ قانون اندھیر کھانہ ہے بے ایمان
اور بے ایمان گر —"

"اچھا تو مجھے اس کا جواب دے دیجئے کہ وہ قانون اندھیر کھانہ نہیں تھا۔ جس
نے ایک روپے میں سو روپے کی چیز لالہ کو دلائی تھی — کیا اسی قانون کی رُو سے
لالہ ایماندار تھا۔ اور میں بے ایمان بن گیا —"

"اس میں شک نہیں کہ لالہ کو جو کچھ پہنچا وہ بے ایمانی سے پہنچا۔ مگر ایک
ایماندار کے لئے ایک بے ایمان کا فعل سند نہیں ہو سکتا۔ اگر لالہ نے بے ایمانی
کی ہے تو وہ لالہ کے ساتھ اور اگر آپ کریں گے تو آپ جواب دہ ہوں گے۔"
بیگم نے کہا۔

"اچھا تو بے ایمانی یا بے ایمانی مجرائی ہو گئی۔ ہم اور لالہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر
ایماندار رہے۔ انہیں علاقہ ہضم اور مجھے یہ آٹھ ہزار — ہم نے آج لالہ کو اپنی ساری
نیلام شدہ جائداد کا مالک تسلیم کیا وہ ہمیں یہ آٹھ دے کر چھوٹ گئے — چلو چھٹی ہوئی۔"

میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"میاں خدا خدا کرو۔ اور اللہ سے دعا کرو کہ حرام کے مال سے بچائے اور بے ایمانی کہنے کے لئے اخلاقی اور مذہبی تاویلیں مت کرو۔ اللہ کہیں اور سے ساتھ خیریت کے پاک روزی عطا کرے گا۔ ابھی تمہارے جسم کی تعمیر میں بے ایمانی، سود، رشوت کا حرام پیسہ نہیں لگا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ خواب کے ذریعے سے تم کو بشارت ہوئی ہے کہ یہ روپیہ تمہارے سینے پر "بار" ہے۔ غور تو کرو ایک وہ بھی تھے جو مصیبت اور تنگی کے وقت لکھنؤ کی دو لاکھ کی عمارت پر محض اس وجہ سے قبضہ کرنے نہیں گئے کہ بنواتے وقت ان کے باپ نے ان کے دینے کی نیت سے نہیں بنوائی تھی بلکہ طوائف کے لئے بنوائی تھی۔ ورنہ قانون اور انصاف انہیں اس کا مالک قرار دیتا تھا مگر چونکہ یہ چیز ان کے علم میں تھی کہ ان کے باپ نے یہ چیز طوائف کے لئے بنوائی ہے۔ اس لئے انہوں نے اس پر بدستور اسی کو قابض رہنے دیا۔ حالانکہ ان کو تباہ کرنے کی بڑی حد تک وہی طوائف بانی تھی بلکہ ایک روایت یہ ہے کہ اسی طوائف نے زہر دے کر ہلاک کیا مگر انہیں اس قدر تازہ زخم پر بھی طوائف کی تباہ کاری کا اتنا احساس نہ تھا اور آپ کی باسی کڑھی میں ایسا اُبال آیا ہے کہ ساتویں پُشت میں جا کر جہاجن کی سود خواری کا اتنا بڑا احساس ہے۔ میاں نیت ثابت منزل آسان اللہ تمہیں کہیں اور سے دے گا۔ اور پاک مال دے گا۔ اس کا روپیہ شمار کرو اور دے آؤ۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ مجھ کو ہر وقت کے لئے یہی ایک مشغلہ ہو جائے گا اور اسی غم میں میں دُھج دُھج کر مر جاؤں گی۔"

بیگم کی تقریر سے میرا دل کچھ کچھ پسیجا تھا۔ خصوصاً اخیر کے جملے نے مجھے بہت زیادہ خائف کر دیا تھا کہ بوڑھے منشی سلامت رائے کی تصویر پھر پیٹھی نظروں میں گھومنے لگی۔ میں نے ذرا محبت کے ساتھ سمجھانے کے انداز میں

بیگم سے کہا۔ "ارے بیگی ذرا غور تو کر لینے دے —— ایسی بھی کیا مار پڑ گئی
ہے —— دے دیں گے —— وہ تو اب واپس جائے گا ہی جائے گا ——"
"بس بس غور کر لیا ——" یہ کہہ کر تجوری کے قریب جا بیٹھیں اور روپیہ شمار
کرنے لگیں اور ہم "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا" کا مصداق
بنے سینے پر لحاف کو گویا صبر کی سل کی صورت میں رکھے اپنی تین چار مہینے کی
محنت اس طرح رائگاں ہوتے دیکھ کر اس ناخوشگوار منظر کی تاب نہ لا سکے اور
منہ ڈھک لیا۔ اور گرم گرم لحاف میں آنکھیں بند کئے پرانے کاغذات الٹ
پلٹ کرتے رہے اور بیگم تجوری کے قریب بیٹھی نوٹ اور نقدی ——"
ابھی سپیدۂ صبح اچھی طرح نمودار نہ ہونے پایا تھا اور سورج نکلنے میں گھنٹہ
ڈیڑھ گھنٹہ کی دیر تھی کہ بیگم شمار کر کے فارغ ہو گئیں۔ اور پرانے تولیہ میں باندھ کر اور
ملازم پر لاد کر میری چارپائی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔ میری ہمت وفور غم سے
لحاف سے منہ کھولنے کی نہ ہوئی۔ "لو اٹھو میاں —— بسم اللہ کرو ——" آواز کان
میں آئی، اچھی بسم اللہ ہوئی۔ جبراً قہراً آنکھیں کھولیں۔ اور ہم نے مزید غور کیا تو ہم
ان ملازم صاحب کی وجہ نزول کو سمجھے۔ دراصل ابھی ہم پر بیگم کو پورا پورا بھروسہ نہیں
تھا۔ اور منشی سلامت رائے کے آ جانے کا خدشہ بھی لگا ہوا تھا۔ غالباً اسی وجہ
سے یہ نور ظہور کا وقت اور یہ اپنے معتمد خاص ملازم منتخب ہوئے تھے۔ ہم نے
ایک انگڑائی لے کر کروٹ بدلی اور پے بہ پے دو تین جمائیاں لیں طبیعت شب بیداری
اور تمام رات کی جھائیں جھائیں سے سخت کسل مند تھی۔ اور بیگم کے پیہم تقاضے ہ
زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔ کا مصداق ہو رہے تھے۔ آگے خود اونی چادر لپیٹے
کھڑی تھیں۔ اور پیچھے ان کے معتمد خاص ملازم فقیرا بے ایمانی کی یہ بڑی پوٹ بغل
میں دبائے کھڑے تھے۔ اور بار بار فرما رہی تھیں۔ میاں چھ ہزار کے بڑے نوٹ ہیں

اور ایک ہزار کے چھوٹے اور ایک ہزار نقد روپیہ ہے۔ جیسے مجھے موٹر خریدنے
کے لئے اپنی خاص بچت میں سے عطا فرما رہی ہیں۔ اور ہم سوچ رہے تھے سے
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی ..... " وہ تو کچھ دیر ہم
بیگم کو اور منتظر رکھتے اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر فرصت سے جاتے۔ یا دو
چار دن گھر کو بیس اور جرمن کی لڑائی کا میدان بنائے رکھتے مگر ہم جانتے تھے کہ
اس بلائے بے درماں سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ اور یہ ہو کر رہے گا۔ اس کے علاوہ
یہ بھی خیال آیا کہ یہ روپیہ نہایت خاموشی سے دے آنا چاہیئے ورنہ شہر اور حکام میں جہاں
لالہ کی بے ایمانی اور میری ایمانداری کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے کتنی بڑی بدنامی ہو گی
اور وہ سب جج کیا خیال کرے گا جس کے گلے لگ کلب میں بیٹھ کر یہ تاڑ دیا تھا
کہ لالہ کس قدر بے ایمان ہے اور میں کتنا مظلوم اس خیال کے آتے ہی ایک مفلوج
انسان کی طرح ہم چارپائی سے اٹھے اور بغیر کلی یا پیشاب کئے اوور کوٹ پہن کر
ایک ایک قدم ایک ایک من کا اٹھاتے ——— دوستوں اور ہم چشموں کے خوف
سے چوروں کی طرح عام راستے کو بچاتے الٹی گنگا بہاتے ہوئے لالہ کے در دولت پہ
اپنی تقدیر ٹھونکتے اور لالہ کی قسمت پہ رشک کھاتے دل ہی دل میں اس منہ زور
عورت کی زبردستی اور اپنی کمزوری پر آٹھ آٹھ آنسو روتے۔ افتاں و خیزاں پہنچے۔ اور
ملازم سے آواز دلوائی لالہ مکان کے اندر کینیاں پر نہا رہے تھے اور سالقہ رام دھوتی
من پر بیٹھ بیٹھ کر دھوتے جاتے تھے۔ اور اندر سے دھوتی کی پھٹا پھٹ اور سیتا رام
رادھے شیام کی مسلسل آواز آ رہی تھی ——— ملازم کے بار بار پکارنے پر بڑی مشکل
سے آواز سنی۔ جیسے کھڑے تھے ویسے ہی ایک بھیگی ہوئی لنگوٹی باندھے آدھا جسم
سوکھا آدھا تر باہر چلے آئے اور دروازہ کھولتے ہی " ارے " کہہ کر دو قدم پیچھے ہٹ
گئے۔ اور دونوں ہاتھوں سے چہرے سے پانی کے قطرے پونچھ کر میری طرف جلدی

جلدی پلک مار کر دیکھنے لگے۔ میں نے روپیہ کی گٹھڑی کی گانٹھ کھولی اور لالہ کے سامنے دروازے کی چوکھٹ پر رکھ کر کہا۔"یہ لو لالہ اپنے آٹھوں ہزار" لالہ کے جسم اور چہرے کی حرکات سے ایسا مترشح ہوتا تھا جیسے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر معاملہ کی اہمیت اور وفور حیرت نے اُن کی زبان بند کر دی ہے۔ دو تین منٹ میں خاموش کھڑا رہا۔ اور لالہ کے چہرے اور جسم کی عجیب عجیب قسم کی غیر اختیاری اضطراری کیفیات و حرکات کو دیکھتا رہا۔ خصوصاً جس وقت وہ نیچے کو نگاہ کر کے چوکھٹ پر رکھے ہوئے روپئے کو دیکھتے اور پھر فوراً جلدی سے میرے چہرے کو ایک عجیب سماں معلوم ہوتا۔ جب میں نے چلنے کے ارادے سے حرکت کی تو لالہ نے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں دانت باہر کو نکال کر اور دہن کو عجیب طریقے سے سکوڑ کر اور اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں کو اور زیادہ پھاڑ کر گھگھیاتی ہوئی آواز میں جو بجائے زبان یا حلق کے پیٹ کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کہا "میاں سلام" اور جھک کر دُہرے ہو گئے۔

گھر پہنچ کر ہم سمجھتے تھے کہ بیگم سے نہ معلوم کس قدر داد ملے گی۔ مگر وہ تو منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ دیکھتے ہی جی جل گیا۔ بقول شخصے کہ مُرغی جان سے گئی اور میاں کو مزہ بھی نہ آیا۔ یا یوں کہئے کہ مرغا جان سے گیا بی بی کو مزہ بھی نہیں آیا۔ ہے نامحرّم کی پیدائش ——— گھبرا کر فرمانے لگیں "کیوں ابھی روپیہ دیا تو نہیں ہے؟ ———"

"کیوں دیتا کیوں نہیں کیا بات ہے ———" میں نے ذرا خشک تیور اور متجسسانہ نگاہوں سے کہا۔ اس پر بیگم صاحبہ نے ٹھنک ٹھنک کر مخصوص انداز میں اک ادا کے ساتھ فرمایا "ہائیں ابھی پتہ چلا کہ ہم ان روپوں میں سو روپیہ زیادہ گن گئے۔ اس وقت صبح جلدی میں ———" گویا اس کا احسان مجھ پر ہی ہے۔

میں نے کہا۔"بہت اچھا ہوا۔" اس پر فرمایا۔"ہے ہے میاں ایسا بھی مہاجن

کیا بے ایمان ہو جائے گا! ـــــ قسمیہ آپ دیکھیں گے۔ گنتے ہی سو روپے
لے کر سیدھا واپس کرنے آئے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو تم صحیح کہتی ہو ـــــ بے ایمان تو نہیں ہے۔ مگر ہماری
طرح احمق بھی تو نہیں ہے۔" دوپہر تک سو روپے کی تھیلی کا انتظار کرنے کے
بعد بیگم نے پہلے تو ڈرتے ڈرتے ہم سے کہا کہ سو روپے لے آؤ اور جب ہم
نے انکار کیا تو وہی معتمد خاص ملازم فقیرا جو ہم پر صبح لالہ کی ہمدردی میں مسلّط
کئے گئے تھے۔ لالہ کے یہاں بھیجے گئے۔ مگر لالہ نے بالکل انکار کیا۔ اور اپنا کھرا پن
اور ایمان داری دکھانے کو آٹھوں ہزار روپیہ جوان بچارے کے یہاں جوں کا توں
رکھا تھا۔ ملازم کو گِن کر دکھایا۔ اور یہ فرمایا کہ اپنی بیگم صاحبہ سے کہنا۔ کہ کہیں اور بھول
پڑ گئی ہے۔ ان سو روپے کے جانے کی ہم کو دلی خوشی ہوئی۔ اور ہمارے خوش ہوتے
پر بیگم چل ہی تو اٹھیں ـــــ اور جس وقت ہم نے نہایت سنجیدہ ہو کر کہا "بی بی! تم تو
سود دینا حرام بتاتی تھیں۔ صبح ہی صبح تم نے سود میں بنئے کو سو روپے کیوں دیئے؟"
تو بیگم آپے سے باہر ہو گئیں۔ مگر اس مرتبہ ہم ان کے غصے سے بالکل نہ ڈرے اور
ایک سوکھا قہقہہ لگا کر کہا "بی بی مہاجن کا روپیہ تو بغیر سود کے واپس جا ہی نہیں سکتا۔
اور یہ سو روپیہ حساب جمع خرچ میں بندہ تو سود ہی کی ادائگی کی مد میں لکھے گا۔"

(سید) احتشام حسین

۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ وطن ماہل ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی) ہے ابتدائی تعلیم پرانے شرفا اور رؤساء کی رسم کے مطابق مکتب میں ہوئی جس میں مذہبی تعلیم بھی شامل تھی۔ اگرچہ اس کی بنیاد مذہبی نہ تھی۔ میری پیدائش کے زمانے سے پہلے ہی گھر کی حالت میں وہ تضاد پیدا ہو چکا تھا۔ جس میں حقیقت اور خیال کے درمیان جنگ رہتی ہے۔ خاندان اور ملنے جلنے والوں کا ماحول اس قدامت پسندی اور معیاری اخلاق پرستی کا تھا جس میں آزادیِ خیال اور آزادیِ فکر کے لئے مواد نہیں مل سکتا۔ لیکن بغاوتوں کے لئے مل سکتا ہے ؛

انگریزی تعلیم کی ابتداء اعظم گڈھ سے ہوئی جہاں ذہنی پستی اور عام مسائل سے علیحدگی اس وقت بہت نمایاں تھی۔ اس لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ ذہنی نشوونما کا موقع کافی نہ تھا۔ ہر درجے میں انعام ملتا تھا مگر میں اب سوچتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میری عام معلومات کتنی کم تھیں اور میں کس طرح صرف رسمی طور پر علم حاصل کرنے کو صحیح تعلیم سمجھ رہا تھا ؛

انٹرمیڈیٹ کے لئے الٰہ آباد جانا ہوا۔ جولائی ۱۹۳۰ء ہندوستان کی تاریخ میں میرے لئے یادگار ہے۔ الٰہ آباد میں زندگی معلوم ہو رہی تھی۔ سول نافرمانی

شباب پر تھی۔ اور مجھے اس سے پوری دلچسپی ہوگئی۔ میرے مطالعہ کا انداز بدلا تو میرا طریقۂ فکر و نظر بھی بدل گیا۔ آٹھ سال کے مسلسل قیام میں وہاں کئی ذہنی دور گزر گئے۔ یہ آٹھ سال دل اور دماغ دونوں کے لئے بے پناہ حرکت اور زندگی کے حامل تھے۔ مختلف قسم کی پابندیوں کی وجہ سے آزادی رائے اور خود نمائی کی بہت کمی رہی اور شخصیت کو پوری طرح نمایاں ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ زیادہ پڑھنے اور غور کرنے کی وجہ سے یہ کمی صرف ایک حد تک رفع ہوئی۔ لیکن آج بھی باقی ہے۔

مضمون نگاری کا شوق غالباً ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ اُس وقت کچھ افسانے لکھے جس میں زبان کے لحاظ سے نیاز فتحپوری کا تتبع تھا اور پلاٹ وغیرہ میں عمومیت تھی۔ پھر بی۔ اے میں پہنچ کر ہر طرح کے مضامین لکھنے لگا۔ تاریخ۔ تنقید۔ سنجیدہ اور مزاحیہ افسانے، سیاسی، مذہبی اور معاشی مسائل پر بحث، ڈرامے، کوئی ایسی چیز نہ تھی جس پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔ کبھی کبھی نظمیں اور غزلیں بھی کہتا رہا۔

مجھے اعتراف ہے کہ اپنی قدامت پسند ابتدا سے میں خوش نہ تھا۔ مجھے کچھ اندھیرا سا نظر آ رہا تھا اور ہندوستان کی مختلف ترقی پسند تحریکوں نے وہ اندھیرا دُور کر کے مجھ میں کسی قدر خود اعتمادی کی طاقت پیدا کی اور میرے بہت سے نیم بیدار خیالات کو بڑھنے اور پھیلنے کا موقع دیا۔ اس وقت بھی میری ذہنیت ایک متشکک کی ذہنیت معلوم ہوتی ہے خبر نہیں آئندہ کیا ہو۔ میں اپنے میلانات کا صحیح تجزیہ بھی نہیں کر سکتا۔ کہیں راستہ میں ہوں۔

۱۹۳۴ء میں بی۔ اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے دونوں الٰہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ قانون پڑھ رہا تھا کہ ملازمت مل گئی۔ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی و اُردو میں لکچرار ہوں۔ ادبیات کے علاوہ سیاسیات فلسفہ تحلیل نفسی۔ عمرانیات اور جنسیات سے دلچسپی رکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں۔ کہ

بغیر ان تمام علوم سے دلچسپی لئے ہوئے صحیح ادبی ذوق بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اب تک مضامین تو سینکڑوں لکھے لیکن کوئی باقاعدہ تصنیف نہ پیش کر سکا۔ کام کر رہا ہوں ممکن ہے جلد ہی کوئی ادبی خدمت کر سکوں۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں شادی کر لی۔ تیر اندھیرے میں چلایا تھا۔ لیکن ابھی تک تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نشانہ پر بیٹھ گیا ہے۔ معلوم نہیں اس معاملہ میں میری سہل پسندی نے تسکین دے دی ہے یا کوئی اور بات ہے +

کھنڈر

شہر سے کوئی میل بھر کے فاصلے پر ایک بہت بڑی عمارت کا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر تھا۔ غریب کے جھونپڑے کی طرح ویران اور مزدور کی جیب کی طرح خالی۔ مگر جیسے غریب کے جھونپڑے میں کبھی کبھی زندگی کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور مزدور کی جیب میں چند پیسے آجاتے ہیں۔ اسی طرح اس کھنڈر میں بھی ایک بوڑھا فقیر رات کاٹنے کے لئے آجاتا تھا۔ وہی اس کا تنہا مالک تھا۔ شاید کبھی اس عمارت کی ملکیت کے لئے جھگڑے ہوئے ہوں۔ لیکن اب فقیر اس پر پوری طرح قابض تھا یا کبھی کبھی وہ سیاہ کتا آجاتا جو بھکاری کی جمع کی ہوئی چیزوں میں شریک ہوتا تھا۔

قصے تو بہت سے مشہور تھے لیکن ٹھیک پتہ نہ تھا کہ یہ کس عمارت کا کھنڈر ہے۔ بوڑھے اور جوان اس کے متعلق کم باتیں کرتے تھے۔ لیکن بچے ہر زمانے میں یہ جانتے تھے کہ اس میں بھوت رہتے ہیں۔ اس پر جنوں کا قبضہ ہے اسی لئے کوئی اس کے قریب نہ جاتا تھا جس راستے سے گزر کر وہ کھنڈر ملتا تھا وہ بھی سنسان تھا۔ چرواہوں کے لڑکے اپنے جانوروں کو اُدھر نہ جانے دیتے تھے۔ اور بچے اُدھر نہ نکلتے تھے لیکن وہ بوڑھا بھکاری دن بھر کی محنت کے بعد

اسے رات میں ضرور آباد کرتا۔ کم لوگوں نے اُسے اس محلسرا سے نکلتے یا اس کے اندر جاتے
دیکھا تھا۔ اور اگر کبھی صبح کے اندھیرے یا رات کی تاریکی میں دیکھا بھی تو جن یا بھوت سمجھا۔
کھنڈر کی دیواروں پر گھاس اُگی ہوئی تھی۔ زیادہ حصہ گر چکا تھا۔ اُونچی نیچی زمین ہر برسات
میں اپنی شکل بدلا کرتی تھی لیکن اس عظیم الشان عمارت کا وہ گوشہ جس میں بھکاری کی راتیں بسر
ہوتی تھیں ایک حالت پر قائم تھا۔ تقریباً دس بارہ فٹ لمبی چوڑی چھت چند بوسیدہ لکڑیوں
پر ٹکی ہوئی تھی۔ بعض چھیدوں میں سورج کی روشنی اور چاند کی کرنیں اس کے اندر تک پہنچ جایا
کرتی تھیں۔ ویسے بھکاری کو کبھی چراغ جلانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ خبر نہیں وہ کب سے
اس کھنڈر میں رہتا تھا۔ شاید اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اس نے یہیں بسر کیا ہو۔ ممکن ہے
کبھی اِنہیں تاریکیوں میں اس کی جوانی کی راتیں رنگین بھی ہوں۔ کون جانتا ہے ـــــ مگر اب
وہ بالکل بوڑھا تھا مرنے کے قریب ـــــ

اور قریب ہی ایک برگد کا سوکھا درخت بھی اس کھنڈر کی طرح ویران اور خشک تھا
اس کی ایک اونچی شاخ پر ایک بڑا گدھ بیٹھا ہر وقت اونگھا کرتا تھا۔ دوسرے تیسرے دن وہ
کہیں جاتا اور پھر اس درخت پر آجاتا۔ وہ بھی اس بھکاری کی طرح اکیلا تھا۔ کھنڈر، بھکاری،
درخت اور گدھ۔ جیسے یہ سب کسی ایک ہی سلسلہ کی کڑی معلوم ہوتے تھے۔ سب ضروری تھے
اگر وہ کھنڈر نہ ہوتا۔ تو بھکاری کہاں جاتا۔ اگر بھکاری نہ ہوتا تو پھر اس مکان کی ضرورت ہی کیا
تھی۔ اگر وہ درخت نہ ہوتا تو اس کھنڈر کی ویرانی پوری طرح محسوس نہ ہوتی اور وہ
کہیں اور ہوتا اور اگر گدھ نہ ہوتا تو یہ درخت بیکار تھا۔ یقیناً ان سب میں فرسودگی کی جھلک کے
باوجود کوئی کہانی تھی جو لکھے جانے کی محتاج تھی۔

کیا اس کھنڈر میں جوان مرد اور حسین و جمیل عورتیں کبھی نہ پھرتی رہی ہونگی؟ کیا اس
سوکھے درخت میں کبھی پتیاں اور پھل نہ رہے ہونگے۔ کہ اس مردار خوار گدھ کے علاوہ دوسری
چڑیاں بھی اپنا آشیانہ اس میں بناتیں ـــــ؟ کیا معلوم شاید رہا ہو ـــــ مگر اس سے کیا ہوتا

ہے۔ آج تو اس کھنڈر میں ایک بھکاری رہتا تھا۔ جو دن بھر ایک ٹکڑے روٹی کے لئے مارا مارا پھرتا اور رات کو اس میں آکر آرام کرتا۔ اور اس درخت پر ایک گدھ تھا جو مُردہ جانوروں کے انتظار میں بیٹھا اُونگھا کرتا ۔۔۔

جاڑوں کی ٹھنڈک سے بچنے کے لئے اور بارش سے محفوظ رہنے کے لئے بھکاری اس ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے چلا جاتا اور گرمی کی دھندلی چاندنی میں وہ چھت کے باہر نکل کر سو جاتا مگر گدھ کو ہمیشہ ایک ہی جگہ بیٹھا ہوا دیکھا گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملتے جُلتے بھی تھے اور مختلف بھی۔

بھکاری بوڑھا اور کمزور ہوتا چلا گیا۔ اب کوئی دن ایسا بھی گزر جاتا کہ وہ باہر نہ نکلتا۔ اگر پچھلے دن کی بچی ہوئی روٹیاں ہوتیں تو کھا لیتا ورنہ فاقے سے پڑا رہتا اور تیسرے دن بھوک سے مجبور ہو کر پھر نکلتا۔ اس سے چلا نہ جاتا تھا مگر چلتا تھا۔ اس سے بولا نہ جاتا تھا مگر بولتا تھا۔ اس میں شہر تک جانے کی ہمت نہ تھی مگر جانا ضروری تھا۔ واپس آنے کی سکت نہ تھی مگر واپس آنا لازمی تھا۔ شہر کی تمام عمارتیں اپنی عظمت اور ہیبت سے ڈرا کر اسے اپنے یہاں جگہ دینے سے انکار کرتی تھیں۔ مگر کھنڈر کی عظمت اور ہیبت کے باوجود اس سے مانوس تھا۔

جاڑے ہی سے اس کی بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ مگر وہ شہر آتا جاتا تھا۔ دو تین دروازے تھے جہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا تھا پہلے وہ ان دروازوں سے بھیک پا جانے کے بعد بھی سارے دن شہر میں مانگتا پھرتا تھا۔ مگر اب اس کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ وہ کم سے کم پر اکتفا کرتا اور اُٹھتا بیٹھتا کھنڈر میں واپس آجاتا۔ گرمی آتے آتے اس کی ساری قوت ختم ہو گئی اور تین دن تک وہ کہیں نہ جا سکا۔ چوتھے دن پھر اس نے ہمت کی اور دن بھر شہر میں چکر لگاتا رہا۔ رات کو واپس آگیا۔ اب تک اسے کھنڈر میں روشنی کی ضرورت کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ مگر آج اس کی نگاہ کام نہ کرتی تھی۔ اُسے ہر جانب روشنی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی ناچ رہی تھیں اور طبیعت میں ہیجان تھا۔ رات کو دیر گئے
چاندنی پھیلی، بھکاری بخار کی گرمی سے لوٹتا ہوا چھت کے نیچے سے باہر آگیا۔ یہ اس کی
آخری رات تھی۔

صبح ہوئی تو گدھ نے پر پھڑپھڑائے۔ اُس نے کبھی کسی انسان کو کھنڈر میں اس طرح
پڑے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کی غنودگی ختم ہوگئی اور وہ اُڑ کر پڑے ہوئے بھکاری کے قریب
آیا۔ بھکاری نے بے چینی سے ہاتھ پیر ہلائے۔ گدھ نے اپنی چونچ اس کے جسم پر ماری،
بھکاری نے درد سے جلد جلد کروٹیں بدلیں۔ گدھ اُڑ کر اپنی جگہ پر چلا گیا۔ لیکن اب وُہ
اُونگھ نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھکاری پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دن بھر تڑپا کیا۔ رات کو
کھنڈر بے مالک کے رہ گیا ——

صبح کو گدھ پھر نیچے آیا۔ اور تھوڑی دیر میں بہت سے گدھ جمع ہوگئے۔ اب وُہ
درختوں پر بیٹھ کر اُونگھنے والے کمزور جانور نہ تھے۔ ان میں زندگی تھی۔ اُن میں آواز تھی۔
ان میں لوٹنے والوں کی خود غرضی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

اُونچی نیچی دیواروں کے سائے اُسی طرح غیر مسلسل پہاڑ کی طرح لمبے ہوتے رہے،
دیواروں کی گھاس ہوا سے اسی طرح ہلتی رہی۔ مگر بھکاری نہ رہا۔

دوسرے دن ہڈیوں کا ایک انسانی ڈھانچہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ بالکل کھنڈر کی طرح
ویران —— درخت پر کئی گدھ رہنے لگے۔ لیکن اب کوئی بھکاری ان کی غذا بننے کے لئے
اس کھنڈر میں نہ آتا تھا۔

wonderful performance!
wonderfully suspence and
suspence climax

(پیرزادہ) احمد ندیم قاسمی

میری تاریخ پیدائش ۲۱ نومبر ۱۹۱۵ء ہے۔ میرے گاؤں کا نام انگہ ہے جو ضلع سرگودھا میں کوہستان کی ایک حسین و جمیل وادی "سون" میں ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ میرے اسلاف عہدِ مغلیہ سے بلکہ اس سے بھی پیشتر علاقہ سون میں تبلیغ اسلام کے مبارک کام میں مصروف رہے۔ اس لئے ان کے نام کے شروع میں "پیر" اور آخر میں "شاہ" کے القاب لوگوں نے احتراماً لگا دیئے۔ اور اسی لئے میرا نام "احمد شاہ" رکھا گیا۔ بعد میں "شاہ" نے مجھے بہت پریشان کیا۔ کیونکہ یہ لفظ سیدوں کے لئے مختص ہو چکا ہے۔ اور میں اعوان ہوں۔ اب ادبی دنیا میں مجھے احمد ندیم قاسمی کہا جاتا ہے۔ اور میں مطمئن ہوں کہ مجھے خواہ مخواہ سید سمجھنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہو رہی ہے۔ اپنے گاؤں میں ہی میں نے چار ابتدائی جماعتیں پاس کیں۔ اور وظیفہ حاصل کرتا رہا۔ میرے والد پیر غلام نبی شاہ مرحوم انہیں دنوں میں تقریباً پچھتر سال کی عمر میں وفات پا گئے اور میرے حقیقی چچا خان بہادر پیر حیدر شاہ مرحوم۔ افسر مال کیمبل پور نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ انہیں کے ہمراہ میں دسویں جماعت میں شیخوپورہ چلا گیا۔ اور وہاں سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا چونکہ مرحوم پیر صاحب پنشن پر جانے والے تھے اور ریاست بہاولپور میں انہیں عہدہ مشیر مالی پیش کیا گیا

تھا۔ اس لئے مجھے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں بھیج دیا گیا۔ وہیں سے
میں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ جب میں بی۔ اے کے پہلے سال
میں تھا تو مرحوم پیر صاحب بہاولپور میں مشیر مال مقرر ہو گئے۔ ایک ماہ کی رخصت
پر گھر گئے اور وہاں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔ میرے پھپھیرے
بھائی رسالدار میجر ملک میر حیدر خان انڈین آفیسر محکمہ آرمی ریمونٹ (منٹگمری)
نے دستگیری فرمائی اور میں بی۔ اے پاس کر کے تلاش روزگار کی الجھنوں میں گھر
گیا۔ بی۔ اے میں نے ۱۹۳۵ء میں پاس کیا۔ چند روز عارضی طور پر دارالاشاعت
پنجاب میں تہذیب نسواں کے لئے کہانیاں ترجمہ کرتا رہا۔ ای۔ اے۔ سی تحصیلداری
نائب تحصیلداری اور ایکسائز کی سب انسپکٹری کے لئے رول بھجوائے لیکن چند
ایسی وجوہات کی بنا پر ہر جگہ منہ کی کھانی پڑی۔ جو میرے ایسے نوجوانوں کے
تجربہ میں آ چکی ہیں اور آ رہی ہیں۔ آخر جولائی ۱۹۳۹ء میں مجھے انسپکٹر
آبکاری کے عہدے پر ملتان میں مقرر کیا گیا۔ اور تب سے وہیں ہوں اور
آئندہ کی خبر میرا خدا جانے۔

بچپن سے مجھے مشہور شعرا کا منتخب کلام جمع کرنے کا شوق تھا۔ یاد پڑتا
ہے کہ کئی بار میں نے شعر کہنے کی بھی کوشش کی مگر ان کی نقل موجود نہیں۔ ساتویں
جماعت میں میں نے اسی صفحات کا ایک ناول بھی لکھا تھا جس میں ایک نوجوان
نے ایک دوشیزہ کو دریچے سے جھانکتے دیکھا۔ اور وہ بیہوش ہو گیا۔ دوشیزہ بھاگ
کر آئی۔ لخلخہ سنگھایا۔ محبت کی پینگیں بڑھیں۔ لیکن لڑکی کے والدین کو سب راز
معلوم ہو گیا اور دونوں سنکھیا پھانک کر قربان گاہ محبت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ مضمون
وہی فرسودہ اور پامال تھا۔ لیکن اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مجھے لکھنے کا
شوق بچپن سے تھا۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں میرے ایک رشتہ دار (غلام جیلانی مرحوم - جو
پنجابی کے ایک آتش نوا شاعر تھے) کو بہت بڑا صدمہ پہنچا - ان کی والدہ اور ہمشیرہ
کے جنازے ایک دن اور ایک وقت ہی اُٹھائے گئے - مَیں نے سوچا کہ اکثر عزیزوں
کی وفات پر مرثیے کہے جاتے ہیں - کیوں نہ مَیں بھی سعی کروں - سعی کی گئی اور ایک
نظم جس کا کوئی مصرعہ وزن سے نہیں گرتا تھا (مگر جس میں قافیہ کا التزام ناپید تھا)
تیار ہو گئی - نظم مرحوم پیر صاحب کو دکھائی گئی جنہوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور
ارشاد کیا - کہ تم اچھے شاعر بن سکتے ہو بشرطیکہ تمہارے مد نظر ملک اور قوم کی
فلاح و بہبود ہو - مرحوم فارسی اور اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے - اور اگر وہ میری
ہمت افزائی نہ کرتے تو شاید مَیں آج بھی مختلف شعرا کا کلام ہی انتخاب کرتا پھرتا -
دوسری نظم میں نے مرحوم مولانا محمد علی کی وفات پر لکھی - جو حضرت شاطر غزنوی کی وساطت
سے روزنامہ سیاست کے صفحہ اوّل پر شائع ہو گئی - انہیں دنوں میں انٹرنس
کا نتیجہ نکلا - اور مَیں بہاول پور چلا گیا - وہاں کے چار برس کے قیام میں مَیں نے
اس قدر نظمیں اور غزلیں کہیں کہ اگر مَیں ان کی تعداد لکھوں تو قارئین اسے
مبالغہ سمجھنے لگیں - کالج کی بزم ادب کا اس پریذیڈنٹ ہونے کی حیثیت میں
مَیں نے اُردو کی (اپنے محدود ماحول میں) کافی خدمت کی - کالج کے رسالہ "نخلستان"
کے انگریزی اور اُردو حصوں کا ایڈیٹر بھی رہا - ۱۹۳۵ء میں میرے ایک نہایت
عزیز دوست محمد خالد (فرزند رشید مولوی اختر علی صاحب اسسٹنٹ کمشنر
رحیم یار خاں - ریاست بہاولپور) نے مجھے نثر میں لکھنے کی ترغیب دی - وہ
خود بلا کے ذہین اور طبّاع نوجوان ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ انگریزی کی
بجائے اُردو میں لکھنے لگیں تو اُردو ادیبوں کے سامنے ایک بالکل نرالی اور شاداب
راہ کھل جائے - وہ آر - ایل - اسٹیونس اور رائڈر ہیگرڈ کے مہماتی ناولوں کے

مدّاح تھے۔ مجھے اس رنگ میں لکھنے کا شوق دلایا۔ اور اس اثر کے ماتحت
مَیں نے جو افسانے لکھے۔ وہ رسالہ "شاہکار" میں چھپتے رہے۔ لیکن جلد ہی
مَیں اس رنگ سے دل برداشتہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد مَیں نے اپنی شاعری
اور افسانہ نگاری کی بستیاں جس سرزمین میں آباد کیں وہ میرے پڑھنے والوں
کو اچھی طرح معلوم ہے، کالج کے دنوں میں لکھی ہوئی نظموں اور غزلوں کے پلندے
مَیں نے ایک روز لاہور میں نذرِ آتش کر دیئے اور میری ادبی زندگی کا روشن
دَور حقیقت میں ۱۹۳۶ء کے اوائل سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء سے
۱۹۳۹ء تک مَیں تقریباً اپنے گاؤں میں رہا۔ اور دیہاتی زندگی کا اس
شدت سے مطالعہ کیا کہ اب میرے نزدیک دُنیا کا ہر گاؤں میرا وطن ہے۔
دیہات مجھے پیارے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر نہیں جو ہائی اسکول کے طلبا شہری
اور دیہاتی زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اور جنہیں اساتذہ (سینہ بسینہ)
نئی نسلوں کے بچّوں کے دماغوں میں منتقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ صرف اس لئے
کہ یہاں مجھے قانون اور مذہب اور معاشرت کی ایسی کھُلی درسگاہیں ملی ہیں جو
مشینوں کے دھوئیں میں لپٹے ہوئے شہروں میں صاف دکھائی نہیں دے سکتیں
یہاں مَیں نے انسانی دِل کی دھڑکن کی آواز خُوب غور سے سُنی۔ مَیں نے حُسن کو جنسی
احساسات سے الگ کر کے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے پرکھا۔ مَیں نے یہاں کے
ہر ذرّے میں ہزاروں جنتیں چھُپی ہیں۔ نیموں کے سایوں میں بیٹھ کر مَیں نے محسوس
کیا کہ یہی وہ سرزمین ہے جہاں مجھے اپنے شعر اور افسانہ کا محل کھڑا کرنا چاہئے۔
مَیں نے بنیاد رکھ دی ہے۔ ہر روز ایک نیا پتھر جماتا ہوں اور چاروں طرف
نظریں دوڑاتا ہوں کہ شاید اس عظیم الشّان کام میں میرا کوئی ساتھی آ نکلے۔ مگر
اس کا کیا کیا جائے کہ دیہات کے مسائل پر لکھنے والے تو بہت ہیں۔ لیکن

اکثریت ان کی ہے جو صنوبر کے بلند و بالا درختوں کو صحراؤں میں جھومتے دکھا دیتے ہیں اور کھجوروں کو سر بفلک چوٹیوں پر!

فن کی اصطلاحات سے میں بالکل نابلد ہوں۔ علم عروض کی ابجد تک نہیں جانتا۔ میرا مطالعہ بہت محدود ہے اور میں یہ اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی خوش بھی ہوں کہ میری ساری تحریریں میری اپنی ہیں ان پر کسی غیر کا سایہ تک نہیں پڑا۔ میں نے اب تک ۲۵۰ نظمیں، ۲۰۰ غزلیں، ۳۰۰ قطعات اور ۸۵ افسانے لکھے ہیں۔ ۲۵۰ قطعات کا مجموعہ "دھڑکنیں" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اور افسانوں کے چار مجموعے "چوپال، بگولے، گرداب" اور "طلوع و غروب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

شعر اور افسانہ میں میرا کوئی استاد نہیں، لیکن مولانا عبدالمجید سالکؔ، حضرت اخترؔ شیرانی۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی۔ جناب سعادت حسن منٹو اور جناب کرشن چندر میرے مہربان بزرگ اور دوست ہیں اور غیر محسوس طور پر ان کی ذات اور صفات کا اثر میری روح پر پڑتا رہتا ہے۔

میری منزل بہت دُور ہے۔ اور راہ پُر خطر ہے۔ لیکن مجھے وہاں ضرور پہنچنا ہے۔ شعر میرا عصا ہے اور افسانہ میرا زادِ راہ۔ کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں صرف مخلص دلوں کی دُعا چاہیئے +

سائے

غروب آفتاب کے بعد جب پربتوں میں نصف چاند کی زرد چاندنی سنسنانے لگی اور
دور ایک گھاٹی میں ایک جھرنے کے کنارے مینڈک نے غری تانیں اڑانے لگے۔ تو وہ ماں
باپ کی کھاٹوں کے قریب سے لہنگا سمیٹتی کھسک کر جھونپڑے کی دہلیز تک آئی اور آنکھیں پھاڑ
پھاڑ کر تنگ پگڈنڈی کے اس موڑ کو دیکھنے لگی جس کے پاس ایک صاف چوڑی چٹان پر اس
کے خواب منڈلا رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے پگڈنڈی کا موڑ کسی نامعلوم روشنی سے جگمگا اٹھا۔
اور اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان اپنے خوبصورت لمبے بالوں میں ہاتھی دانت کا سفید کنگھا
سجائے اس کی طرف بازو پھیلائے بڑھا آ رہا ہے اور پگڈنڈی کے کنکر ادھر ادھر گھاٹیوں میں
لڑھکے جا رہے ہیں کہ اس کے نئے زریں جوتوں پر کھرونچیں نہ پڑ جائیں اور ستاروں کا ایک
جھرمٹ ایک تاباں بادل کی صورت اختیار کر کے اس کے سر پر سایہ کئے تیرتا آ رہا ہے جھونپڑی
کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی آسمانی جھولے میں بیٹھی جھول رہی ہے۔
اور جب جھولا آگے بڑھتا ہے تو آنے والا نوجوان اس کے اسقدر قریب آ جاتا ہے کہ وہ اس
کا سفید کنگھا چرا کر اپنی زلفوں میں چھپا لیتی ہے۔ اور جھولے کے پیچھے ہٹتے ہی دونوں اس

زور سے قہقہے لگاتے ہیں کہ ـــــ اور اچانک اس نے بے جانے بوجھے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ اس کا باپ کھاٹ پر کروٹ بدل کر بولا۔ "اے کیا ہے آشی؟ کیوں ہنسی تو؟" ـــــ اور پھر اس کی ماں کی آواز "اے ادھر آ۔ لیٹ جا میرے پہلو میں۔ کیوں دہلیز سے چمٹی کھڑی ہے؟" ـــــ اور پھر لمبی لمبی "ہوں۔ ہوں" کے بعد دونوں طویل اُبکائیاں لیتے سو گئے۔

اُس نے اپنے نرم نرم قدم جھونپڑی سے باہر رکھے اور بھیڑوں کے باڑے کے پاس جا کر رُک گئی۔ اس کی بھوری بلی اس کے ٹخنوں سے اپنا ریشمیں جسم رگڑنے لگی۔ اور بہت دُور کہیں کوئی بُوڑھا کتا دو تین بار بھونک کر خاموش ہو گیا۔ بلی کو دھتکار کر وہ ہولے ہولے قدم اُٹھانے لگی۔ اور اسے ساون کے وہ دن یاد آ گئے۔ جب اُس نے ایک طوفانی رات میں نازو کو اپنے جھونپڑے میں پناہ دی تھی۔

بادلوں کی گھن گرج میں جب وہ جھونپڑے کے عین درمیان ایک چولھے کے قریب بیٹھی اپنے باپ کے پاؤں دبا رہی تھی۔ تو دروازے پر تیز اور بھاری دستک ہوئی اور جب اُس نے پوچھا۔ "کون؟"

تو ٹھٹھری ہوئی آواز آئی۔ "نازو۔ تارہ گاؤں والا نازو۔" اس نے نازو کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ کیونکہ جب نیچے وادیوں میں کبڈی کے میلے ہوتے۔ تو آشی اپنی دوسری سہیلیوں کو ہمراہ لے کر ایک بہت اُونچی چوٹی پر چٹانوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جاتی اور نیچے چوڑے اُبھرے ہوئے سینوں اور گٹھے ہوئے جسموں والے نوجوانوں کو بگولوں کی طرح دوڑتے اور پہاڑیوں کی طرح ٹکراتے دیکھتی۔ ایک بار نازو نے علاقے کے سب سے بڑے کبڈی کھیلنے والے کو یوں سر سے گھما کر پھینکا کہ وہ ڈھول پیٹنے والوں کے قدموں میں آن گرا۔ اور پھر جو لوگوں نے نازو کو کندھوں پر اُٹھا کر سارے میدان کا چکر لگایا۔ اور نیلی پیلی پگڑیاں مسرتوں کی چیخوں کے ساتھ میدان میں اُچھل اُچھل گئیں تو اس کے دل میں نازو سے دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔

اور پھر سرما کی اداس دوپہروں میں اور چھٹکی ہوئی بے جان چاندنی سے لپٹی ہوئی راتوں میں اس کے کنوارے جذبات پر منڈلانے والا اچانک اس کے گھروندے میں آدھمکے! ایک بار اچھل ہی تو پڑی۔ بارش کی شدت میں باہر بھیڑیں دردناک انداز میں ممیا رہی تھیں۔ آشی کے ماں باپ اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں کے تکئے بنائے نسوار کی چٹکیاں نتھنوں میں چڑھا رہے تھے اور ایک منحوس سی صورت والی بلی چولھے کے کنارے اپنی دم کا آخری سرا اپنے اگلے پنجوں میں دبائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ آشی لپک کر دروازے کے پاس آئی اور زنگ خوردہ زنجیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی۔ اپنے خیالوں کے دیوتا کو اپنے سامنے پاکر وہ کیسے ضبط کر سکے گی، کیا اس کا دل یونہی دھڑکتا رہے گا! کیا اُس کی آنکھیں یونہی کھلی رہیں گی! کیا سرسبز وادیوں میں شیر کی طرح دھاڑتا اور بجلی کی طرح جھپٹتا ہوا نازو اس کی اس کیچڑ بھری دہلیز پہ قدم دھریگا!
——اور پھر اس نے اپنے بھدے چولھے کی طرف دیکھا جس میں بجھتے ہوئے انگارے آنے والے حادثہ کے انتظار میں دم سادھے زرد پڑ رہے تھے۔ اور بلی اپنی غنودگی بھری آنکھیں نیم وا کئے اپنی مونچھیں تھرتھرا رہی تھی۔ اچانک آشی کو اُس کے باپ کی آواز نے دہلا دیا۔ "اری کیا کھڑی سوچ رہی ہے؟ دروازہ کھول۔ بے چارہ باہر کھڑا ٹھٹھر رہا ہے!"

اور جب آشی نے ایک کل کی طرح زنجیر کھول ڈالی اور پھوار لدے جھونکوں سے کواڑ پھٹ سے کھل گئے تو دور مشرقی اُفق پر چمکتی ہوئی بجلی کی چکا چوند میں اُس نے ایک سرِقد سایہ دیکھا جو آگے بڑھا اور آشی کے پہلو سے سمٹ کر نکلتا چولھے پر دیوانوں کی طرح جھک گیا۔ بلی ہمک کر کھاٹ پر ہو بیٹھی اور آشی کے ماں باپ نسوار کی ڈبیہ سنبھالتے اُٹھے اور جب کواڑ بند کر کے آشی نازو کے بالمقابل آ کر بیٹھ گئی تو اُس نے دیکھا کہ بھیگی ہوئی کالی باریک مونچھوں کے نیچے دو نیلے ہونٹ یوں کپکپا رہے تھے، جیسے آشی سے پوچھ رہے ہیں

آشی! اچھی لو ہو۔"
نازو کچھ دیر کے بعد سیدھا بیٹھ گیا اور بولا۔ "آج بدقسمتی سے شام کو گھاس کی ضرورت
پڑ گئی تھی۔ گھاس چرانے آئی لیکن جنگل کے داروغہ کا ڈر تھا۔ دن کو تو وہ اس پربت کا راجہ ہے۔
بھلا ہو تمہارا کہ اس ویرانے کو آباد کئے بیٹھے ہو ورنہ میں تو ٹھٹھر کر مر جاتا۔"
اور یوں ہی باتوں باتوں میں بوڑھا بڑھیا سو گئے اور بہت دیر تک نازو اور آشی
سر جھکائے بیٹھے رہے زرد انگاروں کی آسیبی چمک اُن کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ اور بھیڑیں
ممیا رہی تھیں۔ بلی بوڑھے کی بغل میں خرخراتی ہولے ہولے گھسی جا رہی تھی۔ اور آشی کا
دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پچھلے سال بادلوں کے جھرمٹ میں عید کے چاند کا باریک
تار دیکھ کر اس کے پاؤں آپ سے آپ رقص کرنے رہے تھے۔
وہ گھڑی بھر انگاروں کو گھورتی نازو کے ہاتھوں کی طرف دیکھ لیتی جن کی ہتھیلیاں
گلابی تھیں اور جن کا الٹا حصہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ ہاتھ کیسے کیسے چوڑے چکلے
سینوں پر فولادی ہتھوڑے بن کر برسے ہیں اور یہی ہاتھ اب انگاروں پر جھکے ہوئے کیسے
پیارے معلوم ہو رہے ہیں۔ آشی نے سوچا —— اور ان کے ناخن لال سیپیوں کی طرح
سانولے چمڑے میں کس نقاش نے جڑے ہیں —— اور لاشعوری طور پر اس نے
اپنے ناخنوں کو دیکھا اور چند لمحے وہ نازو کے اور اپنے ناخنوں کا مقابلہ کرتی رہی،
اور پھر باہوں کا —— شانوں کا —— گردن کا اس نے دو چار بار اپنے شانوں اور
گردن کو چھوا —— اسی حالت میں اس کی نگاہیں نازو کی ٹھوڑی پر پڑیں اور پھر ہونٹوں
اور ناک پر سے ہوتی ہوئیں اوپر اٹھ گئیں —— باہر بجلی چمکی اور کواڑ کی چولوں کے پاس
دو ننھے سے جگمگا کر بجھ گئے —— نازو اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک ساتھ دونوں
کی آنکھیں جھپکیں اور پھر ایک ساتھ اٹھیں۔ اور یونہی آنکھوں کے جھپکنے جھکنے اٹھنے
اور مل جانے کے خاموش شور میں آشی اپنے والدین کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھی اور

بھنچی ہوئی آواز میں بولی۔
"آپ کبڈی کے کھلاڑی ہیں؟"
"نہیں۔ مَیں کبڈی کا کھلاڑی ہوں" —— نازو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے بے معنی جواب سے شرمندہ ہو کر بولا "یعنی —— یعنی میں —— مَیں کبڈی کا کھلاڑی ہوں!"
—— اور اچانک اُن کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کے ستارے ٹمٹمانے لگے۔
اور ایک بار پھر کواڑ کی چُولوں کے پاس دو قمقمے جگمگا کر بُجھ گئے!
"آپ اچھے کھلاڑی ہیں" آشی نے کہا۔
اور نازو بولا "نہیں مَیں تو بہت بُرا کھلاڑی ہوں۔ مَیں دوڑ نہیں سکتا۔ میرا ایک گھٹنا ٹل گیا ہے۔ اور ایک کُہنی نکل گئی ہے۔ ایک پسلی بھی ایک بار چٹخی تھی۔ لیکن حکیم کہتے ہیں کہ پسلی کی چٹخ دوسرے لوگ بھی سُن لیتے ہیں۔ یہ کوئی اور چیز چٹخی ہو گی۔ پھر بھی اس دن سے درد رہتا ہے کمبخت!"
"بھلا کیا چیز چٹخی ہو گی۔" آشی جیسے اپنے آپ سے مشورہ کر رہی تھی "پسلیوں سے پرے انتڑیاں ہیں اور انتڑیاں چٹخا نہیں کرتیں۔ کٹ جایا کرتی ہیں۔ اُلجھ پڑتی ہیں! کہاں سے آئی تھی چٹخ کی آواز!"
"یہاں سے" نازو نے بائیں جانب کی تیسری اور چوتھی پسلی کے درمیان اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ آشی گھبرا کر ایک لکڑی سے بُجھتے ہوئے انگارے اُلٹنے لگی۔ بلّی کی خُرخُر بلند ہو گئی اور کواڑوں کی چُولوں کے پاس دو قمقمے جگمگا کر بُجھ گئے۔ بادل اس زور سے کڑکا جیسے سیلاب کی زد میں پہاڑ بہ نکلے ہیں اور بَینگوں بھرا دیا اپنی زرد لو کو نچا کر دھیما ہونے لگا۔ کواڑوں پر بوندوں کی دستک بدستور جاری رہی!
یکدم جب آشی کے باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنی کُہنی سے خُرخُر کرتی

بلّی کا سر کچل ڈالا تو اس کی چیخوں سے تنگ آ کر وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اسے گردن سے پکڑ کر پرے پھینکتے ہوئے بولا "جب دیکھو جب ہی میری بغل میں گھسی آ رہی ہے کمبخت کسی رات میری بغل ہی میں بچے جن دے گی۔ نازو مسکرایا اور آشی زور زور سے ہنسنے لگی۔ جیسے کانسی کے کٹورے میں یکبارگی دو چار پیسے گر پڑیں!

بڑھیا بھی آنکھیں ملتی اُٹھی۔ جیسے کسی نے پرانے چیتھڑوں کی ایک گٹھڑی کھول ڈالی ہے۔ نیم خوابیدہ حالت میں پکاری۔ "ہے آشو۔ اُٹھ۔ صبح ہو گئی۔ میرے لئے مصلّےٰ بچھا دے۔ دو سجدے کر لوں۔" اور پھر چولھے کے قریب آشی کا سایہ دیکھ کر بولی "اری تو تو جاگ رہی ہے!" "اور سامنے نازو پر نظر ڈالی تو کھاٹ پر پہلو بدلتی کہنے لگی "تو ساری رات جاگتا رہا میرے بچے؟ کیا کروں ——— نگوڑی دو ہی تو کھاٹیں ہیں ہمارے گھر میں۔ آشی میرے پاس ہی پڑ کر رات کاٹ لیتی ہے۔ میں حیران تھی کہ آج مجھے اچھے اچھے خواب کیوں دکھائی دیئے ورنہ بچے جب آشی میرے پاس سوتی ہے نا تو بس ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ یوں باہیں پھیلاتی ہے اور کروٹیں بدلتی ہے کہ میں نگوڑی کھاٹ کے بازو سے ہی چمٹی رہ جاتی ہوں!"

نازو ہنستا ہنستا اُٹھا اور سر کے بالوں کو اُنگلیوں سے سنوارتے ہوئے بولا "لے ماں اب میں جاتا ہوں۔ خدا تم سب کا بھلا کرے۔ آج رات اگر تم مجھے پناہ نہ دیتے تو میں ٹھنڈ سے اکڑ گیا ہوتا کسی کھوہ میں!"

اور جب نازو چلا گیا تو آشی دیر تک سوچتی رہی کہ اگر نازو واقعی آج رات کہیں کسی اندھیری گپھا میں ٹھنڈ سے اکڑ کر مر جاتا تو کیا ہوتا! ——— کیا ہوتا ——— اور وہ اسی سوچ میں غرق اُٹھ کر دروازے تک آئی اور بہت دُور ایک موڑ پر چوڑی سفید چٹان کے پاس صبح صادق کے مٹیالے اُجالے میں اسے نازو کا سایہ نظر آیا۔ ——— اچانک اس کی نظروں میں ساری فضا سایوں سے بھر گئی اور اس نے محسوس

گیا کہ وہ خود بھی ایک سایہ ہے۔ ایک پرچھائیں۔ جو جہاں چاہے نکل جائے جدھر چاہے اُڑ جائے، چاہے زمین کے کنارے پر جاکر بیٹھ رہے یا نیچے میدانوں میں تارہ گاؤں کے قریب منڈلاتی پھرے۔ یا صبح کے موٹے تارے پر جاکر سو رہے ——— یا موڑ کے قریب نازو کے سائے میں گھل مل جائے ——— بلّی اس کی ٹانگوں سے نکل کر تیر کی طرح ایک چڑیا کے پیچھے بھاگی اور آشی نے اپنا سینہ ٹٹول کر سوچا کہ جیتے جی سایہ بن جانا تو بھوت پریت کا کام ہے ——— میں تو آشی ہوں ——— اور وہ نازو تھا۔ اور نازو سایہ نہیں، جیتا جاگتا جوان ہے، کبڈّی کا کھلاڑی ہے۔ اور میں آشی ہوں۔ ان پہاڑوں کی چرواہی ——— لیکن اس سوچ بچار کے باوجود اُسے سایوں کے خیال سے اُنس سا ہو گیا۔ اور اس روز وہ صنوبروں کے سایوں اور پہاڑوں کے سایوں اور بھیڑوں کے سایوں کو بہت دیر تک دیکھتی رہی۔ اور جب اس نے اپنا سایہ دیکھا۔ تو اس کے دل میں تمنّا پیدا ہوئی کہ اس کا سایہ اچانک وہاں سے اُڑ پڑے اور دور موڑ کے پاس چوڑی سفید چٹان کے قریب سے ہوتا ——— آشی کا دل دریا کی مچھلی کی طرح ایک بار اُچھل کر کسی نامعلوم گہرائی میں ڈوب گیا۔ سامنے سے نازو اپنے کاندھے پر کدال رکھے جھومتا جھامتا آرہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا سایہ بھی!

جب وہ آشی کے قریب سے گذرا تو کدال کو ایک پتھر پر ٹکا کر بولا "بھیڑیں چرا رہی ہو آشی؟"

"نہیں میں بھیڑیں چرا رہی ہوں ———" اس نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر اپنے کہے پر لجا کر بولی۔ یعنی ——— یعنی میں ——— میں بھیڑیں چرا رہی ہوں!"

نازو اور آشی کے دبے دبے قہقہے چٹانوں سے گھری ہوئی چراگاہ میں گھوم کر کہیں کھو گئے۔ اور دو ایک بھیڑیں گردنیں اُٹھا کر اور زبانیں لٹکا کر ممیائیں۔ اور ایک صنوبر

کی چوٹی پر سے ایک ممولا چرچر بولتا اُڑا اور چراگاہ سے اُڑتا ہوا موڑ کے پاس چوڑی سفید چٹان پر بیٹھ کر اپنی دم کو نچانے لگا۔ قریب ہی ایک جھاڑی سے ایک ممولن نکلی اور وہ ایک بار ممولے سے پرے گڑ کر پھُر سے پرے جا بیٹھی۔ اور پھر دونوں ایک ساتھ اُٹھے اور یہ دو کالی گیندیں فضا میں لڑھکتیں لمحہ بھر میں ساتے بن کر اُودے آسمان کی وسعتوں میں گھُل گئیں۔

"نخریلی ممولن!" نازو نے کدال کو پتھر پر گھمایا۔

"خوشامدی ممولا" آشی نے بالوں کی ایک لٹ کو کان کے پیچھے جمایا۔

"چیختی ہوئی پیلی والا ممولا!" نازو مسکرایا۔

اور آشی نے گلابی ہونٹوں کو سکیڑ کر سر جھکا لیا!

"اچھا اب میں جاتا ہوں" نازو نے کہا۔ اور آشی سے جواب نہ پا کر کاندھے پر کدال جمائی اور دو قدم آگے بڑھ کر بولا "جاؤں؟"

"جاؤ" آشی بولی۔

"بادل اُمڈے آرہے ہیں پورب سے۔" نازو طنز اًہنسا اور جب وہ چٹانوں کے درمیان ہوتے پھرتے رستے پر سے جھومتا گذر گیا۔ تو آشی دیر تک ان چٹانوں پر ہاتھ پھیرتی رہی جن پر نازو کا سایہ لہراتا ہوا نکل گیا تھا۔ اس نے ایک بار محسوس کیا کہ نازو کا سایہ اُس کے قابو میں آگیا ہے اور اس نے اُسے اپنے سینے سے بھینچ لیا ہے۔ اس کو اپنے اردگرد دو مضبوط گرم گرم باہیں بھی لپٹی ہوئی محسوس ہوئیں، اچانک ایک بھیڑ زور سے ممیائی اور آشی جی ہی جی میں پچھتائی واپس ہو پڑی کہ اس نے نازو کو جانے ہی کیوں دیا۔ یہاں بھلا چراگاہ میں کون تھا دیکھنے والا "جاؤ" کا لفظ خدا جانے اس کے لبوں سے کیوں ٹپک پڑا تھا۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد آشی اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ لفظ اُس نے نہیں کہا۔ اس کے سلئے نے کہا ہے اور سائے کی بات پر پچتا کر اپنا جی برا کرنا پرلے درجے

کا بچپنہ اور بھولپن ہے!

لیکن یہ دن کی مختصر اور ادھوری ملاقاتیں جلد ہی ختم ہو گئیں اور اب راتوں کی طویل اور مکمل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نازو نیچے جھیل کے کنارے تارہ گاؤں سے لوگ سونے لگتا ادھر آشی اپنے والدین کو سلا کر باہر آتی۔ موڑ کے پاس جھاڑی کی اوٹ میں چوڑی چٹان پر گرجتی خاموشیوں اور رشمراتی سرگوشیوں اور پیاسے بوسوں سے لدا پھندا وقت تھم کر بیٹھ جاتا۔ اور جب صبح کا ستارا اپنے پر پھڑ پھڑانے لگتا اور دھندلے اُفق پر پو پھٹنے لگتی تو نازو اور آشی جُدا ہو جاتے۔ اور سایوں کی طرح چٹانوں سے گھری ہوئی مہین پگڈنڈیوں پر سے گذرتے ایک دوسرے کی نظروں سے غائب ہو جاتے!

اور جب صنوبروں کے لمبے لمبے سائے پہاڑوں پر اور پہاڑوں کے لمبے لمبے سائے جھیل پر بچھ جاتے تو ان وادیوں کو آنے والے کیف بھرے حادثات کا انتظار قیامت خیز دھڑکنوں سے لبریز کر دیتا! سورج ڈوبتا تو اُنہیں اس شدت کا بخار چڑھتا کہ جیسے اُن کے وجود کی تپش سے کائنات جھلس جائے گی!

—— اور آج رات اِتنی کٹھن منزلوں سے گذر کر آشی نے پھر اُسی چٹان کا رُخ کیا جس کی سنگین سطح پر گذرے ہوئے رنگین لمحوں کی ایک سیج سی بچھی رہتی تھی۔ آشی آج وقت سے پہلے اس چٹان کے پاس پہنچی۔ اور اس پر دیر تک ہاتھ پھیرتی رہی۔ پیلا چاند دور مغربی پربت کی چوٹی پر ایک اُونچے صنوبر کی آخری پھننگ پر ٹھوڑی رکھے۔ جیسے سونے کی کوشش میں مصروف تھا اور ساری فضا دھندلے سایوں کا ایک ہجوم معلوم ہوتی تھی۔ اچانک آشی کے پاؤں کے تلوے دہک اُٹھے اور سینہ یوں پھڑکنے لگا۔ جیسے جھیل کی سطح پر اُبھرے ہوئے کنول کی پنکھڑیاں اِکّی دُکّی بوندوں سے تھرتھرا اُٹھتی ہیں! اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی —— لیکن ایکا ایکی وہ لپک کر چٹان کے قریب جھاڑی میں دبک گئی۔ اور ممولا اور ممولن پھڑ پھڑا کر مخالف سمتوں میں اُڑ گئے۔

آشی کو آج خلاف معمول دو کی بجائے چار قدموں کی چاپ سُنائی دی تھی ——"کوئی مسافر ہوں گے!" اُس نے سوچا۔ "اور میرا نازو انہیں کے پیچھے آرہا ہوگا۔ اسی لئے تو آج اتنی دیر تک یہ چٹان ویران پڑی ہے!"

موڑ پر دو سائے نمودار ہوئے اور چٹان کے قریب آکر رُک گئے!

ایک بولا۔ "ابھی تک نہیں آئی۔ ہم سویرے پہنچے ہیں۔ میں اسے جھونپڑے میں سے بُلائے لاتا ہوں۔ خدا کی قسم، بابو جی، آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں تو اپنے شہر کی کنواریوں کو بھول جائیں، بس یوں سمجھئے کہ آشی لڑکی نہیں، شراب کا ایک خواب اور گھونٹ ہے۔ اس شراب میں کوئی تلخی نہیں، اس کے قطرے قطرے میں مٹھاس کے چشمے رواں ہیں۔"

اور دوسرا سایہ بولا۔ "لیکن نازو۔ مجھ سے کترائے گی وہ۔"

نازو ہنس کر کہنے لگا۔ "وہ تو موم کا کھلونا ہے جی۔ وہ تو چینی کی گڑیا ہے، آپ اُٹھا لیں تو آپ کی۔ میں اُٹھا لوں تو میری۔ بہت ہی بھولی۔ بابو جی۔ بس اس کی مٹھی میں ایک روپیہ تھما دیجئے گا۔ وہ آپ سے یوں چمٹے گی کہ سُورج کی پہلی کرن ہی اُسے جُدا کر سکے گی۔ میں آپ کو کئی بار یقین دلا چکا ہوں کہ وہ پالتو کُتیا کی طرح میرے بس میں ہے نہ جانے کہاں رہ گئی۔ بس وہ آ ہی رہی ہوگی۔ آپ بھی ساری عمر یاد رکھیں گے کہ نازو نے دس روپے تو لئے لیکن جوانی کی شراب کا ایک ایسا گھونٹ پلایا کہ آپ کو لاہور کی ٹبّی میں ساری عمر بیٹھنے سے بھی نہ مل سکے۔ لیجئے بیٹھ جائیے یہاں چٹان پر!"

اور جب نازو آشی کے جھونپڑے کی طرف بڑھا اور بابو جی چٹان پر بیٹھ گئے تو آشی نے محسوس کیا کہ اس سنگین سطح پر گزرے ہوئے رنگین لمحے اچانک کملا گئے ہیں۔ اور —— اور —— اور یہ سایوں سے بھری ہوئی رات اپنے ہونٹ کچکچاتی اُسے نگلے جا رہی ہے۔

بجلی کی طرح کوئی احساس اُس کے رگ و پے میں لہرا گیا۔ اور جب نازو بیس تیس قدم دُور نکل گیا تو وہ جھاڑی کی اوٹ سے ہٹ کر بابوجی کے سامنے آگئی "میں آشی ہوں" وہ بولی "میں ہی آشی ہوں جس کے لئے آپ کا دوست آپ کو یہاں لے آیا۔ آپ اس کے واپس آنے سے پہلے ہی مجھے اپنا بنا لیجئے۔ میں اس کمبخت سے نفرت کرتی ہوں۔ کبھی ایک کوڑی تک اس نے میری ہتھیلی پر نہیں رکھی۔ مُوا کنگلا! آپ سوچ کیا رہے ہیں۔ آئیے۔ آئیے نا۔ مجھے چُوم لیجئے۔ مجھے اپنی گود میں ڈال لیجئے۔ مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیجئے۔ بابوجی۔ آشی آپ کی ہے۔ کیا آپ مجھے لاہور لے جائیں گے!"

اور جب دُور سے نازو کا سایہ واپس آتا نظر آیا تو آشی بابوجی سے الگ ہو گئی۔ اور موڑ کے پیچھے چھُپ گئی۔

نازو بابوجی کے قریب آیا تو مایوسانہ انداز میں بولا۔ "خدا جانے کدھر گئی کمبخت جھونپڑے میں بھی نہیں۔ اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر اس کا سایہ تک نظر نہیں آیا۔"

آشی موڑ کی اوٹ سے نکل کر نازو کے سامنے آگئی۔ چاند بھی صنوبر کی ڈالی کی اوٹ سے نکل آیا۔ اور کوسوں دُور کسی نگر پہ بجلی چمکی!

نازو دم بخود رہ گیا اور آشی بولی۔ "تم مجھے کہاں ڈھونڈتے پھرے۔ یہی چٹان تو میری دُنیا ہے۔ بالتو کُتیا اتنی گئی گذری نہیں ہوتی کہ اپنے مالک سے چھپ کر کہیں نکل جائے۔ میں نے تمہارے دوست کو انتظار کی تکلیف سے بچا لیا۔ میں نے ان کی تسلّی کر دی۔ اور تم —— میرے پیارے نازو —— میں تمہاری تسلّی بھی کر دوں!" —— اور اچانک آشی نے اپنے کپڑے ایک جھٹکے سے پھاڑ کر الگ پھینک دیئے۔ اور چیخ کر بولی "تمہیں میرا جسم چاہئے نا۔ لے دیکھ لے میرا جسم۔ یہ میری پنڈلیاں۔ یہ رانیں۔ یہ میرے کولھے۔ یہ رُخسار۔ یہ ہونٹ —— لے دیکھ لے۔ جی بھر کر دیکھ لے پھر تجھے کسی اور لڑکی

کو دیکھنے کی ہوس نہ رہے۔ لے —— گھور گھور کر دیکھا اور اپنی آنکھوں کو سینک کر آشی
بہت بھولی ہے —— پالتو کتیا کی طرح بھولی اور نادان ——!"

"آشی!" نازو پکارا۔ اور قبل اس کے کہ وہ اُسے چھو سکتا، آشی اندھیری گھاٹی میں کود گئی۔ لہراتے ہوئے بالوں اور پھیلی ہوئی باہوں والا ایک سایہ گھاٹی کی گہرائیوں کی طرف لپکا۔ دھب کی آواز کے ساتھ دو چار پتھر نیچے لڑھک کر ایک خاموش جھرنے میں جا گرے اور جھرنے کی سطح پر سویا ہوا چاند کا سایہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہت دیر تک تڑپتا رہا ◆

realy it is a good story.
I like it best and
hope all would like
to read and understand it
Your friend

A 9

(میرزا) ادیب

اِس وقت تاریخ پیدائش تو صحیح طور پہ یاد نہیں مگر یہ جانتا ہوں کہ مَیں نے دنیا میں آکر سب سے پہلا سانس اس وقت لیا جس وقت دنیا پہلی جنگِ عظیم کے آتشیں شعلوں میں گھِر چکی تھی۔ اپنے بچپن کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو صرف اِنہی دو واقعات کی یاد ذہن کی سطح پر رینگنے لگتی ہے۔ ایک واقعہ یہ ہے کہ میری دادی اماں اکثر رات کے ابتدائی حصّوں میں مجھے عجیب و غریب قصّے سُنایا کرتی تھیں۔ ان قصّوں میں عام طور پہ ایک ظالم کا کردار ہوتا تھا اور ایک مظلوم کا کردار۔ ظالم مظلوم کا سب کچھ لُوٹ لیتا تھا۔ یہاں پہنچ کر دادی اماں کہتی تھیں بقیہ کہانی کل سُناؤں گی یہ کہہ کر وہ تو سو جاتی تھیں مگر مجھے دیر تک نیند نہیں آتی تھی۔ قصّے کے تاثرات میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان سا برپا کر دیتے تھے مَیں سوچتا تھا دُنیا میں ظلم کیوں ہوتا ہے۔ ظالم کو کیا حق ہے کہ وہ دُوسروں پر ظلم کرے۔ اور مظلوم ظالم کا مقابلہ کیوں نہیں کرتا۔ ظالم کو شدید سزا کیوں نہیں دیتا۔ ان سوالوں کے ساتھ ایک اور سوال بھی میرے ذہن میں اُبھر آتا تھا۔ مَیں سوچتا تھا۔ جب خدا سب لوگوں کا خدا ہے تو وہ سارے لوگوں کو یکساں عزیز کیوں نہیں رکھتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ سوال مجھے اکثر بے چین

رکھتا تھا۔ مگر چونکہ میرے گھر والے اس قسم کے سوال سُن کر مجھ پر خفا ہُوا کرتے تھے۔ اِس لئے اپنی بے چینی کا اظہار کئے بغیر میں خود ہی سوچتا رہتا تھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچتا تھا کہ خدا ایک نہیں دو ہیں۔ ایک امیروں اور ظالموں کا خدا اور ایک غریبوں اور مظلوموں کا خُدا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب مجھے سکول میں داخل کرایا گیا۔ تو مَیں نے بہت بُرا منایا۔ مَیں اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آخر آبا جی کو کیا حق حاصل ہے کہ میری آزادی چھین لیں۔ مجھے سکول سے اور سکول کے ساتھ خاص طور پر اپنے لمبی داڑھی والے اُستاد جی سے سخت نفرت تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پرائمری کے اُستاد جی نے میرے دِل پر ایسا بُرا اثر ڈالا کہ مَیں آئندہ کسی ماسٹر سے مانوس نہیں ہو سکا۔ اب مَیں سمجھتا ہوں اس کی وجہ کیا تھی ہمارے یہاں کوئی بچہ عام حالات میں اپنے استادوں سے مانوس نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی طریقۂ تعلیم ایک بہت بڑی پابندی ہے۔ انسان کی فطرت آزاد ہے —— ہمارے بچے سکول سے کیوں بھاگتے ہیں۔ کیونکہ انہیں سکول کی چاردیواری ایک جیل خانہ نظر آتی ہے۔ خیر بچپن کی زندگی کے یہی دو واقعات مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ اور انہوں نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہُوا۔ وہاں ایک ہم جماعت میرا بہت گہرا دوست بن گیا۔ مَیں اکثر اس کے ساتھ اس کے گھر میں جایا کرتا تھا۔ اس کی آپا شاعرہ تھی۔ مَیں نے بھی شعر کہنا شروع کر دیئے۔ اس کی نفسیاتی وجہ یہ تھی۔ کہ شعر و شاعری کے سلسلے میں آپا سے گفتگو کا موقعہ ملتا رہتا تھا۔

میری افسانہ نویسی کا آغاز —— کوئی اہم واقعہ نہیں ہے مَیں اب یہ

بھول چکا ہوں۔ کہ میں نے سب سے پہلے کونسا افسانہ لکھا۔ غالباً بی۔اے کے زمانے میں اس کا آغاز ہوا۔

کالج کی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ کئی ادبی اور غیر ادبی رسائل و جرائد کے مدیرانہ فرائض انجام دیئے۔ مگر اس زندگی کا اتنا تلخ تجربہ ہوا کہ اب جب کسی رسالے کی ادارت کا سوال پیش ہوتا ہے اور میرے مہربان میرا نام لیتے ہیں تو میری روح کانپ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں ادب اہل قلم کو روٹی سے بے نیاز نہیں کر سکتا اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا ادب کچھ زیادہ ترقی نہیں کر سکا!

ابھی تک مَیں نے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ کچھ بھی نہیں سمجھا۔ مگر سمجھنے کی شدید خواہش دل میں ضرور موجود ہے۔ بہت کچھ سیکھنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔

اب تک یہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ "صحرانورد کے خطوط" "صحرانورد کے رومان" "دنیائے آرزو" "موت کا راگ" "غلاموں کی بغاوت" "آن داتا"۔

تعلیم: بی۔ اے (آنرز) اس وقت آل انڈیا ریڈیو لاہور کے شعبۂ موسیقی میں کام کر رہا ہوں۔

پرندے

گھر کے عین سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ جس کی ٹھنڈی اور فرحت بخش چھاؤں میں ننھا راجو کھٹولی پہ لیٹے اور اپنا ننھا مُنّا انگوٹھا مُنہ میں ڈالے ہر وقت فضائے لامحدود میں آزادانہ اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اکثر اس کی آنکھیں پرندوں کا تعاقب کرتے کرتے تھک جاتی تھیں۔ اور اکثر درد محسوس کر کے وہ اپنی آنکھوں کو بند بھی کر لیتا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ جس وقت وہ کسی پرندے کو بلندی پر اُڑتے ہوئے دیکھتا تھا۔ تو اس کے سینے میں ایک لذّت انگیز ——— ایک میٹھی میٹھی سی گدگدی ہونے لگتی تھی۔ اور وہ بے اختیار ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں زور زور سے ہلانے لگتا تھا۔

راجو کی ماں کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اس کا بیٹا پرندوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس لئے اُس نے درخت کی ایک شاخ سے مٹی کا ایک پیالہ لٹکا رکھا تھا جس میں پانی بھرا رہتا تھا۔ اور جس کے کناروں پر اکثر پرندے بیٹھ کر پانی پیتے رہتے تھے۔ جب کوئی پرندہ پانی پی کر پھر سے اُڑ جاتا تو راجو کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک چیخ سی نکل جاتی

راجو سے پہلے سوہن دیوی کے یہاں چار بچے پیدا ہوئے۔ مگر بدقسمتی سے چاروں کے چاروں کسی نہ کسی بھیانک مرض کا شکار ہو کر یکے بعد دیگرے ماں کی گود خالی کر گئے۔ اور اب راجو ہی اولاد کی بھوکی ماں کی تمام آرزوؤں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ماں کی طرح باپ بھی اپنے لختِ جگر کو دیکھ کر جیتا تھا۔ اور دونوں کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی۔ کہ اُن کا بچہ ہر وقت اُن کی نگاہوں کے سامنے موجود رہے —— مکند لال دفتر جاتے وقت بیوی سے کہہ جاتا تھا۔ "بچے کا خاص خیال رکھنا اور اسے کسی کے گھر میں لے کر نہ جانا۔ پرماتما کمینے لوگوں کی بُری نظر سے بچائے!" اور اس کے جواب میں سوہن دیوی بچے کے ننھے جسم کو اپنے سینے سے لگا کر اس طرح بھینچ لیتی تھی کہ بچہ حیران ہو کر ماں کے چہرے کو دیکھنے لگتا تھا۔

اسی طرح ماں باپ کی عزیز ترین تمناؤں کے گہوارے میں جھولتا ہوا راجو زندگی کی اُس منزل پر پہنچ گیا۔ جسے طفولیّت کی منزل کہتے ہیں —— اب بھی راجو بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ اور جب اس کی ماں اپنی مادرانہ شفقت سے لبریز آواز میں اُسے لوریاں سُنا سُنا کر سلانے کی کوشش کرتی تو وہ طرح طرح کے سوالات سے اُسے زچ کر دیتا۔ کبھی کہتا۔ "چندا ماموں رات کو کیوں نکلتا ہے۔ دِن کو کیوں نہیں نکلتا۔" کبھی پُوچھتا۔ "چڑیاں کوّے اُڑتے ہوئے کہاں چلے جاتے ہیں"۔ اور کبھی سوال کرتا۔ "پریاں کتنی دُور رہتی ہیں" —— اس کی ماں کے پاس ان تمام سوالات کا صرف ایک جواب تھا۔ اور وہ تھا "اب سو جاؤ بیٹا! رات کو دیر تک جاگتے رہو گے۔ تو صبح تمہاری آنکھوں میں درد ہونے لگے گا۔ سو رہو میرے لال! دیکھو تمہارے پتاجی سو گئے ہیں۔"

"تو ماتاجی! تو بتاتی کیوں نہیں۔ چندا ماموں ——"

مگر اس سے پہلے کہ راجو اپنا فقرہ دُہرائے۔ اس کے باپ کی غنودگی میں ڈوبی

ہوئی آواز سُنائی دیتی۔" سو رہو راجو! رات کے دس بج گئے ہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بیوی کو جھڑک کر کہتا۔" پاگل ہو گئی ہو تم۔ خواہ مخواہ اپنا اور اس کا سر کھپا رہی ہو!"

راجو باپ کی آواز سُن کر اور قدرے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ اور پھر کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھول کر نیم روشن و نیم تاریک فضا کو دیکھنے لگتا۔ بار بار اُس کے دماغ میں نئے نئے سوالات پیدا ہوتے اور جب تک وہ پُوری طرح سو نہ جاتا۔ یہ سوالات برابر اُس کے دماغ کے پردوں پر رینگتے رہتے۔

ایک بار بسنت کی رات کو اس کے باپ نے ایک کہانی سُنائی —— ایک پری کی کہانی جس نے دُنیا کے ہر مُلک کی سیر کی تھی۔ اور ہر جگہ پہنچ کر نئی نئی چیزیں دیکھی تھیں۔ اُس رات کو راجو کئی گھنٹے یہی سوچتا رہا۔ کہ پری نے کیا کیا چیزیں دیکھی ہوں گی۔ —— کوئی چیز بڑی چمکدار ہو گی۔ جس طرح سُورج یا چاند ہے۔ کوئی چیز بڑی اچھی ہو گی جس طرح پتاجی کی ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی۔ اور کوئی چیز بہت بڑی ہو گی۔ بالوجی کے مکان سے بھی بڑی! راجو کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔

"پتاجی! مَیں بھی ہر چیز دیکھوں گا۔"

مگر اس کا سوال باپ کے خراٹوں میں ڈوب گیا۔ راجو نے ارادہ کر لیا۔ کہ جب مَیں بڑا ہوں گا تو ضرور دنیا کے ہر شہر کی سیر کروں گا۔ اور وہ ساری چیزیں دیکھوں گا۔ جو پری دیکھ چکی ہے —— اس خیال کے آتے ہی راجو کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اور اس نے خواب میں دیکھا۔ کہ وہ ایک بڑے سے پرندے کی پشت پر بیٹھ کر بہت اُونچا پہنچ گیا ہے۔ ایک پری اس کے پاس سے گزر رہی ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ مگر پری مُسکرا کر نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔

راجو کی عمر سات برس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس لئے اُس کے پتاجی نے اُسے محلے کے پرائمری سکول میں داخل کر دیا۔ اُس دن راجو کو بڑی خوشی ہوئی۔ سکول میں اُس کے نئے نئے دوست بنے۔ اور ان نئے نئے دوستوں نے اُسے نئی نئی باتیں سُنائیں اور جب وہ گھر میں آیا۔ تو اس نے ماں کو وہ تمام باتیں سُنا دیں جو اُس کے دوستوں نے اُسے سُنائی تھیں۔

ایک روز اُس کے باپ نے انتہائی پریشانی کے عالم میں سُنا کہ راجو ابھی تک سکول سے واپس نہیں آیا۔ پہلی جماعت کے بچّوں کو گیارہ بجے چھٹی مل جاتی تھی۔ مگر اس وقت دو بج چکے تھے۔ اور راجو کا کوئی پتہ نہیں تھا۔

مکند لال دفتر سے آتے وقت ایک باغ میں سے گزر رہا تھا۔ کہ اُس نے راجو کو دیکھا۔ جو دو تین لڑکوں کے پاس بیٹھا بڑے شوق سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔

راجو کا باپ اُسے گھر لے آیا۔ ماں نے پوچھا۔ "راجو! تو چھٹی کے وقت گھر کیوں نہیں آیا۔ دوستوں کے ساتھ باغ میں کیوں چلا گیا تھا؟"

راجو نے جواب دیا۔ "پیارے لال کہتا تھا۔ میں پچھلے سال پتاجی کے ساتھ کشمیر گیا تھا۔ ماتاجی! وہاں اُس نے اُونچے اُونچے پہاڑ دیکھے تھے۔ ندیاں دیکھی تھیں جھیلیں دیکھی تھیں۔ اور ماتاجی کیا بتاؤں۔ اُس نے کیا کچھ دیکھا تھا۔ میں بھی کشمیر جاؤں گا۔" اور راجو فضا میں دیکھنے لگا۔ ایک کبوتر اُڑتا ہُوا بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ کہ عقاب نے اُس پر جھپٹا مارا اور اُسے پنجے میں دبا کر آناً فاناً غائب ہو گیا۔

"راجو! آئندہ گھر سے باہر نہ جایا کرو!"

راجو نے سہم کر باپ کی طرف دیکھا۔ اُس کا باپ غصّے کے عالم میں اُس پھول کو مسل رہا تھا۔ جسے راجو بڑے شوق سے ایک شاخ سے توڑ کر لایا تھا۔ راجو کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ باپ نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اور الماری میں سے مٹھائی نکال کر

interesting

اس کے مُنہ میں ڈالنے لگا۔

دوسرے دن راجو نے سکول جانے کے لئے انتہائی اصرار کیا۔ لیکن اس کا باپ تو ٹھان چکا تھا۔ کہ کسی حالت میں بھی اپنے پیارے بچے کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ کہیں اُس کے لختِ جگر کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

چار پانچ روز کے بعد ایک پنڈت اُسے گھر آکر پڑھانے لگا۔ جب شام کے وقت وہ گھر کی بوڑھی اور اپاہج لالٹین کی مفلوج روشنی میں اپنا آموختہ یاد کرنے کے لئے کتاب کھولتا تو اس کے ننھے سے سینے میں ایک کسک سی ہونے لگتی۔ وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگتا۔ اُس وقت اُس کا دل بے اختیار چاہتا۔ کہ وُہ پرندوں کی طرح فضا میں ہر طرف اُڑتا پھرے۔ تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے پرندوں کو دیکھ دیکھ کر اس کا دم گھٹنے لگتا۔ وہ واپس آکر اپنی چوکی پر بیٹھ جاتا۔ اس کا دل پنجرے میں گرفتار پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا۔ اور اس کی نگاہوں کو ٹیڑھے ترچھے بھیانک حروف کی زنجیریں جکڑ لیتیں۔

راجو کے گھر سے کچھ فاصلے پر رائے بہادر اوپندر ناتھ کا شاندار مکان کھڑا تھا۔ راجو اوپندر ناتھ کو بابوجی کہہ کر پکارتا تھا۔ بابوجی کے چار بیٹے تھے۔ جو شام کے پانچ بجے ایک چھوٹے سے میدان میں کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ راجو جب پہلے پہل ان سے ملا۔ تو انہوں نے اسے اپنے کھیل میں شریک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہہ دیا تمہارے کپڑے بڑے گندے ہیں۔ ان سے بدبُو آتی ہے۔

راجو کے دِل پر ایک چرکہ سا لگا۔ اُسے اپنے کپڑوں سے گھِن آنے لگی۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف جانے لگا۔ تمام راہ میں اس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں جیب میں پڑے ہوئے تانبے کے دو سکوں کے نمناک کناروں کو بار بار چھُوتی رہیں۔ مگر ایک بار بھی اُس کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا۔ کہ وہ یہ دو پیسے اِس لئے لایا تھا۔ کہ سادھو لال

کی دُکان سے کوئی میٹھا سا رنگترہ خرید کر کھائے۔

گھر پہنچ کر وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کہ اس کے بچے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے بہ رہے ہیں۔ ماں یہ منظر دیکھتے ہی بے تاب ہو گئی۔ اُس نے جلدی سے اپنے دوپٹے کے دامن سے بچے کے آنسو پونچھے۔ اور اس کی پیشانی پر بوسوں کی بارش کرتے ہوئے کہنے لگی:۔

"ہاں! مَیں مر جاؤں۔ کیا ہُوا میرے لال کو۔ کس نے مارا ہے۔ قربان کروں اُسے تجھ پر"

راجو نے اپنے نچلے ہونٹ اور ٹھوڑی کے درمیان جہاں پیار کرتے وقت اس کی ماں کے مُنہ سے ننھی سی تھوک اُڑ کر گر پڑی تھی۔ بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پھیری اور کہنے لگا:

"ماتا جی! میرے کپڑے میلے ہیں۔ ان سے بدبُو آتی ہے۔ مجھے تو نئے کپڑے کیوں نہیں پہناتی!"

"بس اِس لئے روتا ہے میرا لاڈلا!"

"انہوں نے کہا ہے۔ تیرے کپڑے میلے ہیں۔ ہم تجھے نہیں کھیلنے دیں گے۔"

اور راجو اپنی عادت کے مطابق نچلا ہونٹ لٹکا کر ناک کی رطوبت پیچھے کھینچتے ہوئے شُوں شُوں کی سی آواز پیدا کرنے لگا۔

"اچ ــــ چھا! مَیں تجھے ابھی نئے کپڑے پہناتی ہوں۔ دفع کر وہ انہیں۔ بڑے امیر آئے کہیں کے!"

دوسرے دن راجو میدان میں جا کر بابوجی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اب وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ اُسے نئے دوست مل گئے تھے۔ کھیلنے کے بعد جب وہ بابوجی کے گھر کے پیچھے جا کر بیٹھتا تھا۔ اور فضا میں آزادانہ اُڑتے ہوئے پرندوں کے دلکش نغمے سُنتا تھا۔ تو اس کے سینے میں اسی قسم کی گدگدی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ جیسے وہ

عالم شیر خوارگی میں محسوس کیا کرتا تھا۔

وہ کبھی اُدھر دیکھتا تھا کبھی اِدھر۔ کبھی اُفق کے دامن میں لہراتے ہوئے رنگین بادلوں پر نگاہیں گاڑ دیتا تھا اور کبھی دور درختوں کی قطاروں میں سے گزرتی ہوئی دریا کی سفید لکیر کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک پُراسرار مسرت سے چمکنے لگتی تھیں اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اُڑ کر اس وسیع دُنیا میں ہر جگہ پہنچ جائے۔ آسمان ستارے، چاند، دریا الغرض ہر چیز کے قریب پہنچ کر اُسے دیکھے۔ وہ اپنے دوستوں سے کہتا تھا۔ بڑے بڑے پرندے بچّوں کو اپنے پروں پر بٹھا کر بڑی دُور لے جاتے ہیں۔ ہمیں بھی کسی دن پرندے اُڑا کر لے جائیں گے۔ پھر ہم خوب سیر کریں گے۔"

اِس پر پانچوں بچّوں کے ذہن میں ان تمام پریوں کے قصّوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی جنہیں وہ کتابوں میں پڑھ چکے تھے۔ اور جن میں پرندوں نے یا پریوں نے بچّوں کو نئے نئے ملکوں کی سیر کرائی تھی۔

"مَیں ہر ملک کی سیر کروں گا ــــــ نئے نئے دوست بناؤں گا" راجہ خوش ہو کر کہتا تھا اور یہ خیال اس کے دماغ میں اس طرح لہریں لینے لگتا تھا جس طرح کسی شفاف چشمے میں چودھویں کے چاند کی سیمیں شعاعیں ناچ رہی ہوں۔

ایک دِن کسی بات پر راجو اور اس کے دوستوں کے درمیان جھگڑا پیدا ہو گیا۔ چاروں بھائیوں نے اسے مارا اور یہ کہدیا۔ کہ آئندہ ہمارے ساتھ مت کھیلا کرو۔

راجو گھر آگیا۔ اور جب اُس نے یہ واقعہ اپنے باپ کو سُنایا۔ تو باپ بولا۔

"بیٹا! اِن کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ امیر آدمیوں کے بچّے غریب آدمیوں کے بچّوں سے کھیلنا پسند نہیں کرتے۔ اور نہ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

راجو کھلے ہوئے مُنہ سے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو دیکھنے لگا۔

مکند لال کے لئے یہ باتیں کر کے بیٹے کو اس کے امیر دوستوں سے علیحدہ کرنا

ایک نہایت معمولی بات تھی۔ گویا اُس نے ایک حقیر پھُول کو مسل دیا ہو۔ مگر یہ باتیں سُن کر بچّے کے دِل کو کتنا صدمہ ہُوا۔ اس کا اندازہ صِرف بچے کا دِل ہی کر سکتا تھا۔

اب مُنہ ہاتھ دھو کر بیٹھ جاؤ۔ مَیں تمہارے لئے مٹھائی لا رہا ہوں!"

مکند لال یہ الفاظ کہہ کر اُٹھا۔ اور یہ خیال کر کے کہ بیٹا مٹھائی کا ذکر سُن کر بہت خوش ہوگیا ہے۔ تیزی کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہُوا گھر سے باہر نکل گیا۔

وہ تمام رات راجو نے بے چینی کے عالم میں گذار دی۔

باپ کے الفاظ بار بار اُس کے معصوم دماغ سے ٹکراتے تھے۔ مگر ابھی تک وہ یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ امیر بچّے غریب بچّوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں ——— وہ سوچنے لگا امیر بچّے غریب بچّوں سے اِس لئے نفرت کرتے ہیں۔ کہ غریب بچّوں کے کپڑے میلے ہوتے ہیں اور ان سے بدبُو آتی ہے۔ اُسے اپنے اِرد گرد ہر چیز میلی نظر آنے لگی۔ اُسے ہر چیز سے گھِن آنے لگی ——— بوڑھی اپاہج لالٹین۔ چھت کی کالی کالی کڑیاں۔ اور اس کا مَیلا کچیلا بستر اِس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب آنکھ کھولی تو اس کی نظر مَیلے کُرتے پر پڑی۔ اُس نے کُرتے کا دامن ناک سے لگایا۔ مٹّی کے تیل کی سی بُو اُس کے دماغ میں گھُس گئی۔ اُس نے جلدی سے کُرتہ اُتارا۔ اور اُسے لپیٹ کر تکیئے کے نیچے رکھ دیا۔ صبح ہُوئی۔ تو اس نے پنڈت جی سے سبق لیتے وقت پُوچھا۔

"امیر بچّے غریب بچّوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟"

اس پر پنڈت جی نے اپنی عینک کے اُوپر سے بچّے کے کملائے ہوئے اور متفکّر چہرے کو دیکھا۔ اور ہاتھ میں چھڑی گھُماتے ہوئے کہنے لگا۔

"نفرت ———؟ ہاں کرتے ہیں۔ پر تجھے کیا؟"

"کیوں؟" راجو چلّایا۔

پنڈت جی کی زردی مائل، مکروہ پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اور انہوں نے جواب

I do not like this book.

دینے کی بجائے کتاب کھول کر اپنے شاگرد کے سامنے رکھدی۔ راجو نے صفحے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ بھیانک حروف سوئیاں بن بن کر اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے۔ اُس نے کتاب کے صفحے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"ماتاجی کہتی ہیں۔ سارے لوگوں کو بھگوان دولت دیتا ہے۔ پھر——"

"اب سبق پڑھ۔ بچے اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

پنڈت جی نے ڈانٹ پلائی۔ بچہ سہم کر پڑھنے لگا۔ مگر رہ رہ کر اُس کے دِل میں خیال آتا تھا۔ کہ ایسا سوال پوچھ کر اُس نے کوئی قصور کیا ہے۔ اِسی لئے پنڈت جی نے کہا ہے۔ بچے اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اُس کے دماغ میں ایک کشمکش سی برپا ہو گئی۔ خود سوال کرتا۔ خود اُس کا جواب دیتا۔ یہاں تک کہ فضا میں ایک پرندے کی صدا گونجی۔ راجو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور نیم کے درخت کی ایک شاخ پر پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے کو دیکھنے لگا۔

دوسرے دِن جب وُہ بیدار ہوُا۔ تو اس کا بدن گرم تھا۔ ماں باپ دونوں پریشان ہو گئے۔ مکند لال بیوی سے کہنے لگا۔

"مَیں نے تجھے ایک بار نہیں کئی بار کہا تھا اِسے گھر سے باہر نہ جانے دیا کرو۔ ہر روز ٹیلے پر جا چڑھتا ہے۔ مگر تم سمجھتی ہی نہیں۔"

اب راجو صبح شام گھر کی چار دیواری میں پڑا رہتا تھا۔ اُس کا باپ ہر روز دفتر سے آتے ہوئے طرح طرح کی مٹھائیاں اور کھلونے خرید کر لے آتا تھا۔

ایک ماہ گزر گیا۔ مگر اس کی حالت میں کوئی افاقہ نہ ہوُا۔ بلکہ روز بروز اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔

ایک دن وہ درخت کے نیچے چارپائی پر لیٹا تھا کہ اسے پھڑپھڑ کی سی آواز سُنائی دی۔ اُس نے اُوپر دیکھا۔ درخت کی شاخ سے لٹکے ہوئے پیالے میں سے پانی

کی بوندیں اُڑ اُڑ کر گر رہی تھیں ـــــ کمزور ہونے کے باوجود اُس نے چارپائی کے اُوپر کرسی رکھی۔ اور کرسی پر چڑھ کر پیالے تک پہنچ گیا۔ پیالے کے اندر چڑیا کا بچہ پھڑپھڑا رہا تھا۔

اُس نے بچے کو پکڑ لیا اور نیچے اُتر آیا۔ اس وقت اس کے پاس کوئی نہ تھا۔ وہ بچے کی چونچ اپنے مُنہ سے لگا کر اسے حرارت پہنچاتا رہا۔

ماں جب گھر میں آئی۔ تو اس نے بہتیرا کہا ـــــ "بیٹا! اِسے چھوڑ دو۔" مگر راجو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ "ماتاجی! امیر چڑیوں کے بچے غریب چڑیوں کے بچوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ اِسے ماریں گے۔"

ماں نے حیران ہو کر کہا ـــــ "میرے لال! پرندے کھُلی ہوا میں خوش رہتے ہیں۔ اگر انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ تو بے چارے گھُٹ گھُٹ کر مر جائیں گے۔"

بچے نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

چار پانچ روز کے بعد راجو نے پرندے کو اُڑا دیا۔ پرندہ فضا میں اُڑتا ہُوا نظروں سے غائب ہو گیا ـــــ وسیع، لامحدود فضا میں آزادانہ اُڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھ کر ایک بار پھر راجو کے سینے میں ایک لذّت انگیز ـــــ ایک میٹھی میٹھی سی گُدگُدی ہونے لگی ـــــ یہاں تک کہ فضا میں ہر طرف اُڑتے ہوئے پرندے نیم کے درخت سے لٹکا ہُوا مٹی کا پیالہ ـــــ سب کچھ آہستہ آہستہ اندھیرے میں غائب ہونے لگا۔

(ڈاکٹر) اعظم کریوی

میرا نام انصار احمدؐ ہے۔ والدصاحب قبلہ کا اسم گرامی فیاض احمدؐ ہے۔ ۱۸۹۹ء میں اپنے وطن موضع کوری پرگنہ چائل ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوا۔ "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگانا میں کچھ اچھا نہیں سمجھتا ورنہ اپنے خاندانی بزرگوں کے تذکرہ سے کئی صفحات بھر دیتا۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ خدا کے فضل سے شہر در دیہ ایسے معزز خاندان کا ایک فرد ہوں۔ بچپن کھیل کود میں گذارا جس کی وجہ سے انٹرنس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خیریت یہی ہوئی کہ انگریزی اُردو کے ساتھ ہی فارسی ہندی اور کچھ کچھ بنگلہ۔ گجراتی اور سنسکرت سے بھی واقف ہوگیا۔ فی الحال مَیں ہیڈ کوارٹرز میرٹھ ڈسٹرکٹ کے وٹیزی برانچ کا سپرنٹنڈنٹ ہوں آگے کا حال خدا جانے۔

لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کا خبط ہوا۔ اعظم تخلص ہوا اور پھر جو خیالات کا دریا موجزن ہوا تو سینکڑوں اپنے خیال سے "لاجواب غزلیں" کہہ ڈالیں۔ درجنوں مشاعروں میں "فلک شگاف" "مستغنی از داد غزلیں پڑھیں۔ الٰہ آباد سے ایک اعلےٰ پیمانہ کا شعر و سخن کا گلدستہ "طوفان" زیر سرپرستی استاذی خدائے سخن حضرت نوح ناروی مدظلہٗ جاری کیا۔ غرضیکہ بزعم خود میں "شاعر اعظم"

بن چکا تھا۔ کہ اچانک میری زندگی نے ایک پلٹا کھایا۔ جب کچھ عرصہ کے بعد مشاعرہ نے ایک انقلابی رنگ اختیار کیا اور "تحت اللفظ" کے بجائے "ترنم" کی بانسری بجی تو بدقسمتی سے آواز کے ساتھ ہی میرے گلے نے ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ میری غزلیں خود میری نظروں میں پھیکی معلوم ہونے لگیں۔ اور اب نظم کے بجائے نثر کی طرف متوجہ ہؤا۔ اتفاق سے میرا پہلا افسانہ "پریم کی انگوٹھی" جو طوفان میں شائع ہؤا تھا بہت مقبول ہؤا۔ کئی اخبارات میں نقل کیا گیا اور ہندی اور گجراتی میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح سے مَیں خدا کے فضل سے شاعر سے افسانہ نگار بن گیا۔ اب تو میری شاعری کی یادگار صرف میرا تخلّص اعظمؔ ہی رہ گیا ہے۔ جو خدا کی شان سے میرے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

میرے ماموں احتشام الدین صاحب سہارنپور میں بسلسلہ ملازمت غالباً ۱۹۰۵ء میں مقیم تھے۔ وہیں سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہؤا ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۰ء میرٹھ میں اس کی نشو و نما ہوئی اور جب لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی کی یادگار میں رسالہ اکبر الٰہ آباد سے میرے اہتمام میں جاری ہؤا اور مَیں کچھ عرصہ کے بعد اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ تو میری ادبی زندگی نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں۔ مَیں اب کس منزل میں ہوں مجھے خود نہیں معلوم۔ اس کے متعلق نگار (حضرت نیاز فتحپوری) ہمارے افسانے (از سید وقار عظیم ایم۔ اے) ایشیا میرٹھ (حضرت ساغر نظامی) مختصر تاریخ ادب اردو (از پروفیسر سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے الٰہ آباد یونیورسٹی) و دیگر رسائل میں کافی لکھا جا چکا ہے۔ لہذا "ثنائے خود بخود گفتن ترا زیبد نمے صائب" کے خیال سے مَیں خود اپنے قلم سے اپنے

متعلق لکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔

اب تک "ہندی شاعری" (ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد) اور دیہاتی گیت (رسالہ عصمت دہلی) ہی کا مصنف ہوں۔ چڑھتی جوانی میں "پریم پتر" کے نام سے بھی چند رومانی خطوط کا ایک مجموعہ غالباً ۱۹۱۹ء میں میرٹھ سے شائع ہو چکا ہے۔ مگر خدا کے فضل سے اب وہ زمانہ جاہلیت کی یادگار ناپید ہے۔ سینکڑوں افسانے لکھ چکا ہوں مگر اب تک ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ملازمت کی وجہ سے میں خود شائع نہیں کرا سکتا تھا۔ سرمایہ دار پبلشروں نے صرف چند ٹکوں کے عوض میں میرے افسانوں کو خریدنا چاہا۔ اگر میں اس کے لئے راضی ہو جاتا۔ تو اب تک کئی مجموعے میرے افسانوں کے شائع ہو جاتے۔ لیکن خدا کا شکر ہے۔ کہ میں نے یہ ضرور پسند کیا کہ گمنام افسانہ نگار کی حیثیت سے اس دنیا سے کوچ کر جاؤں مگر سستے داموں اپنے افسانوں کو کبھی نہ فروخت کروں گا۔ چنانچہ میں اب تک اپنے اسی عہد پر قائم ہوں۔ اب حال ہی میں معقول معاوضہ پر میرے افسانوں کے دو مجموعے "شیخ و برہمن" اور "پریم کی چوڑیاں" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ مضمون طویل ہو گیا مگر ؎

لو بجھنے لگا دل کا کنول دیکھنے والو
اب ختم ہوا جاتا ہے افسانہ ہمارا (اعظم)

میرے لئے ۱۴ جون ۱۹۴۱ء کی منحوس تاریخ تھی کہ میرا لختِ جگر مہتاب احمد جس نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا اور امسال بی۔ اے

کا امتحان دینے والا تھا۔ میرٹھ سے تیرہ میل نہر گنگ میں نہاتے ہوئے اتفاقاً ڈوب کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ دوسروں کے سینکڑوں افسانے لکھے تھے۔ لیکن اب خود مجسّم افسانہ ہوں۔ آہ سیماب اکبر آبادی نے خوب کہا ہے ؎

کہانی ہے تو اتنی ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

good one

مایا

رانی پور کے زمیندار بسنت کمار کے باپ سرگباش ہو چکے تھے۔ اور اب بوڑھی ماں رادھا اور نوجوان بیوی پاروتی کے سوا ان کا اس دنیا میں اپنا کوئی نہ تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر چکے تھے اور قانون کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ رادھا جو پرانے خیال کی ماں تھی۔ اپنی بہو پاروتی کو بسنت سے ملنے کا بہت کم موقع دیتی تھی۔ جب کوئی پڑوس کی عورت رادھا سے اس کی وجہ پوچھتی تو وہ کہتی۔ ”دونوں ابھی ناسمجھ اور ناتجربہ کار ہیں۔ بیوی کے پھندے میں پھنس کر بسنت پڑھ لکھ نہیں سکتا ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے عیش و آرام کے لئے ساری زندگی پڑی ہے۔“ چنانچہ اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ رادھا اپنی بہو کو بڑی کوشش سے خانہ داری کا کام سکھا رہی تھی اور پاروتی کا سارا دن رسوئی بھنڈار خانہ اور ٹھاکر جی ہی کے گھر میں گزارتا تھا۔ رات کو بھی رادھا بہو کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ جیسے کوئی لاپرواہ ماں گنے کا رس خوب چوس چوس کر پیئے اور بچہ دور سے دیکھ کر للچائے وہی حال بسنت کا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی نوجوان بیوی کا رس گرہستی

کی چکی میں پس پس کر مٹی میں ملا جا رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ماں کے خلاف کوئی کام کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ مگر ضبط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے یہ سعادت مندی زیادہ دن تک نہ قائم رہ سکی آخر ایک دن وہ ماں سے باغی ہو گیا۔ پھاگن کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا۔ بسنت اپنی بیٹھک میں کچھ پڑھ رہا تھا یکبارگی اس کے کانوں میں آواز آئی۔

گتیاں بہ جائے ایسی ہوری اُن بن دیکھے جرت موری

گاؤں میں اس نے اکثر لوگوں کو پھگوا گاتے سُنا تھا مگر اس وقت دیہاتی لڑکیوں کے گیت "گتیاں بہ جائے ایسی ہوری" نے بسنت کے دل کو تڑپا دیا اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا لڑکیاں گیت میں اس کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔ پھر دوسری "ہولی" شروع ہوئی۔

ہوری آئی سجن ناہیں آئے دیکھو شیام ہمارے بدیسوا میں چھائے
رنگ کھیلیں سکھیاں اپنے پیا سنگ ہنس ہنس گرد لگائے
رہ رہ آوے یاد بلم کی عبیر گلال نہ بھائے۔ ہوری آئی سجن......

اب وہ اپنے دل کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ پیاسے کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا۔ لیکن اسے پینے کی اجازت نہ تھی۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ وہ پھاگن کے مہینہ میں بھی اپنی بیوی سے بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ ماں تو پُرانے خیال کی ہے لیکن وُہ تو تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر اپنے گھر میں داخل ہُوا۔ اس کی ماں سو رہی تھی۔ بسنت کی نگاہیں پاروتی کو تلاش کرنے لگیں وُہ رسوئی میں بیٹھی چاول چُن رہی تھی شوہر کو دیکھ کر اس نے گھونگھٹ کرنا چاہا لیکن بسنت نے اشارہ سے اس کو اپنی طرف بُلایا۔ اس نے سوچا "پاروتی کتنی گنوار ہے شوہر سے پردہ کرتی ہے" مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ ہمیشہ سے پردہ کرتی چلی آئی تھی۔ لیکن

آج سے پہلے بسنت نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کی تھی۔ پاروتی نے گھبرا کر ساس کی طرف دیکھا وہ سو رہی تھی —— "آج ان کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے کیوں بُلاتے ہیں۔۔۔۔۔ ماں جی کا بھی کچھ خیال نہیں۔۔۔۔۔ اگر مَیں ان کا حکم نہیں مانوں گی تو یہ ناراض ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ اور اگر ان کے پاس جاؤں اور ماں جی جاگ اُٹھیں تو۔۔۔۔" پاروتی کو سوچتے دیکھ کر بسنت سے خاموش نہ رہا گیا اُس نے کہا —— اجی سُنتی ہو یا نہیں مَیں کہتا ہوں ادھر آؤ۔۔۔۔۔ یہ کہتا ہوا بسنت چھت پر چلا گیا —— پاروتی سہمی ہوئی اُٹھی اور ساس کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دبے پاؤں بسنت کے پاس پہنچ گئی۔

"کھڑی کیوں ہو پلنگ پر بیٹھ جاؤ۔"

"جی۔"

"مَیں تو کہتا ہوں کہ پلنگ پر بیٹھ جاؤ اور تم "جی! جی! کی رٹ لگا رہی ہو۔"

"اگر ماں جی جاگ اُٹھیں اور انہوں نے مجھ کو یہاں دیکھ لیا تو بڑی بُری بات ہو گی۔"

"یعنی مجھ سے ملنا بُری بات ہے کیا خُوب؟ کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ ہو نہ آخر دیہاتن۔"

"لیکن اب تک نہیں ملے یہ کس کی بے وقوفی تھی۔ مَیں تو دیہاتن ہوں لیکن آپ کو شہر میں رہ کر بھی آج سے پہلے کبھی اس کا خیال نہیں آیا۔"

بات معقول تھی لیکن بسنت اپنی ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھے انہوں نے کہا۔

"خیر فضول بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سنو اور غور سے سُنو میں نے اب تک بہت ضبط کیا۔ لیکن اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا اب مَیں چاہتا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھو مجھ سے باتیں کرو۔ اور میرا دل بہلاؤ ——" اتنا کہہ کر بسنت نے پاروتی کا ہاتھ تھام کر پلنگ پر بٹھا لیا۔

گون ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔ کہ دن کے وقت پاروتی اپنے شوہر کے پاس بیٹھی ہو۔ شرم ولحاظ یا ساس کے ڈر سے وہ کانپنے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر بسنت نے پاروتی کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا...... ٹھیک اسی وقت رادھا جو جاگ اُٹھی تھی پاروتی کو تلاش کرتی ہوئی اُوپر پہنچی۔ کمرہ کا ایک دروازہ کچھ کھلا ہُوا تھا اس کے سامنے پہنچتے ہی رادھا اس طرح چونک اُٹھی جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو ——— دوپہر کی روشنی میں یہ نظارہ دیکھ کر نئی روشنی سے متنفر قدیم خیالات پر جان دینے والی ماں سناٹے میں آگئی اور چُپ چاپ اُلٹے پاؤں نیچے اُتر گئی ——— وہ دِل میں سوچ رہی تھی ——— "رام! رام! میری بھی ایک دن شادی ہوئی تھی۔ مگر میں نے تو ایسی بے شرمی سے کبھی کام نہیں لیا۔ کلجگ کا زمانہ ہے۔ جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔"

(۲)

ہوا اور آگ کا میل ہو گیا۔ ادب ولحاظ سب کچھ محبّت کی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ بیوی کی تربیت ہی بسنت کی زندگی کا اصلی مقصد ہو گیا۔ لوک لاج سے اس نے چشم پوشی اختیار کر لی۔ اب پاروتی دن رات بسنت کے کمرہ میں رہنے لگی۔ پاروتی یتیم تھی اس کے ماں باپ مر چکے تھے خیال تھا کہ سُسرال میں اُسے آرام ملے گا مگر یہاں آتے ہی رادھا نے اُسے گرہستی میں ایسا جکڑا کہ اُسے آرام ہی نہ ملا۔ اس کا حُسن و شباب مٹی میں ملنے والا تھا۔ مگر بسنت نے ٹھیک وقت پر سوکھے ہوئے کھیت کو محبّت کی آبیاری سے شاداب کر دیا اس کی ناز برداریوں سے پاروتی کے دِل کا باغ لہلہانے لگا۔

پاروتی حُسن کی دیوی تھی مگر وہ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ بسنت نے اس کو پڑھانا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو دیہاتی لڑکی پڑھنے سے گھبرائی۔ مگر پھر مجبوراً اس کو شوہر کا حکم ماننا پڑا۔

جب دیکھئے کمرہ میں بیٹھی ہوئی سر ہلا ہلا کر پڑھتی رہتی تھی اور ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے قانونی کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے تھے۔ بیچ بیچ میں ترچھی نظروں سے شاگرد کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ وہ جی لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ بسنت اپنی کتاب بند کر کے یکبارگی پکار اٹھتے ـــــ "پاروتی!" پاروتی چونک اٹھتی اور گھبرا کر بسنت کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس وقت اس کی ہرنی سی نشیلی آنکھیں ایسی پیاری معلوم ہوتیں کہ بسنت بیتاب ہو جاتا اور کہتا ـــــ "اچھا اب اپنی کتاب میرے پاس لاؤ دیکھوں تو سہی تم کیا پڑھتی ہو؟" پاروتی گھبرا جاتی کہ کہیں ماسٹر صاحب امتحان نہ لینے لگیں۔ کیونکہ امتحان میں پاس ہونے کی اسے بہت کم امید ہوا کرتی تھی۔ بہت کوشش کرنے پر بھی اس کا جی پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ وہ سبق پڑھ کر جتنا یاد کرنے کی کوشش کرتی۔ اتنا ہی کالے کالے حروف چیونٹیوں کی قطار کی طرح آنکھوں کے سامنے سے نکلتے جاتے تھے۔

ماسٹر صاحب کے بلانے پر پاروتی ملزم کی طرح ڈرتے ڈرتے کتاب لے کر جاتی۔ بسنت اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں اس طرح سے ڈال دیتا کہ وہ بھاگ نہ سکے اور دوسرے ہاتھ میں کتاب لے کر کہتا ـــــ اچھا بتاؤ آج کتنا پڑھا ہے۔" پاروتی جتنی سطروں پر اس کی نظر پڑتی انگلی سے بتا دیتی۔ بسنت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا "اوہو! بہت پڑھ ڈالا، مجھ کو دیکھو میں تو کچھ بھی نہیں پڑھ سکا۔"

بھولی بھالی پاروتی حیرت زدہ ہو کر کہتی۔ "تو اتنی دیر تک آپ کیا کرتے رہے؟"

بسنت اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا۔ "میں ایک بیدرد۔ سنگدل دیوی کا درشن کر رہا تھا۔ اور وہ میری طرف دیکھتی بھی نہ تھی ـــــ"

پاروتی اس کا جواب دے سکتی تھی۔ مگر لاج کے مارے ہوئے اور پریم کے دباؤ سے وہ اپنی ہار مان لیتی تھی۔

کسی کسی دن بسنت کہیں باہر جاتا تو موقع پاکر پاروتی پڑھنے میں لگ جاتی اتنے میں بسنت نہ معلوم کہاں سے دبے پاؤں آکر پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیتا اور کہتا ——"اچھا بتاؤ! میں کون ہوں؟" اس پر پاروتی اپنی آنکھوں سے بسنت کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتی ہوئی کہتی ——"واہ جی واہ! میں جان گئی بس اب آنکھیں کھول دو۔ آپ میرے پرمیشور ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟" اس پر بھی بسنت ہاتھ نہ ہٹاتا تو پاروتی اس کے ہاتھوں میں چٹکیاں لینے لگتی اور کوشش کر کے یکبارگی کھڑی ہو جاتی۔ اس طرح سے اس کی آنکھیں تو کھل جاتیں۔ لیکن اس کے دونوں ہاتھ بسنت تھام لیتا۔ اس "جنگ عظیم" میں پاروتی کے رخسارے بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتے کتاب دور گر جاتی اور ساڑی کا پلہ سر سے کھسک کر کندھے پر اور پھر وہاں سے سینہ پر سے گذر کر پاؤں پر گر پڑتا۔ اپنی اس بے بسی پر پاروتی کو غصہ آجاتا اور وہ رو پڑتی —— بس جنگ عظیم فوراً ختم ہو کر صلح کی کارروائی شروع ہو جاتی۔

پاروتی کے پڑھنے کے وقت جب بسنت اس کو بہت پریشان کرتا تو وہ کتاب بند کر کے کہتی ——"تو کیا آپ مجھے جاہل رکھنا چاہتے ہیں؟"

"تو تمہاری کرپا سے میں ہی کون پنڈت ہوا جاتا ہوں۔"

یہ سن کر پاروتی اٹھ کر چلنے کے لئے تیار ہو جاتی اور کہتی ——"اچھا اب میں سمجھ گئی میری وجہ سے آپ کے پڑھنے میں حرج ہوتا ہے۔ اب میں یہاں نہ بیٹھوں گی لو جاتی ہوں ——"

بسنت اس کا ہاتھ تھام کر پھر بٹھا لیتا اور کہتا ——"اس کا حال تم کیا جانو مجھ کو چھیڑ کر تم باآسانی پڑھنے لگتی ہو مگر تم کو چھیڑ کر پڑھنا میرے لئے آسان نہیں ہے۔"

اچھا جب آپ یہاں نہ رہا کریں گے تو میں پڑھا کروں گی۔"

"یہ تو میں ہرگز پسند نہ کروں گا۔"

"کیوں ۔"

"اس لئے کہ تمہارا جی پڑھنے میں لگ جائیگا تو پھر تم مجھے بھول جایا کرو گی۔"

"واہ! واہ! کیا بات بنائی ہے۔"

اسی قسم کی نوک جھونک دونوں میں ہوتی رہتی تھی اس کے بعد کنوار کی ہلکی بارش کی طرح رونا دھونا شروع ہو جاتا جیسے دھوپ میں کبھی کبھی ترشح ہو کر یکایک بند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح پاروتی کا بھی حال تھا۔ روتی بھی تھی اور ہنستی بھی تھی۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہونا چاہئے وہی ہوا نہ تو بسنت ہی وکالت پاس کر سکا اور نہ پاروتی ہی اپنی پہلی کتاب ختم کر سکی ؎

(۳)

پاروتی اور بسنت تو پریم لیلا میں پھنسے تھے اور رادھا گرہستی کے کاموں میں پسی جا رہی تھی اس کو کسی وقت آرام نہ ملتا تھا۔ اگر پاروتی کوئی کام کرنے کے لئے تیار بھی ہوتی تو رادھا کہتی ـــــ "رہنے دو بہو رانی! تم کیوں تکلیف اٹھاتی ہو۔ بسنت دیکھ لے گا۔ تو خفا ہوگا۔ جاؤ جاؤ آرام کرو پڑھ لکھ کر پنڈتائن بن جاؤ۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ بڈھی ہوں تو کیا میں اب بھی گرہستی کا کام تم ایسی نازک بدن لڑکیوں سے زیادہ اچھی طرح سے کر سکتی ہوں۔ جیتے جی بھگوان مجھ کو تمہارا محتاج نہ بنائے ـــــ" یہ الفاظ پاروتی کے دل پر تیر کی طرح سے لگتے۔ ان الفاظ میں کتنا زہر بھرا تھا یہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ لیکن سمجھ کر بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ رادھا کی خواہش تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاروتی اس کے اشارے پر چلے مگر اب یہ محال تھا۔ پاروتی اپنے شوہر کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اب جبکہ وہ بڑی آزادی سے اپنے شوہر کی محبت کا لطف اٹھا رہی تھی وہ ساس کی خوشامد کیوں کرتی۔ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ لیکن ہڈیوں کا ڈھانچہ کہاں تک کام

دیتا بوڑھی اور کمزور رادھا محنت رنج و غم اور جلن سے بیمار پڑ گئی شروع میں معمولی زکام ہوا اور پھر اسی نے رفتہ رفتہ مہلک بیماری کی صورت اختیار کر لی اور رادھا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پرلوک سدھاری۔ پاروتی اور بسنت کو بہت صدمہ ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ سب رنج و غم دُور ہو گیا اور پھر دونوں محبت کے گہوارے میں جھولنے لگے۔ مگر اب یہ دقت پیش آئی۔ کہ گرہستی کا کام کیسے چلے۔ پاروتی آرام طلب ہو چکی تھی۔ چوکا برتن تو کہارن کر دیتی تھی۔ لیکن پاروتی کو کھانا پکانا پڑتا تھا۔ کچھ دن تک تو اس نے کسی نہ کسی طرح کام چلایا۔ لیکن پھر بیمار پڑ گئی۔ اب بسنت گھبرا گئے ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ کہ کام کیسے چلے۔ پاروتی کے میکے "بسیڑھی" میں اس کی ایک چچیری بال ودھوا بہن مایا جو اس سے دو چار سال بڑی تھی رہتی تھی۔ بسیڑھی ایک ویران مقام پر چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اسی گاؤں میں مایا ناامیدی کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اس بیل کی طرح جس کی جڑ پہلے ہی سے کٹی ہوئی ہو اپنے باپ کے ساتھ دن کاٹ رہی تھی۔ ماں لڑکپن ہی میں مر چکی تھی۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو یاد کیا اور بسنت سے کہا۔ "اگر کہو تو مایا کو میں یہاں بلا لوں۔ بڑی نیک لڑکی ہے۔ اس سے مجھ کو بڑی مدد مل جائے گی۔"

بسنت۔ "بھلا تمہارے چچا اس کو یہاں آنے کی کیوں اجازت دیں گے۔"

پاروتی۔ "میری بیماری کا حال سن کر وہ مایا کو ضرور بھیج دیں گے۔ مایا میری سہیلی ہے اس کے آنے سے میری طبیعت بھی بہل جائے گی۔"

بسنت نے دوسرے ہی دن مایا کو بلوا بھیجا اور وہ رانی پور آ گئی۔ شام کا وقت تھا جب مایا بہلی سے اتر کر پاروتی کے گھر میں داخل ہوئی اس وقت بسنت کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پاروتی پلنگ پر پڑی تھی مایا کو دیکھتے ہی وہ خوش ہو کر اٹھ بیٹھی۔ "آؤ جیجی! اچھی تو رہیں تم نے تو کبھی بھول کر بھی میری خبر نہ لی۔"

مایا۔ بس رہنے دے باتیں نہ بنا۔ یہ تو کہتی نہیں کہ سسرال ہیں آگرہم غریبوں کو بھول گئی الٹا مجھے الزام دیتی ہے۔ خیر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ یہ تو بتا کہ تیرا کیا حال ہو گیا۔ جیجا سے اچھی طرح تو بنتی ہے نا؟"

پاروتی نے مسکرا کر کہا "ہاں خوب۔ پرماتما کا ہزار ہزار شکر ہے۔" وہ "مجھ پر بہت مہربان ہیں مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔ رہ گئی میری بیماری تو سچی بات یہ ہے کہ ساس جی ہی گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد سے گرہستی کا کام مجھ کو سنبھالنا پڑا۔ کام کرنے کی عادت نہ تھی اس وجہ سے بیمار پڑ گئی جیجی! میں نے اسی وجہ سے تم کو تکلیف دی ہے۔ کہ تم میرا گھر سنبھال لو مجھ اکیلی جان سے گرہستی کا کام نہیں سنبھل سکتا اب تم کو یہاں سے کبھی نہ جانے دوں گی ——— مگر جیجی! ایک بات کہتی ہوں دیکھو برا نہ ماننا تم میری بہن ہو اور میں نے تم کو اسی رشتہ سے بلایا ہے۔ کہیں کچھ اور خیال نہ کرنا۔"

مایا نے منہ بنا کر کہا ——— واہ ری پگلی! بھلا اس میں کوئی برا ماننے کی بات ہے۔ کسی غیر کا تو کام ہے نہیں یہ تو اپنا کام ہے۔ دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ بسنت آ گئے۔ مایا نے اس سے پہلے بسنت کو نہ دیکھا تھا وہ خاموش ہو گئی۔"

پاروتی نے بسنت سے کہا ——— "یہ لو میری مایا جیجی آ گئیں۔ اب میری طبیعت اچھی ہو جائے گی۔"

بسنت نے مسکرا کر کہا۔ ضرور۔ کہو جیجی اچھی تو رہیں۔"

مایا نے کچھ شرما کر جواب دیا ——— "ہاں بھیا۔"

تعارف ہو جانے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ پاروتی اور بسنت تو اپنے کمرہ میں چلے گئے اور مایا کو ایک دوسرا کمرہ جو ان کے کمرہ سے کچھ دور تھا رہنے کو مل گیا۔ دن بھر کی تھکی مایا بہت جلد نندیا دیوی کی گود میں سو گئی ؟

(۴)

رات میں تو مایا کو گھر دیکھنے کا اچھی طرح سے موقع نہ ملا تھا صبح کو اس نے دیکھا کہ گھر بہت ردی حالت میں ہے۔ صحن میں کوڑا کرکٹ کا انبار لگا ہے۔ رسوئی گھر میں کوئی چیز سلیقہ سے نہیں رکھی ہوئی ہے۔ مایا نے سب سے پہلے گھر کی صفائی کی بسنت کے کمرہ کو صاف کیا اور پھر کھانا پکایا۔ اس دن بسنت نے کھانا کھایا تو بہت تعریف کی۔ پاروتی بھی بہن کی تعریف سن کر بہت خوش ہوئی۔ اب پھر آزاد ہو گئی اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ اس نے بھنڈار خانہ کی کنجی مایا کو دیتے ہوئے کہا ــــ "بس جیجی اب میں بے فکر ہو گئی اب تم میرا گھر سنبھال لوگی۔"

مایا نے کنجی واپس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں پاروتی! اس کو تم اپنے پاس ہی رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

پاروتی ــــ "بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ کنجی تم اپنے ہی پاس رکھو۔ کیا تم مجھ کو اپنی بہن نہیں سمجھتی ہو؟"

مجبوراً مایا نے کنجی لے لی۔ اب مایا ہی تمام گھر کا انتظام کرتی تھی اس نے تھوڑے ہی دنوں میں پاروتی کا گھر بنا دیا۔ وہی گھر جو پہلے گندگی کا مخزن تھا۔ اب رشک چمن بن گیا۔ پاروتی اور بسنت سوتے ہی رہتے۔ لیکن مایا علی الصبح اٹھ کر ان کے کمرہ کو صاف کر آتی۔ بسنت کی کتابیں جو ادھر ادھر بے ترتیبی سے پڑی رہتیں ان کو ٹھکانے سے رکھ آتی۔ مایا کی سلیقہ مندی نے آہستہ آہستہ بسنت کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھوڑے دن تک مایا بسنت سے بے تکلف نہ ہوئی ایک دن پاروتی نے مایا سے کہا۔ "جیجی! تم "ان" سے شرماتی کیوں ہو ان سے خوب کھل کر باتیں کیا کرو۔" مایا اس کے جواب میں مسکرا کر چپ ہو گئی اتفاق سے بسنت بھی اس موقع پر آ گئے اور انہوں نے بھی شکوہ کیا کہ مایا ان سے کیوں بات نہیں کرتی۔ اس دن سے مایا بسنت سے کچھ کچھ باتیں کرنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ بالکل بے تکلف ہو گئی۔ پہلے وہ اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی جہاں مایا اور بسنت ہنستے

بولنے بھتے روکنے سے بھی نہ ٹھیرتی تھی۔ مگر اب وہ ان کی ہنسی مذاق میں بھی حصہ لینے لگی۔ جب پاروتی کبھی بسنت کا مذاق اُڑاتی تو مایا بھی پاروتی کا ساتھ دیتی۔ میل جول اور بات چیت ہی سے کسی کی خوبی یا بُرائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بسنت کی نگاہوں میں مایا کی قدر و وقعت بڑھنے لگی اب اُسے مایا کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آنے لگی۔

مایا نے بائیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اس لحاظ سے وہ ایک شگفتہ پھول تھی لیکن ایسا پھول جو عموماً دوپہر کے وقت کھلتا ہے اور دھوپ سے مُرجھانے لگتا ہے۔ مایا کے خوشنما چہرہ پر ایک خاص قسم کی رونق ضرور تھی لیکن ایسی رونق جو عموماً دوپہر کے وقت پھولوں پر ہوتی ہے۔ جن پر صبح کی شبنم سے بنائے ہوئے پھولوں کی صباحت اور نسیم سحری کے پنکھا جھلے ہوئے تازگی کے آثار کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ مایا کی آنکھوں میں نشۂ شباب سے سُرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سہاگ کی لکیر نہ تھی کیونکہ وہ بیوہ تھی۔ اور ایسی بدنصیب بیوہ جس کا سہاگ لڑکپن ہی میں اُجڑ گیا تھا۔ اور اب وہ بیوگی کی آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے حسن وشباب پر خزاں نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔

عرصہ تک پانی نہ ملنے سے جس طرح پودا مُرجھانے لگتا ہے۔ لیکن پانی پاتے ہی وہ لہلہا اُٹھتا ہے۔ وہی حال مایا کا بھی ہؤا۔ جب اس پر پاروتی کی محبت اور بسنت کی عنایت کی بارش ہُوئی تو اس کا غنچۂ دل کھل اُٹھا اس کے چہرہ پر شگفتگی آگئی۔ گلاب کے پھول پر گرد جم گئی تھی ہوا کے ایک خوشگوار جھونکے نے وہ گرد اُڑا دی اور پھول نکھر کر خوبصورت معلوم ہونے لگا۔

برکھا رُت کی اندھیری رات تھی زمینداری کے کام سے بسنت کسی دوسرے گاؤں میں گیا ہؤا تھا۔ واپس ہونے میں اُسے بہت دیر ہو گئی۔ مایا کھانا پکا کر پاروتی کے کمرہ میں

بیٹھی ہوئی اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی۔ پاروتی نے کہا۔" رات زیادہ ہو گئی ہے۔ آسمان گھرا ہے۔ پانی برسنے والا ہے مگر" وہ" اب تک واپس نہیں آئے۔"

مایا۔" آتے ہی ہوں گے۔"

پاروتی۔" میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں تو اب سوتی ہوں وہ آئیں تو بھوجن پروس دینا۔ تکلیف تو ہو گی۔"

نہیں نہیں تکلیف کس بات کی اچھا تم آرام کرو" یہ کہہ کر مایا رسوئی گھر میں چلی گئی اور آرام طلب پاروتی تھوڑی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج میں بسنت گھر میں داخل ہوا۔ اب پانی بھی برسنے لگا تھا۔ مایا نے رسوئی سے نکل کر کہا۔" پارو (پاروتی) کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آپ کا انتظار کر کے سو گئی کہئے بھوجن پروس دوں۔"

اوہ ہو تو کیا تم اب تک میرے ہی انتظار میں بیٹھی ہو۔"

مایا کے رنگیلے رسیلے ہونٹ اس کا جواب دینے کے لئے پھڑک اُٹھے۔ لیکن وہ صرف" جی ہاں" کہہ سکی۔ اس وقت بجلی پھر چمکی۔ سفید دھوتی میں مایا کا چہرہ جگمگا اٹھا بسنت کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ بسنت نے سنبھل کر کہا۔ اچھا میں رسوئی گھر ہی میں آتا ہوں۔ وہیں بھوجن کروں گا کمرہ میں کھانا لانے کی ضرورت نہیں۔"

بسنت کپڑے بدلنے کے لئے اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اِس عرصہ میں مایا نے جلدی جلدی آگ جلا کر گرم گرم پوریاں تل ڈالیں۔ بسنت آیا تو اس نے آسن بچھا کر بھوجن پروسا اور بسنت کے سامنے رکھ دیا۔ آج خلاف معمول بسنت کو ہمیشہ سے زیادہ کھانے میں مزہ ملا۔ وہ سوچ رہا تھا۔" مایا! اُف مایا! کتنی ہنرمند سلیقہ شعار اور دلکش لڑکی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو جادو بھرا ہے۔" بسنت نے نظر اُٹھا کر مایا کی طرف دیکھا وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بسنت کی زبان سے بے خودی میں

نکل گیا ــــ "مایا!" مایا نے سر اُٹھایا بسنت اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں لڑ گئیں مایا کانپ اُٹھی۔ بسنت کا دل مچل اُٹھا۔ اس کی زبان سے نکل گیا۔ "آہ تم کتنا اچھا کھانا پکاتی ہو اور کھانے ہی کا کیا ذکر تمہاری تو ہر بات بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ جب تم خود اچھی ہو ــــ" مایا نے شرما کر سر جھکا لیا وہ پھر بسنت سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ کر سکی "اور کیوں نہ ہو جب تم خود ہی اچھی ہو ــــ" یہ صدا اس کے کانوں میں بار بار گونجنے لگی۔ آج تک کسی مرد نے اس سے ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ ایسی باتیں اس کے لئے معیوب تھیں ــــ مگر اس وقت مایا کا جی چاہتا تھا کہ بسنت برابر ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

کھانا کھانے کے بعد جب بسنت مُنہ ہاتھ دھو چکا تو مایا نے پان دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ بسنت نے اس کی اُنگلی کو دبا دیا۔ مایا کو ایسا معلوم ہُوا گویا بچھو نے ڈنگ مار دیا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور رسوئی گھر سے نکل کر اپنے کمرہ کی طرف بھاگی تمام صحن میں پانی بھرا تھا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وُہ دھڑام سے زمین پر گر پڑی بسنت نے جلدی سے دوڑ کر اسے اُٹھا لیا۔ مایا کی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی لٹیں بسنت کے رخساروں کا بوسہ لینے لگیں اس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مایا تڑپ کر بسنت کی آغوش سے جُدا ہو گئی۔ شرم و غیرت سے وُہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

بسنت نے کہا ــــ "کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔"

"نہیں" کہتی ہوئی مایا دوڑ کر اپنے کمرہ میں گھس گئی اور اندر سے زنجیر لگا دی۔ وہ تمام رات روتی رہی۔ غیرت شرم و لحاظ۔ ڈر رسوائی یا اپنی بے کسی پر، یہ معلوم نہیں ــــ ادھر بسنت کی بھی ساری رات بڑی بے چینی سے گذری "کیا مَیں نے کوئی پاپ کیا ہے؟ ــــ" "وہ گر پڑی تھی اس کو اُٹھانا کیا میرا فرض نہیں تھا" ــــ مگر کیا مَیں پاروتی کو دھوکا نہیں دے رہا ہوں ــــ کہیں مایا میری شکایت پاروتی سے نہ

کر دے ــــ اُف پھر تو میں مُنہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گا مگر او نہہ اشکایت بھی کر دے گی تو میرا کیا ہو گا ــــ" بسنت کی ساری رات اسی ادھیڑ بُن میں گزری۔

(۵)

اس کے بعد کئی دِن تک پھر بسنت کو مایا سے ملنے کا موقع نہ ملا۔ یا خود مایا ہی تنہائی میں بسنت کے پاس نہ گئی۔ بسنت کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ مایا نے پاروتی سے اُس کی شکایت نہیں کی تو وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ اور اب اس کی ہمت بڑھ گئی۔ لیکن جتنا وہ مایا کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا مایا اتنا ہی اس سے دُور بھاگتی۔ مگر یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ برسات میں ندی جب جوش پر آتی ہے تو اس کی تھاہ نہیں ملتی پھر بھی ملاح تھاہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح مایا بھی بسنت کے دل کی تھاہ لے رہی تھی۔ وہ عورت تھی اور ایسی عورت جس کا سہاگ اُجڑ چکا تھا۔ جو سماج کی ستائی ہوئی تھی جس نے محبت کا کبھی مزہ ہی نہ چکھا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے دِل میں محبت کے جذبات نہ تھے۔ یا اس کا دِل محبت سے خالی تھا وہ پریم کی پیاسی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ کوئی اس سے محبت کرے اور وہ بھی اس کے بدلے میں اپنی محبت پیش کرے۔ لیکن سماج کے ڈر سے اُسے اِس کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ وُہ اپنی خواہش کو دبائے ہوئے تھی۔ مگر جب سماج ہی نے اس کا موقع دیا۔ تو اس کے دِل سے محبت کا دریا پھُوٹ نکلا۔ اتفاق سے وہ ایسے گھر میں پہنچی۔ جہاں اس کو سماج کے ایک خوش مزاج مرد نے شرابِ محبت کا پیالہ پیش کیا وہ انکار نہ کر سکی۔ جس طرح راکھ میں دبی ہوئی چنگاری ذرا سا کریدنے سے چمک اُٹھتی ہے اسی طرح مایا کی محبت کی آگ بھی بھڑک اٹھی جس نے شرم و لحاظ اور خوف رسوائی کو جلا کر خاک کر دیا۔

بسنت کا عجیب حال تھا اب اس کو مایا کا لب و لہجہ اتنا دلکش اور سرور انگیز معلوم ہوتا کہ اُس پر ایک بے خودی سی طاری ہو جاتی۔ مایا کے ایک ایک لفظ میں بسنت

نے وہ اثر محسوس کیا کہ بھولی بھالی پاروتی کی پریم رس میں بھری باتیں اُسے پھیکی معلوم ہونے لگیں سچّے موتی کی آب و تاب کو جھوٹے موتی کی عارضی چمک نے ماند کر دیا۔ شرابی نشہ کے بعد درمیان ہی میں خمار آنے پر پھر شراب پینے کی خواہش کرتا ہے۔ تاکہ رنگ جمارہے مگر یہ نشہ پاروتی کہاں سے لائے۔ وہ مایا کے جال سے بے خبر تھی بسنت کی طرف سے اس کو اطمینان تھا اپنی بہن پر پورا بھروسہ تھا۔ عین اس خمار کی حالت میں جب مایا نے پرانی شراب نئے رنگین پیالہ میں بھر کر ایک عجیب ادا سے بسنت کو پیش کی تو وہ مدہوش ہوگیا۔ اس کا سر ساقی کے قدموں پر جھک گیا مگر بسنت کی مدہوشی نے مایا کے قدموں کو بھی ڈگمگا دیا۔ بہت کوشش کرنے پر بھی وہ سنبھل نہ سکی اور خود بھی نشہ میں چور ہوگئی۔

سردرت تھی صاف شفاف دن تھا آسمان نیلگوں تھا۔ دوپہر کے سناٹے میں پاروتی سو رہی تھی۔ مگر جوانی سے دیوانی مایا اپنی آرام گاہ میں فرشی تکیہ کے سہارے لیٹی ہوئی اپنے مستقبل کے متعلق کچھ سوچ رہی تھی۔ اس وقت اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ اُس کے سر پر کوئی کپڑا ابھی ہے یا نہیں۔ وہ ایک نیمہ آستین اور سفید دھوتی پہنے ہوئے تھی۔ دھوتی سر سے سرک کر کمر کے گرد لپٹ گئی تھی۔ اور نیمہ آستین بھی اپنا فرض اچھی طرح سے نہیں ادا کر رہی تھی۔ اتفاق سے بسنت کسی کام سے مایا کے کمرہ کی طرف نکل گیا سوانگ کو دیکھ کر متوالا پپیہا آپے میں رہے۔ یہ محال ہے۔ مایا کے پلنگ سے دو قدم کے فاصلے پر پہنچ کر بسنت ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ سب بناؤ اسی کو نڑپانے کے لئے کئے گئے ہیں۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا — "اُف مایا! اس وقت تم کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو" یہ کہتے ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مایا کو گلے لگانا چاہتا ہے۔ مایا گھبرا کر اُٹھی اور بسنت سے دور ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ خوف اور شرم سے اس کے چہرہ کا رنگ غروب ہونیوالے

آفتاب کی طرح سُرخ ہو گیا۔ اُس نے کمرہ سے باہر نکل جانے کے لئے قدم بڑھایا۔ مگر بسنت نے روکتے ہوئے کہا ـــ "مایا! ہاتھ جوڑتا ہوں ٹھیر جاؤ۔ صرف تھوڑی دیر کے لئے ٹھیر جاؤ۔" مایا کے قدموں میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی۔ بسنت کی محبّت آمیز آواز سُن کر پاؤں ہی نہیں بلکہ سارے جسم نے ایک مٹّی کے بنے ہوئے بُت کی سی شکل اختیار کر لی۔ بسنت نے جرأت کر کے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مایا کے کندھوں پر کانپتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دئے۔ بسنت کے چھُونے سے مایا کے دونوں گال سُرخ اور پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی اس کی تمام شوخی اور تیزی نہ جانے کہاں چلی گئی اور وہ منتر کے بس میں آئی ہوئی ناگن کی طرح سر جُھکائے خاموش کھڑی رہ گئی۔ بسنت نے مایا کے گلابی گالوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــ "کیا مجھ سے خفا ہو؟"

"نہیں ـــ"

"تو پھر مجھ سے کیوں دُور بھاگتی ہو۔ مجھ سے ہنس کر باتیں کیوں نہیں کرتی ہو۔"

"مجھ سے باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ مجھ کو میرے حال پر پڑا رہنے دیجئے ـــ اگر آپ کی یہ منشا ہے کہ میں اس گھر کو چھوڑ دوں تو اچھی بات ہے۔ مَیں کل سویرے ہی چلی جاؤں گی۔ اچھا بس اب آپ یہاں سے چلے جائیے ـــ"

"مَیں کیا کروں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں مایا!"

"ایسے دل کو نکال کر پھینک دیجئے جو پاپ ساگر کی طرف لئے جا رہا ہو" یہ کہہ کر مایا نے بسنت کے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیا اور کسی قدر ہٹ کر بولی ـــ "آپ کا کیا بگڑنے لگا آپ مرد ہیں مگر مَیں دُکھیا تو کہیں کی نہ رہوں گی، سماج میں کہیں مجھے جگہ نہ ملے گی۔"

"اونہہ! سماج کا کیا ذکر ـــ سماج کو مَیں ٹھیک کر لوں گا اس کو ہمارے تعلقات

کا پتہ ہی نہ چلنے پائے گا۔"

"جی ہاں پتہ نہ چلنے پائے گا۔ یہ خوب کہی! آپ کو باتیں بنانی خوب آتی ہیں مگر میرے حال پر کرپا کیجئے اور فوراً یہاں سے چلے جائیے کہیں پاروتی آ گئی تو میں منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی۔"

بسنت نے گویا کچھ سُنا ہی نہیں۔ اس نے مایا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تو اچھا صرف دو منٹ جی بھر کر اس چاند سے مکھڑے کو تو دیکھ لینے دو۔"

زور سے جھٹکا دے کر مایا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پاروتی کے کمرہ میں چلی گئی۔

(۶)

اب پاروتی کو بسنت گویا بھول گیا تھا۔ وہی پاروتی جس کو وہ کسی وقت آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا۔ وہی پاروتی جس کے لیے اس نے اپنی ماں کی بھی پروا نہ کی تھی۔ اب دن رات اپنے کمرہ میں پڑی رہتی تھی۔ بسنت کے دل کا حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ بسنت اب پاروتی سے بہت کم بولتا تھا کچھ عرصہ تک تو اس نے پاروتی کا لحاظ کیا۔ لیکن پھر اس نے اس کی کچھ پروا نہ کی اب اس کا زیادہ وقت مایا سے ہنسی مذاق میں گذرتا تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر مایا ہی کی تعریف رہتی تھی۔ وہی پاروتی جو کبھی مایا کی تعریف سُن کر خوش ہوا کرتی تھی وہی اب جلنے لگی۔ اب تو اُسے مایا کی صورت سے بھی نفرت ہو گئی۔ مرد کے دل کو کس طرح سے اپنے قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ مرد کس بات سے خوش ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔ بسنت اس کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے بڑی آسانی سے مل گیا تھا۔ اب اس کو مایا کے جال میں پھنسا دیکھ کر پاروتی تلملا اٹھی لیکن پھر بھی اس نے وہ طریقہ اختیار نہ کیا۔ جس سے مایا کا جال ٹوٹ جاتا۔ بلکہ اس کی ناتجربہ کاری نے اُسے غلط

راستہ پر ڈال دیا۔ بسنت کو سنبھالنے کی بجائے وہ مایا سے لڑنے کو تیار ہو گئی اب وہ اُٹھتے بیٹھتے مایا کو طعنہ دینے لگی۔ لیکن مایا نے کچھ بُرا نہ مانا۔ اس نے پاروتی کے طعنوں کو بڑی خندہ پیشانی سے سُنا اور خاموش رہی۔ پاروتی کی یہ حرکت بسنت کو بہت بُری معلوم ہوئی اور اس نے پاروتی کو بہت لعنت ملامت کی اور ضد میں آکر پاروتی سے ملنا جُلنا بالکل بند کر دیا۔ اب وہ ہر کام مایا ہی کے اشارے پر کرتا۔ مایا ہی کی خاطرداری و ناز برداری اس کی زندگی کا خاص مقصد ہو گیا۔ اب مایا ہی گھر کی ملکہ تھی۔ لیکن مایا ہمیشہ پاروتی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔ مگر اس کا نتیجہ اُلٹا ہی ہوتا تھا۔ ایک دن پاروتی نے مایا کو خوب گالیاں سُنائیں مایا جو اب تک خود کو سنبھالے ہوئے تھی گالیاں سُن کر اپنے غصّہ کو ضبط نہ کر سکی۔ اس نے کہا "زبان سنبھال کر بات کرو"

"مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔" پاروتی نے منہ بنا کر کہا۔

"کیسی؟"

"خود اپنے دل سے پوچھ لو۔"

"میں کچھ نہیں سمجھی"

"سمجھ کر بھی نہ سمجھو تو بھلا کوئی کیسے سمجھا سکتا ہے۔"

تو صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو دل میں رکھنے سے کیا فائدہ۔ میں تو تمہاری خدمت کرنے یہاں آئی تھی۔ اگر اب تم کو میری خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ تو مجھے بسیٹر ہی بھیج دو۔ ہر روز کے طعنے شکوے مجھ سے اب نہیں سُنے جاتے۔"

"میں نہ کہوں گی مگر دُنیا کی کون زبان بند کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ خدمت کے حِیلہ میں تم میرے پتی کو مجھ سے چھین لو گی۔ اگر مجھے یہ پہلے معلوم ہوتا تو میں تم کو ہرگز نہ بلاتی۔"

مایا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا ــــــ "پاروتی تمہارا خیال غلط ہے۔

پرماتما جانتا ہے کہ میرا دل اب تک پاک ہے۔ تمہارا سوامی تم کو مبارک رہے۔"
"جیجی! باتیں نہ بناؤ۔ میں تمہاری چال کو خوب سمجھتی ہوں پہلے تو مایا کے جال میں پھنسا دیا اور اب کہتی ہو کہ تمہارا سوامی تم کو مبارک رہے!"
مایا کی بھنویں تن گئیں اس نے تڑپ کر کہا ــــ "پاروتی! سچ کہتی ہو۔ عورتوں کی ذات ہی مایاونی ہوتی ہے۔ مجھ میں کیا مایا تھی یہ تو میں نہ جان سکی مگر تم نے جان لیا۔ اسی طرح تم میں کیا مایا ہے تم نہیں جان سکتیں۔ مگر میں واقف ہو گئی۔ مجھ میں مایا ضرور تھی۔ ورنہ ایسی نوبت کبھی نہ آتی میں نے کچھ جان کر اور کچھ نہ جان کر پھندا ڈالا ہے۔ مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں تم نے ہی مجھے اس کا موقع دیا ہے۔ ہماری جاتی کا دھرم ہی ایسا ہے۔ میں نے قسم بھی کھائی لیکن تم نے یقین نہ کیا اچھی بات ہے۔ اب ہوشیار ہو جاؤ میں اب بتا دوں گی کہ مجھ میں کیا مایا ہے ــــ"
اتنا کہہ کہ غرور غصہ اور نفرت کی شکست سے مایا رو پڑی وہ پاروتی سے اور کچھ نہ کہہ سکی جلدی سے اٹھی اور کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔ شہد کی مکھی جب ضد پر آتی ہے تو جو بھی اُس کے سامنے آئے اسے کاٹ کھاتی ہے اسی طرح غصے سے بھری ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی مایا بھی پاروتی کے گھر میں آگ لگانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اگر اسے سکھ نہیں ملا تو وہ بھی اس کی راہ میں کانٹا ثابت ہو گا جلا کر خاک سیاہ کر دے گی۔

(۷)

اس دن مایا دن بھر اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی۔ شام کے وقت بسنت نے جب مایا کو نہ دیکھا تو اس نے گھر کی کہارن سے دریافت کیا۔ اس نے پہلے تو چھپانا چاہا۔ لیکن جب بسنت نے بہت مجبور کیا تو کہا ــــ "وہ اپنی کوٹھڑی میں ہیں۔ ملکن سے کچھ بات ہو گئی ہے مگر کون بات ہوئی یہ مجھ کو نہیں معلوم رام جانیں۔"
بسنت کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے پاروتی سے جا کر غصہ میں پوچھا

"مایا کہاں ہے؟"

واہ ری مایا! مایا ہی سب کچھ ہے۔ میں کچھ نہیں، بہت دنوں کے بعد بات بھی کی تو وہی مایا کا ذکر۔ سچ ہے مرد کی ذات بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ یہ سوچ کر پاروتی کے دل پر چوٹ لگی اور اُس نے تڑپ کر جواب دیا میں کیا مایا کے پیچھے پھرا کرتی ہوں۔ تمہارے دل میں تو ہر وقت مایا بسی ہوتی ہے۔ اُسی دل سے پوچھ لو کہ مایا کہاں ہے۔"

غصہ کے مارے بسنت کا بُرا حال ہو گیا۔ سچی باتیں ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ مرد ہو کر وہ اپنی عورت سے شکست ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اُس نے بھی جل کر کہا۔

"مایا میرے دل میں ہے یا نہیں یہ تو پرماتما جانے۔ لیکن اتنا میں ضرور جانتا ہوں کہ تم مایا کے جلن میں جلی جا رہی ہو۔ اُس کی خوبیاں تمہاری آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مایا کا کسی بات میں مقابلہ نہیں کر سکتی ہو۔ اب اس ضد میں تو میں تم کو اور جلاؤں گا۔ دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکتی ہو۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ اس کے سوا اور کیا ہو گا؟ تم بے فائدہ مایا سے لڑا کرتی ہو اور آج بھی لڑی ہو یہ مجھے معلوم ہو گیا یاد رکھنا اس کا نتیجہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا ـــــ" اتنا کہہ کر بسنت مایا کے کمرہ میں پہنچا۔ پاروتی کی آنکھیں کھُل گئیں۔ نتیجہ کا خیال کر کے وہ کانپ اُٹھی۔ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ یہ اس نے نہ سوچا تھا اس وقت بسنت کی دھمکی سُن کر وہ پریشان ہو گئی اس کی آنکھوں میں سارا جہان تاریک معلوم ہونے لگا اس نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالا اور کچھ سوچ کر مایا کے کمرہ کی طرف چلی۔ فتح ہو گی یا شکست یہ سوچنے کا موقع نہ تھا مگر مایا کی یہ بات کہ "ہم عورتوں کی ذات ہی مایا وِنی ہوتی ہے۔" اُسے یاد آ گئی۔ پاروتی بھی عورت تھی اس میں بھی کوئی نہ کوئی مایا ہو گی۔ پاروتی بھی اپنی مایا کا امتحان دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ مایا کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا اور وہ پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھی۔ پاروتی دروازہ ہی پر چھپ کر کھڑی ہو گئی کہ بسنت اسے دیکھ نہ سکے۔ مایا نے

کروٹ لی بسنت نے کہا —— "مایا!"

محبت بھری آواز سُن کر پیار کا دریا لہریں مارنے لگا۔ وہ لہریں لطیف تھیں اُن سے دونوں میں محبت کا رس دوڑ گیا۔ مایا نے سر اٹھا کر بسنت کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر منہ چھپا لیا۔

بسنت نے عاجزانہ لہجہ میں کہا —— "مایا! سچ بتاؤ آخر کیا بات ہے۔ کیا تم کو پاروتی نے کچھ کہا ہے۔"

مایا نے کچھ جواب نہ دیا مگر وہ رو پڑی۔ بسنت نے بیتاب ہو کر کہا —— "مایا! مایا!! مت روؤ۔ ہاتھ جوڑتا ہوں مت روؤ۔ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا۔ میری ہی وجہ سے تم کو بے فائدہ باتیں سننی پڑتی ہیں لیکن اب آئندہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پاروتی بے وقوف ہے۔ نالائق ہے میں اب اس کو ایسا سبق دوں گا۔ کہ وہ عمر بھر یاد رکھے گی۔ تم کو رنج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لو بس اب اٹھو میں پاروتی کو اسی وقت گھر سے . . . ." اس سے زیادہ بسنت کو کہنے کا موقع نہ ملا۔ پاروتی یکایک کمرہ میں داخل ہوئی اور مایا کے قدموں پر گر کر رونے لگی وہ بڑی مشکل سے اتنا رک رک کر کہہ سکی —— "جیجی! مجھے معاف کر دو اب میں تمہارے دل کو کبھی نہ دکھاؤں گی . . . . مجھ سے غلطی ہوئی . . . . تم میری بڑی بہن ہو۔ میری رکھشا کرو۔"

مایا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ پتی ورتا پاروتی کے چہرہ پر دکھ کی جلتی ہوئی آگ دیکھ کر مایا کے دل میں ایک جھکنی پیدا ہوئی۔ رنج و غم کے تپتے ہوئے پانی میں نہائی ہوئی بھولی بھالی پاروتی نے پراچین زمانے کی دیویوں کی طرح اپنے من کو مار دیا۔ اب وہ معمولی عورت نہ تھی بلکہ ستی سادھوی عورتوں کی طرح ہو گئی تھی —— وہ ہار کر جیت گئی اور مایا جیت کر بھی ہار گئی۔ جب آگ بہت تیز ہوتی ہے تو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ پاروتی بچوں کی طرح سے بلک بلک کر رو رہی تھی۔ مایا نے اسے زور سے اپنے

کلیجہ سے لگالیا۔ مایا کا جال آناً فاناً ٹوٹ گیا۔ یہ مؤثر سین دیکھ کر پھر بسنت سے کمرہ میں نہ ٹھہرا گیا وہ دبے پاؤں باہر نکل گیا۔

(۸)

بھادوں کی اندھیری رات تھی۔ گھر کے سب لوگ سو رہے تھے مایا چپکے سے اُٹھی اور دبے پاؤں پاربتی کے کمرہ میں پہنچی وہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ بڑی مشکل سے اُس نے اپنے دل کو سنبھالا اور بھنڈار خانہ کی کُنجی پاربتی کے آنچل میں باندھ دی ایک مرتبہ حسرت بھری نظروں سے بسنت کی طرف دیکھا اور پھر وہاں سے نکل کر۔ دروازہ کھولا اور گھر سے باہر ہو گئی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غیر مانوس جگہ کی تاریکی میں صرف سیاہ رنگ کا پردہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ عجیب و غریب اسرار سے بھی بھرا رہتا ہے۔ اس کے اندر جتنی چمک نظر آتی ہے وہ ایک اجنبی اور غیر مفہوم زبان میں ہمکلام ہوتی ہے جسے نہ کوئی بولتا ہے نہ جانتا ہے۔ باغ کی گھنی پتیوں سے لدے ہوئے درختوں کی خاموشی اور چٹیل میدان کی ٹیڑھی ترچھی لکیروں نے بھادوں کی اندھیری رات میں دھندلی سی شکلیں اختیار کر کے مایا کو چاروں طرف سے گھیر لیا —— وہ بسنت کے یہاں بڑے آرام میں تھی۔ اچھے سے اچھا کھانا۔ اور عمدہ سے عمدہ کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ وہ بے فکر تھی۔ آزاد تھی لیکن اس کی قسمت میں عیش نہ لکھا تھا۔ پرائے مال پر اس کا کیا اختیار۔ مالک کے سوا کسی غیر کو باغ میں پھول توڑنے کی اجازت نہیں ہوتی جو غیروں کے باغ میں گھس کر رنگ برنگ کے خوشنما پھول کھلے دیکھ کر للچا اٹھتے ہیں یہ ان کی غلطی ہے۔ اسی قسم کی غلطی یا بھول مایا سے بھی ہوئی وہ بھی بسنت کے گھر کو اپنا گھر سمجھ بیٹھی۔ اسے گھر کی اصلی ملکہ کا خیال ہی نہ رہا۔ لیکن جب وہ اس بھید کو سمجھ گئی تو پھر اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ وہ بسنت کے گھر کو چھوڑ دے۔

چنانچہ یہی سب کچھ سوچ کر وہ اس تاریک رات میں بسنت کے گھر سے نکل پڑی۔ لیکن اب جائے کہاں؟ یہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ زمانے کی ستائی ہوئی اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورت کو کون پناہ دے سکتا ہے۔ اس وقت اس کو اپنے وطن کا ٹوٹا پھوٹا گھاس پھوس کا جھونپڑا یاد آیا ــــ گھر کے سامنے کا پرانا تالاب جس میں بکثرت کائی جمی ہوئی تھی ــــ وہ نیم کا پیڑ جس میں وہ جھولا جھولا کرتی تھی ــــ بوڑھے باپ کی شکل ــــ بچپن کی سہیلیاں ــــ سب یاد آگئیں۔ اپنی شادی کا سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا ــــ سہاگ اجڑنے کی منحوس ساعت یاد آگئی ــــ وہ ایک بے خودی کے عالم میں کسی نامعلوم مقام کی جانب قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی کہ یکبارگی بادل گرجا۔ بجلی چمکی اس کا سر چکرایا کسی چیز کی ٹھوکر لگی ــــ وہ بیہوش ہو کر زمین پر گری قلب کی حرکت بند ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے قید ہستی سے آزاد ہو گئی۔

تمام رات پانی برستا رہا۔ رات کی تاریکی ماں کے آنچل کی طرح مایا کے جسم کو ڈھانپے رہی صبح کو جب مایا کی لاش جنگل میں ملی تو تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ وہی بسنت جو کبھی مایا کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اب اس کو مایا کی کریا کرم کرنے میں بھی غیرت معلوم ہوئی۔ مگر اندر سے اس کا دل اس کو ملامت کر رہا تھا۔ سماج نے بھی مایا ہی کو قصوروار سمجھا کسی نے اصلیت معلوم کرنے کی کوشش نہ کی۔ سماج کی نظروں میں ایک بیکس بیوہ عورت کی ہستی وقعت ہی کیا رکھتی ہے۔ وہ تو ایک بیکار شے سمجھی جاتی ہے پھر کسی کو کیا ضرورت تھی کہ بیکس بیوہ کی موت پر دو آنسو بہائے یا ہمدردی کا اظہار کرے۔ بیوہ کا فنا ہو جانا ہی سماج کے ٹھیکیداروں کے لئے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک

۱۴ دسمبر ۱۹۱۰ء کو میں جالندھر میں پیدا ہوا۔ مجھے بچپن ہی سے ایسی مصیبتوں سے گزرنا پڑا کہ میں اوائل عمر ہی میں Introvert ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں میں نے کبھی کھیل کود میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھلا دیا ہو، کھیل کود کی بجائے میری دلچسپی قصے کہانیوں سے زیادہ رہی ہے۔ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے میں چند رکانتا سنتتی، مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن، پریم چند، سدرشن اور بنکم چندر کے کچھ ناول پڑھ چکا تھا اور کچھ نہ کچھ لکھتا بھی تھا۔ جب ۱۹۳۱ء میں میں نے جالندھر کے ڈی۔ اے۔ وی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی تو میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "نورتن" کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ اور میرے افسانے لاہور کے متعدد روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں میں چھپتے تھے۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد میں اپنے ہی سکول میں مدرس ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اس زندگی سے اکتا کر میں لاہور چلا گیا جہاں دو اڑھائی سال تک مختلف روزانہ اخباروں میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں میری کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "عورت کی فطرت" کے نام سے شائع ہوا۔ جس کا دیباچہ منشی پریم چند نے لکھا۔

۱۹۳۴ء میں اخباری زندگی کو چھوڑ کر میں قانون پڑھنے لگا اور ۱۹۳۶ء میں
مَیں نے فرسٹ ڈویژن میں قانون کی ڈگری لی بھی۔ لیکن اسی دسمبر میں طویل بیماری
کے بعد میری پہلی بیوی سورگ باش ہو گئی (لاء مَیں نے اسی کی وجہ سے کیا تھا)
اس کی موت کے بعد پریکٹس کا ارادہ چھوڑ کر میں طبعی رجحان کے مطابق اَدب
کی خدمت کرنے لگا ۱۹۳۹ء کے ستمبر میں مَیں پریت نگر چلا گیا، جہاں دو
سال "پریت لڑی" کے ہندی اُردو ایڈیشنوں کی ادارت کرتا رہا۔ اب ڈیڑھ
برس سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ہوں۔

پہلی بیوی کی بیماری اور موت دراصل میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ
ہے۔ اسی سانحہ نے مجھے وہ کچھ بنا دیا، جو مَیں ہوں۔ اس سے پہلے بھی اگرچہ میں
نے سو کے قریب افسانے لکھے تھے۔ اور بقول پریم چند اُن میں تاثیر بھی
تھی۔ لیکن ان میں وہ چیز نہ تھی۔ جنہیں تلخ حقیقت کہتے ہیں میرے اس
پہلے دور کے افسانوں کے کردار زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نہ ہو کر تصوّر
کی دنیا کے باسی تھے۔ اور اگرچہ ان کا وجود امکان کے باہر کی بات نہ تھی۔
لیکن حقیقی دُنیا میں جنم لینے کی بجائے میرے تصوّر ہی میں پیدا ہو کر پروان
چڑھتے تھے۔

بیوی کی طویل علالت لا کالج کی تعلیم (جس کا بار مجھ ہی پر تھا) اور
زندگی کی پہلی کشمکش کے دوران میں مجھے ان حقیقتوں اور تلخیوں سے دوچار
ہونا پڑا جنہوں نے جوانی کی سادہ لوحی اور رومان پسندی امرت میں بس
بھرنا شروع کر دیا۔ اور پہلی بار مَیں نے زندگی کو تصوّر کی آنکھوں سے
دیکھنے کی بجائے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنا سیکھا۔ "۳۴۲" اور
"ڈاچی" اسی دور کے افسانے ہیں۔

درحقیقت "ڈاچی" ہی سے میری رومانی اور اصلاحی کہانی زندگی کی حقیقی تلخی اور درد سے روشناس ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں نے اکثر کہانیوں میں نچلے متوسط درجے کی زندگی کے حقیقی خاکے پیش کئے۔ اس وقت تک میں معاشرتی زندگی کی اس عکاسی میں اس حد تک اُلجھا رہا کہ سماج کے سب سے تکلیف زدہ زخموں —— جماعتی تفاوت اور جنسی ناہمواری —— کی طرف میری توجہ نہیں گئی۔ لیکن پہلی بیوی کی موت کے بعد میری زندگی اتنی دلچسپ اور اُلجھنوں سے پُر رہی۔ کہ اگر میں صرف ان واقعات کو ہو بہو پیش کردوں تو کئی افسانے اور ناول بن جائیں۔ اس پانچ چھ برس کے عرصے میں میں جن حالات سے گذرا ان میں سماج کے کسی بھی زخم کا میری آنکھوں سے چھپا رہنا ناممکن تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں میں نے "کونپل" اور "قفس" دو افسانے لکھے۔ کونپل میں نہایت لطیف پیرائے میں جنسی ناہمواری کی طرف اشارہ کیا اور قفس میں "جماعتی تفاوت" کی طرف —— یہ دونوں افسانے میری کہانیوں میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں سے میری بیانیہ کہانی نفسی تجربے کی پُرپیچ راہ میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے بعد میرے افسانوں کی خصوصیت ابہام سے پاک اشارے۔ منظر کشی کا خلوص، طنز کا تیکھاپن، اور اظہار و بیان کی بیباکی اور توانائی رہی ہے۔ یہ دور "ابال" کے ساتھ اپنے کلائمکس پر پہنچتا ہے۔

اس عرصے میں میرے افسانوں کے دو مجموعے "ڈاچی" اور "کونپل" کے نام سے شائع ہوئے۔ میری رومانی کہانیوں کا مجموعہ "سپنے" اور ترقی پسند افسانوں کا مجموعہ "چٹان" کے نام سے زیر طبع ہے۔ زندگی میں نے بہت دیکھی ہے۔ بہت دیکھنی باقی ہے۔ بہت لکھا ہے۔ بہت

لِکھنا باقی ہے۔ اپنے افسانوں کے ارتقا کے متعلق جو رائے میں رکھتا ہوں۔ مَیں نے لِکھ دی ہے۔ ناقد جو رائے قائم کرے گا۔ اس سے مجھے غرض نہیں ۔

اُبال

جب دُودھ اُبل اُبل کر کوئلوں پر گرنے لگا اور شاں شاں کی آواز کے ساتھ ایک تیز سی بُو اُٹھی تو چندن نے بڑبڑا کر پتیلی کی طرف ہاتھ بڑھایا جو کوئلوں کی تپش سے سُرخ ہو رہی تھی۔ بے بسی کے انداز میں چندن نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی کپڑا پاس نہ تھا۔ اس نے چاہا۔ پانی کا چھینٹا ہی دے دے لیکن لوٹے کے پانی میں ابھی ابھی اس نے آٹے والے ہاتھ دھوئے تھے۔ دُودھ اُبل رہا تھا۔ اور جلی ہوئی جھاگ کی بُو کمرے میں پھیلنے لگی تھی۔ اندر اس کے مالک اور مالکن آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ بے بسی کے اس لمحے میں چندن کے بڑھے ہوئے ہاتھ اور آگے بڑھ گئے۔ اور لحظہ بھر میں تپتی جلتی پتیلی کھٹ سے فرش پر آ گئی۔ چندن کی اُنگلیوں کی پوریں جل گئیں۔ اُبلتا ہُوا دُودھ اس کے ہاتھوں پر گر گیا اور جلن کی وجہ سے اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک "سی" نِکل گئی۔

پتیلی کو کھٹ سے فرش پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا دُودھ فرش پر بھی گر گیا تھا۔ اسی آٹے کے پانی سے اس نے اُسے دھو ڈالا۔ اور اُنگلیوں کی جلن کو جیسے جھاڑ کر اتارتا ہُوا

وُہ غسل خانے کی طرف بھاگا۔
پانی کی دھار کے نیچے ہاتھ رکھے رکھے اس نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دِیا اور مُسکرایا جب
کبھی اس سے کوئی بے وقوفی سرزد ہو جاتی تھی۔ وہ اسی طرح سر ہلا ہلا کر ہونٹوں
کے باٹیں کونے میں مُسکرایا کرتا تھا۔ اور ہونٹ کٹے ہونے کے باعث اس کے دانت
دکھائی دینے لگتے تھے۔
بات یوں ہوئی کہ دُودھ کو انگیٹھی پہ رکھ کر وہ اپنے مالک اور مالکن کی باتیں
سُننے میں محو ہو گیا تھا۔ اگرچہ دن کافی چڑھ آیا تھا اور چندن نے دوپہر کے کھانے کے
لئے آٹا تک گوندھ لیا تھا۔ لیکن وہ دونوں ابھی بستر ہی میں تھے اور کچھ ہی دیر پہلے
اس کے مالک نے وہیں سے چندن کو چائے بنانے کا حکم دیا تھا۔
اس نے دودھ کی پتیلی کو انگیٹھی پہ رکھ دیا تھا۔ اور دروازے کی طرف کان لگائے
اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سُننے لگا تھا۔ جب سے اس کے مالک کی شادی ہوئی تھی۔
وُہ دیر سے اُٹھتا تھا۔ اس سے پہلے وہ علی الصّبح اُٹھنے کا عادی تھا۔ نُور کے تڑکے اُٹھ کر
وہ چندن کو اٹھاتا۔ مالش کرواتا۔ ورزش کرتا۔ بارہا سیر کو بھی جاتا۔ لیکن اب وُہ اپنی
اس نئی بیوی کے ساتھ دن چڑھے تک سویا رہتا۔ اور جب جاگتا تو وہیں لیٹے لیٹے
چندن کو چائے بنانے کا حکم دے کر باتوں میں مشغول ہو جاتا۔ میٹھی مدھبری باتیں۔
چندن کو ان باتوں میں رس آنے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہوتے
وہ بیٹھا انہیں سُننے کی کوشش کیا کرتا۔
آنچ کی تیزی کے باعث دودھ پتیلی میں بے طرح بَل کھا رہا تھا۔ اور چندن
اس طرف سے بے خبر ہمہ تن گوش اپنے مالک اور مالکن کی باتیں سُننے کی کوشش
میں مصروف تھا۔
"مَیں مجبور ہو جاتا ہوں تمہارے گال ہی ایسے ہیں۔"

"آپ کے ہاتھوں کا تو کوئی قصور نہیں۔"
"اتنے اچھے ہیں تمہارے گال کہ . . . . ."
"جلنے لگے ہیں آپ کی چپتوں سے۔"
"لو میں انہیں ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔"

اور چندن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نرم و نازک پھول ریشم کے فرش پر جا پڑا ہو۔ تصور ہی تصور میں اس نے دیکھا کہ اس کے مالک نے اپنے ہونٹ اپنی بیوی کے گالوں سے چپکا دیئے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ اس کے اعضاء تن گئے اور تصور ہی تصور میں اپنے مالک کی جگہ اس نے لے لی۔

ہاتھ دھو کر اس نے سر کو پھر جھٹکا دیا اور ہونٹوں کے بائیں کونے سے مسکراتا ہوا وہ اندر گودام میں گیا۔ اس نے ذرا سا سرسوں کا تیل لے کر اپنے ہاتھوں کی میلی سیاہ جلی ہوئی پشت پر اس جگہ لگایا۔ جہاں جلن ہو رہی تھی۔ پھر جا کر وہ باورچی خانے میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے چائے کی کیتلی انگیٹھی پر رکھ دی۔

لیکن ہاتھ جلانے اور اپنی اس محویت پر دوبارہ سر ہلا کر مسکرانے کے باوجود اس کے کان پھر کمرے کی طرف لگ گئے اور اس کا تصور اپنی تمام یکسوئی کے ساتھ اس کے سامعہ کی مدد پر کمربستہ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے پھر کئی تصویریں اُبھرنے اور مٹنے لگیں۔

* * *

"چندن!" اس کے آقا نے چیخ کر آواز دی۔ اور پھر کہا۔ "وہیں مر گیا کیا؟"

آقا کی آواز سُن کر وہ چونکا۔ جلد جلد چائے اور توس تیار کر کے اندر لے گیا۔ اس کی مالکن اور مالک حسب دستور بستر پہ پڑے تھے۔ وہ دونوں ہم آغوش تو نہ تھے۔ لیکن پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے لگے تکیئے کے سہارے لیٹے ہوئے

تھے۔ لحاف ان دونوں کے سینے تک تھا۔ اور مالک کا بازو ابھی تک مالکن کی گردن کے نیچے تھا۔

"اِدھر رکھ دو!"

چندن نے ٹرے تپائی پر رکھ دی۔

ایک نظر دیکھ کر مالک نے کہا "تمہیں ہو کیا گیا ہے، دُودھ کا جگ کہاں ہے؟"

"جی ابھی لایا۔" اور سر کو ایک بار جھٹکا دے کر ہونٹوں کے بائیں کونے سے مُسکراتا ہُوا وہ رسوئی کی طرف بھاگا۔

دوسرے لمحے اس نے دودھ کا برتن لا کر رکھ دیا لیکن اسے پھر گالیاں سُننا پڑیں۔ کیونکہ دوبارہ دیکھنے پر مالک کو معلوم ہُوا کہ چھلنی بھی نہیں ہے۔

چندن نے چھلنی لا کر رکھ دی اور لمحے بھر کے لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس کی دبی ہوئی نگاہ اپنی مالکن کے چہرے پر جا پڑی۔ خوبصورت لمبے گھنگھلے بالوں کی لٹیں اس کی گوری گلگلوں پیشانی پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہونٹ سوکھے ہونے کے باوجود گیلے گیلے تھے۔ مُسکراتی سی آنکھوں میں خمار کی باریک سی لکیر تھی۔ اور چہرے پر ہلکا سا اضمحلال چھایا ہُوا تھا۔ اس کے مالک نے بڑے پیار سے کہا "چائے بنا دو نا جان!"

لیکن "جان" نے روٹھتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

"میں کہتا ہوں چائے نہ ہو گی۔" اسے مناتے ہوئے مالک نے کہا۔

"مجھے نہیں پینی چائے۔" گال کو مسلتے ہوئے مالکن نے جواب دیا۔

گردن کے نیچے کا بازو اُٹھا اور مالکن اپنے مالک کی آغوش میں کھنچ گئی۔

"کیا کرتے ہو شرم نہیں آتی؟"

"چندن کا دِل دھک دھک کرنے لگا اور اس کے مالک کا قہقہہ کمرے میں

گونج اٹھا۔

"اٹھو نا، بنا دو نا چائے!" مالک نے بڑی ملائمت سے ہاتھ کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تمہارے گال ہی ایسے پیارے ہیں کہ خواہ مخواہ ان پر چپتیں لگانے کو جی چاہتا ہے۔"

تڑپ کر مالکن نے پھر کروٹ بدل لی۔

"چندن تم بناؤ چائے۔"

"شدت احساس سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چندن نے چائے کی پیالی بنائی۔ پیالی اُٹھا کر اپنی جان کو آغوش میں بھینچتے ہوئے۔ اس کے مالک نے پیالی اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

٭ ٭ ٭

یہ "جان" کا لفظ تھا یا اس کے مالک کا اس کے سامنے بیوی کو آغوش میں لینے کا طریقہ کہ جب دوپہر کو چندن کام کاج سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھڑی میں جا لیٹا تو اس کے سامنے زہرہ جان کی تصویر کھنچ گئی۔ اور اس نے اضطراری طور پر سرسوں کے تیل اور مٹی میں سنے ہوئے بے غلاف کے خستہ اور بوسیدہ تکیے کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

اچانک اُبل کر اُوپر آ جانے والے دودھ کی طرح نہ جانے زہرہ کی یہ تصویر کس طرح اس کے بچپن کے گہرے و بے غاروں سے نکل کر اس کے سامنے آگئی۔ وہی بوٹا سا قد۔ بھرا بھرا گداز جسم۔ بڑی بڑی چنچل آنکھیں۔ پان کی لالی سے رنگے ہوئے ہونٹ۔ بھرے کولہے۔ وہی سینے کا ابھار اور وہی مسکراہٹ جس کے منبع کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ کہ آیا پہلے اس کی آنکھوں میں شروع ہوتی ہے یا ہونٹوں پر۔

وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اور ماں باپ کے مر جانے کی وجہ سے اپنی موسی

کے پاس رہا کرتا تھا۔ اس کی یہ موسی ایک سیٹھ کے بچوں کی دایہ تھی۔ یہ سیٹھ چاوڑی بازار میں گراموفون اور دوسرے سازوں کی دوکان کرتا تھا۔ اسی دُکان کے ساتھ زہرہ کا چوبارہ تھا۔ اور سیٹھ کی دکان کے باجے آہستہ آہستہ چاندی کے سکے بن بن کر وہاں پہنچا کرتے تھے۔

چندن اپنے بڑے بھائی اور پنڈت جی کے بڑے لڑکے کے ساتھ کبھی کبھی زہرہ کے چوبارے پر چلا جاتا تھا۔

زہرہ پنڈت جی کے لڑکے کو پیار کرتی تھی۔ مٹھائی وغیرہ دیتی تھی۔ اور اس کا کچھ چوتھا حصہ ان دونوں بھائیوں کو بھی ملا کرتا تھا۔ کئی بار وہ دوسرے بچوں کے ساتھ چوبارے کے باہر آنگن میں کھیل رہا ہوتا اور سیٹھ جی زہرہ کے پاس جا بیٹھتے اسے آغوش میں لے لیتے یا اس کے زانوؤں پر سر رکھ کر لیٹ جاتے۔

اس کی یہ مالکن بھی تو زہرہ سے ملتی جلتی تھی۔ اسی جیسا بوٹا سا قد۔ اسی جیسے بھرے بھرے کولھے۔ امڈی ہوئی چھاتیاں۔ گول گول رس بھرے گال۔ بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں اور گیلے ہونٹ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس ایک لمحہ میں مالک کے پہلو میں اسے لیٹے ہوئے دیکھ کر ہی اُسے زہرہ کی یاد نہ آگئی تھی۔

تصور ہی تصور میں چندن زہرہ کے بالاخانے پر پہنچ کر سیٹھ کی طرح اس کے زانوؤں پر لیٹ گیا۔ اور زہرہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ . . . . . وہ بھول گیا کہ اس کے ٹخنوں تک میل چڑھی ہوئی ہے۔ خشکی کے باعث ٹانگوں کی جلد گھٹنوں تک پپڑی سی بن گئی ہے۔ اس کی نیلی نکر جو اس کے مالک نے مدت ہوئی دی تھی۔ میل سے کالی ہو گئی ہے۔ اس کی قمیص کئی جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ اس کے سانولے ماتھے پر چوٹ کا ایک نہایت بدنما داغ ہے۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹا ہوا ہے اور اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے کھڑے اور روکھے ہیں۔ وہ مست لیٹا رہا۔ اور زہرہ اس کے بالوں پر

ہاتھ پھیرتی رہی۔ وہیں اس کے زانوؤں پر لیٹے لیٹے اس نے کروٹ بدلی۔ اور پیار سے کہنا چاہا۔ "زہرہ کتنی اچھی ہو تم......" لیکن اس کی کمر میں کوئی سخت سی چیز چبھی۔ اور اسے معلوم ہوا کہ وہ ننگے فرش پہ لیٹا ہوا ہے۔ وہ چیز جس پہ اس کا سر رکھا ہے۔ زہرہ کا زانو نہیں بلکہ ایک بوسیدہ سڑا گلا تکیہ ہے۔

چندن نے سر کو جھٹکا دیا۔ لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ اُٹھ کر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں کے سامنے پچھلے کئی برس اڑتے ہوئے گزر گئے۔

سیٹھ جی تو اپنی سب جائداد چوباروں کے حسن کی نذر کر کے اپنے نانا کے گاؤں چلے گئے تھے جو وسط پنجاب میں کہیں اپنی سادگی۔ غلاظت اور ناخواندگی کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ چندن کی موسی الوہ چلی گئی تھی۔ اور چندن اس چھوٹی عمر میں ہی تین روپے ماہوار پر ان سیٹھ صاحب کے ایک دوست کے ہاں نوکر ہو گیا تھا۔

اس کے بعد اس کی زندگی اس کمبل کی طرح تھی جسے ایک جگہ سے رفو کیا جائے تو دوسری جگہ سے پھٹ جائے۔ دوسری جگہ سے سیا جائے تو تیسری جگہ سے چاک ہو جائے اپنے اس مالک کے ہاں پہنچ کر اس نے سکھ کا سانس لیا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ ایسا زندہ دل خوش مزاج اور کھلی طبیعت کا مالک گذشتہ بارہ سال کی نوکری میں اسے نہیں ملا۔ لیکن اس کے مالک کی یہی کھلی طبیعت اس کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے اپنی بیوی کو پیار کرنے میں ذرا بھی نہ جھکتا تھا۔ جیسے چندن کوئی آدمی نہ تھا مٹی کا لوندا تھا۔

چندن نے سوچا اس شادی سے پہلے وہ اطمینان سے رہتا تھا۔ یہ بے چینی سی۔ یہ گرمی سی۔ یہ اعضاء کا تناؤ سا۔ یہ شب بیداری سی۔ اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ پہلے وہ سوتا تھا تو اسے دین دنیا کا ہوش نہ رہتا تھا۔ لیکن جب سے اس کے مالک نے

شادی کی تھی اور اس کی یہ نئی مالکن آئی تھی۔ اس کی نیند اُڑ سی گئی تھی۔ اسے عجیب عجیب طرح کے خواب آتے تھے۔ رات اس نے کاسنی کو دیکھا تھا۔ کاسنی اس کے پہلے مالک کی لڑکی تھی۔ کچی ناشپاتیوں کی سی چھاتیاں تھیں۔ ٹخنوں سے اونچا لہنگا اور بنڈی پہنے وہ ننگے سر گھوما کرتی تھی۔ یہی لڑکی خواب میں اس کے ساتھ آلیٹی تھی۔ کیسے؟ کہاں؟ اسے کچھ یاد نہیں لیکن وہ جاگ اُٹھا تھا۔ اس کا جسم گرم تھا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ اسے پسینہ آ گیا تھا۔ پھر وہ سو نہ سکا تھا۔

کچھ بھی سمجھ میں نہ آنے سے اپنی بے وقوفی پر اس نے سر ہلایا۔ لیکن وہ مسکرایا نہیں۔ اس کا مالک دفتر گیا ہوا تھا۔ مالکن اندر کمرے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ اٹھا اور پڑوس میں رائے صاحب کے نوکر جیٹھو کی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

* * *

چیت کی پورنماشی کا چاند بڑ کے پیچھے سے آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ نو عمر کیکری کے پتے اس کی کرنوں کے لمس سے چمک اُٹھے تھے۔ چندن آہستہ آہستہ اپنی کوٹھڑی سے نکلا۔ سامنے کوٹھی کے پورچ پر پھیلے ہوئے دوگن بیلیا کے سُرخ گل اناری پھول چاندنی میں ہلکے سیاہی مائل معلوم ہوتے تھے۔ ایک طرف گل مور کا پرانا درخت جس کا تنا پار سال درمیان میں سے کاٹ دیا گیا تھا۔ اپنی چند ایک شاخوں کے سروں پر پتوں اور پھولوں کے گچھے لئے جھوم رہا تھا۔ دور سے یہ گچھے بادلوں کے ننھے ننھے پاروں سے معلوم ہوتے تھے۔ گکر وندے اور کرنے کے پھولوں کی خوشبو فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ ابھی تک وہ سب اندر کمرے میں سوتے تھے لیکن آمد بہار کے باعث سردی زیادہ نہ رہی تھی۔ چندن ایک عالمِ محویت میں گوندی کے درخت کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے بے خیالی میں ایک دو ننھی ننھی گوندنیاں توڑ کر منہ میں ڈال لیں۔ پوری طرح پکی نہ تھیں۔ اس کا منہ بے مزہ ہو گیا۔ ایک لمحہ تک وہ ششش و پنج کی سی حالت

میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر برآمدے میں گیا اور اس نے بڑی احتیاط سے دیوان خانے کا دروازہ کھولا۔

سونے کا کمرہ مردانے کے ساتھ ہی تھا اور دیوان خانہ عام طور پر کھلا رہتا تھا اس کا ایک دروازہ وہ باہر سے بند کر لیا کرتا تھا۔ اور ایک اس کے مالک اندر سے بند کر لیتے تھے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مالک کے سونے کے کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ اس کا عکس دروازے کے شیشے پر پڑ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے گدلی روشنی کا برش دروازے کے شیشوں پر پھیر دیا ہو۔ آہستہ آہستہ دری پر پاؤں رکھتا ہوا چندن بڑھا اور جا کر دروازے کے ساتھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔

اندر چھت میں لال رنگ کا بلب روشن تھا۔ اس مدھم روشنی میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھنے لگا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بھاگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا تھا۔ اعضا تننے لگے تھے۔ اس کا گلا اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور اس کی نسوں میں جیسے دودھ اُبلنے لگا تھا۔

پنجوں کے بل بھاگ کر وہ باہر آیا۔ آہستہ سے اس نے دروازہ بند کیا اور باہر چاندنی میں آکھڑا ہوا۔ سامنے گل مور کا تنا کھڑا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کی ایک ضرب سے وہ اس تنے کو گرا دے۔

کوٹھی کے سامنے لان میں فوارے کے گرد سرخی مائل پیلے پیلے پھولوں کے بے شمار پودے لہرا رہے تھے۔ جن کے چوڑے چوڑے پتوں پر پانی کی بوندیں پھسل پڑا کرتی تھیں۔ گکروندے کی خوشبو اور بھی تیکھی ہو کر فضا میں بس گئی تھی۔ چندن نے جا کر فوارے کی ٹونٹی گھما دی۔ پھر پھر ایک میٹھی سی پھوار اس پر پڑنے لگی۔

وہ جلیٹھو کے ہاں کیوں گیا؟ وہ سوچنے لگا—— دوپہر کے وقت ارد گرد کی کوٹھیوں کے نوکر جلیٹھو کی کوٹھڑی میں جمع ہوتے تھے۔ کبھی تاش کھیلتے کبھی چوسر کی بازی لگاتے۔

کبھی اپنے اپنے مالکوں اور مالکنوں کی نقلیں اُتارتے۔ کبھی کبھار جلیبھو اپنے چچا سے ایک پرانا گراموفون مانگ لاتا جو اس نے کبھی ایک کباڑی کی کلیرنگ سیل میں خریدا تھا۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے اسہال کا مریض رریا رہا ہو۔ لیکن وہ سب بڑے مزے سے اس پر "گوری تیرے گورے گال پہ" یا "توسے لاگی نجر یا رے" سُنا کرتے۔ حال ہی میں جلیبھو چارلی کا ایک نیا ریکارڈ لے آیا تھا اور دوپہر بھر اس کی کوٹھڑی میں "تیری نظر نے مارا ۔۔۔"

تیری نظر نے مارا۔

(ایک دو۔ تین چار۔ پانچ چھ۔ سات آٹھ۔ نو دس گیارہ۔ تیری نظر نے مارا)

ہوتا رہتا تھا۔ لیکن چیدن کبھی ادھر نہ گیا تھا۔ اسے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ صبح سویرے ہی اس کا مالک اُسے جگا دیا کرتا تھا۔ وہ اس کے مالش کرتا۔ اس کے لئے نہانے کا پانی تیار کرتا۔ چائے بناتا۔ اس کے دفتر چلے جانے کے بعد دوپہر کے کھانے کا انتظام کرتا۔ کھانا بنا کر دفتر لے جاتا۔ آکر نہاتا۔ کھانا کھاتا اور سو جاتا۔ ایسی گہری نیند سوتا کہ بارہا غروب آفتاب تک سوتا رہتا اور اس کے مالک کو ٹھوکریں مار مار کر اسے جگانا پڑتا۔ لیکن آج اپنی بے خوابی سے ہار کر جب وہ دوپہر کو جلیبھو کی کوٹھڑی میں گیا تو اس نے ایسی باتیں سُنیں کہ اس کی رہی سہی نیند بھی حرام ہو گئی۔

بھوہار کے پڑتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری سی اُٹھی۔ وہ ذرا چونکا۔ کہیں اسے بخار تو نہیں ہو گیا۔ رُتہ بدل رہی ہے۔ اور وہ پانی کے نیچے کھڑا بھیگ رہا ہے۔ اگر نمونیا ہو گیا تو! اس نے سر کو ایک بار جھٹکا دیا۔ لیکن وہ مُسکرایا نہیں اور فوارے کو کھلا چھوڑ کر ہی اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا۔

٭ ٭ ٭

لیکن جلد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سر بھاری بھاری تھا جسم پر بخار کی سی

کیفیت طاری تھی اور آنکھیں کچھ اُبلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے پھر ایک خواب دیکھا تھا۔ کچی ناشپاتیوں کے گچھے اس کے سر کے گرد گھوم رہے ہیں۔ وہ ایک ویران سے مکان میں کھڑا اُنہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پاس ہی پانی کا نلکا چل رہا ہے۔ اور اس کے پاس ایک بچہ کھڑا چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔ "میرا کھلونا مت توڑو۔" وہ سر اُٹھا کر ادھر دیکھتا ہے۔ وہ بچہ کاسنی بن جاتا ہے۔ اور وہ سُنتا ہے "میری ناشپاتیاں مت توڑو۔ میری ناشپاتیاں ......"

چندن پاگلوں کی طرح اُٹھا۔ جیٹھو کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج گئے۔ اس نے کُرتہ پہنا مٹی کے ایک پُرانے میلے کوزے میں سے خستہ سا بٹوا نکال کر جیب میں رکھا۔ کوٹھڑی کی کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

* * *

چاندنی ایک وسیع شامیانے کی طرح پریڈ کی گراؤنڈ پر پھیلی ہوئی تھی۔ اور سڑکوں کے نیم جیسے اس شامیانے کو تھامے کھڑے تھے۔ ان کے پتوں سے بجلی کے قمقمے ٹمٹما اُٹھتے تھے۔ اور دُور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان درختوں کے پرے کوئی الاؤ جل رہا ہو۔

چندن کوئن میری روڈ پر ہولیا۔ دائیں طرف کوٹھی سے گُلِ رعنا کے کھلتے گُل شب بو اور مولسری کی ملی جلی مہک کا ایک جھونکا آیا۔ اور سڑک پر درختوں کے نیچے بچھے ہوئے روشنی اور سائے کے جال ہلے۔

تیس ہزاری کے چورستے پر وہ رُکا کہ شائد کوئی ٹرام آتی ہوئی مل جائے۔ لیکن شاید گیارہ کبھی کے بج چکے تھے۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ ایک گندگی کی گاڑی عفونت پھیلاتی ہوئی اس کے پاس سے گذر گئی۔ چندن کا دماغ بھنا گیا۔ بھاگ کر وہ مٹھائی کے پل پر ہو لیا۔ جس چبوترے پر سپاہی کھڑا رہتا تھا وہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید کسی موٹر والے نے سپاہی

کی کرختگی کا بدلہ اس معصوم چبوترے سے لیا تھا۔ پل پہ بالکل سناٹا تھا۔ اُوپر چاند چمک رہا تھا۔ اور پل کے نیچے گہرائی اور تاریکی میں ریل کی لائنیں اور سامنے کچھ دور لال ہرے سگنل چپ چاپ ٹمٹما رہے تھے۔ چندن پل کی دیوار کے ساتھ سر لگائے لمحہ بھر تک مبہوت و ساکن ان ناگلوں سی لائنوں اور ان ٹمٹماتے ہوئے سگنلوں کو دیکھتا رہا۔

پھر وہ آگے چل پڑا۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں۔ اور پٹڑی پر کہیں کہیں میلے سے لحاف لئے دکاندار سوئے ہوئے تھے۔ میلی کچیلی دھوتیوں میں ان کے زرد زرد اعضا پورنماشی کے چاند کی اس روشنی میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ تیلی باڑہ کے سامنے پٹڑی پر ایک ٹوٹا پھوٹا تانگہ پڑا تھا۔ اور دو تین کوڑا اُٹھانے والی خالی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بائیں طرف دور تک ایک سفید سی دیوار چلی جاتی تھی۔ جس کے پیچھے کبھی کسی گاڑی کے تیز تیز گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ اور دائیں طرف دکانوں کے باہر کہیں بانسوں کے گٹھے پڑے تھے۔ کہیں چارپائیاں اور کہیں لکڑی کی خالی پیٹیاں! چندن چپ چاپ اپنے خیالات میں محو قطب روڈ کے چورستے پر آگیا۔

صدر بازار بالکل بند ہو چکا تھا صرف کونے کے حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ چندن کی بھڑکی ہوئی طبیعت یہاں تک آتے آتے قریب قریب ٹھنڈی ہو گئی تھی صرف اس کے دل میں ایک ہلکا سا اشتیاق کا جذبہ موجود تھا۔ اور اس کے ماتحت اس نے حلوائی کی دکان سے آدھ سیر گرم گرم دودھ پیا۔ پھر جیسے ایک نئی اُمنگ پاکر وہ اور آگے بڑھا۔

دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں۔ بائیں طرف کے ماشاءاللہ ہوٹل میں کوئی شخص بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ دائیں بائیں کہیں کہیں بنواڑی یا حجام کی دکان کھلی تھی۔ ایک دکان میں ایک مزدور (جسے دن میں شاید فرصت نہ ملتی تھی) بیٹھا سر پر اُسترا پھروا رہا تھا۔

کاٹھ بازار کے سرے پر چندن ایک لمحہ کے لئے رُکا۔ تانگوں کے اڈے پر ایک دو تانگے والے ابھی گھوم رہے تھے۔ تانگہ شیڈ کے عین اُوپر چاند چمک رہا تھا۔ اور اس چاندنی میں گرد اور دھوئیں کا ہلکا سا غبار بھی ملا ہُوا تھا۔ وہ کاٹھ بازار میں داخل ہُوا اور حیران سا ایک چوبارے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس میں گیس کی روشنی کے سامنے ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ چندن کی مری ہوئی اُمنگ پھر جاگی۔ لیکن یہاں ابھی تک کئی آدمی کھڑے تھے۔ اتنے آدمیوں کے سامنے۔ اتنی روشنی میں اس کے لئے معاملہ کی بات کرنا مشکل تھا۔ اس نے نیچے کی کوٹھڑیوں کی طرف دیکھا۔ ہر ایک کوٹھڑی کے آگے ایک لیمپ لٹک رہا تھا اور ایک عورت کھڑی یا بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی کسی کوٹھڑی کا دروازہ بند ہو جاتا اور کسی شخص کے پیچھے لمپ اُٹھائے ہوئے عورت ایک میلے سے پردے کے اندر چلی جاتی تھی۔ لمحہ بھر کے لئے ابھری ہوئی اُمنگ چندن کو پھر ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر ایک لوہے کی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ جو عین چوک میں بچھی ہوئی تھی۔ اور جس کے پاس ایک میز پر رنگ برنگ بوتلیں رکھے ایک دو چمپی کرنے والے بیٹھے تھے۔

"چمپی کراؤ گے۔"

چندن نے غیر ارادی طور پر سر ہلا دیا۔ پاس ہی ایک اور ایسی دکان تھی اور اس کے ساتھ بچھے ہوئے بنچ پر ایک شخص بیٹھا چمپی کروا رہا تھا۔ اس کے پرے ایک لمبے برآمدے میں اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے سامنے عورتیں کھڑی اپنے گاہکوں کو بُلا رہی تھیں۔ تھک جانے کے ڈر سے انہوں نے چھت سے رسیاں لٹکا رکھی تھیں۔ جن کے سہارے وہ کھڑی ہو جاتی تھیں۔

چندن کے سر میں تیل کے گرنے سے بجلی کی سی سرسراہٹ ہوئی اور پھر حجام لڑکا چمپی کرنے لگا۔ چمپی کرنے کے بعد اُس نے چندن کی پیشانی اور گردن کو ایک میلے سے تولئے سے پونچھ کر اس کے بال بنا دیئے۔

چندن جب وہاں سے اُٹھا تو اسے ناک میں سستے خوشبودار تیل کی تیکھی سی بو آ رہی تھی۔ اور اس کی اُمنگ پھر جیسے بیدار ہو گئی تھی۔ چوک چھوڑ کر وہ ایک گلی میں ہو گیا۔ یہاں لوگ کم تھے اور روشنی بھی اتنی نہ تھی۔ وہ ایک بار گلی کے دوسرے سرے تک جا کر مڑ آیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیسے بات چیت شروع کرے۔ وہ تو ان سے آنکھیں بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ محض خیال ہی سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ اس نے سوچا واپس چلا جائے۔ اسے جیٹھو کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گلی میں سے ہوتا ہوا دوسری طرف سے نکل جائے گا۔ مگر اتنی دور آ کر وُہ یوں ہی جانا بھی نہ چاہتا تھا لیکن اسی وقت ایک کوٹھڑی کے آگے قدرے اندھیرے میں بیٹھی ہوئی ایک موٹی سی تھل تھل بلبل عورت نے اس کی مشکل حل کر دی۔ اس کے پاس دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں فرش پر ہی دری بچھائے لیٹی ہوئی تھیں۔ بالکل کانسی کی عمر کی۔ "آؤ ادھر آؤ" پیار سے اس نے کہا۔

چندن بڑھا۔

سرگوشی میں اس نے کہا "آؤ سوچتے کیا ہو۔ بارہ آنے لگیں گے۔"

اشارہ اس کوٹھڑی کے سامنے کرسی پہ بیٹھی ہوئی عورت کی طرف تھا۔ جو صرف ایک بنیان اور کالی ساڑھی پہنے بیٹھی تھی۔ جس کی چھاتیاں مرجھائی ہوئی ککڑی کی طرح تھیں۔

چندن نے اس کے پاس فرش پر آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف حسرت بھری نظر سے دیکھا جس کے ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ تھی۔

پھر کر موٹی عورت نے کہا "یہ تو ابھی چھوٹی ہے۔ یہ ابھی یہ باتیں کیا جانے۔"

چندن کے دماغ میں کچی ناشپاتیاں گھوم گئیں۔ پھر کانسی اور پھر کچی ناشپاتیاں اور موٹی عورت نے کہا۔ "دو روپے لگیں گے۔"

چندن چُپ رہا۔ وہ کہنا چاہتا تھا۔ "دو روپے بہت ہیں۔"
تبھی موٹی عورت نے کہا۔ "اچھا تو ڈیڑھ روپیہ ہی دے دو۔ ابھی تو نتھ بھی نہیں اُتری"
چندن کی نسوں میں دودھ اُبلنے لگا۔ اس کا جسم گرم ہونے لگا۔ دوسرے لمحے وہ
اس میلے پردے کے اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے اس لڑکی کو لئے ہوئے وہ موٹی عورت....

⁘

ایک ہفتے کے بعد سر پر اپنا بوریا بستر اُٹھائے چندن پورچ میں کھڑا تھا۔ اور اندر
کمرے میں اس کا مالک اپنی بیوی کو ہدایت دے رہا تھا۔ "میں ابھی ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں
سارے مکان کو ڈس انفیکٹ کروا لینا۔ سب جگہ تو جاتا رہا ہے کمبخت۔"
اور چندن بے بسی کی حالت میں کھڑا سوچ رہا تھا۔ لیکن لڑکی کی عمر تو تیرہ سال کی
بھی نہ ہو گی۔ اور اُس کی تو ابھی تک نتھ بھی نہ اُتری تھی ⁘

بلونت سنگھ

ماہ جون سنہ ۲۰ء کو ضلع گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں میری پیدائش ہوئی سنہ ۴۲ء کو میں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ آج کل اگرچہ پڑھنا ترک کر رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنا شمار طالب علموں ہی میں کرتا ہوں۔

جب میں بچہ تھا۔ میرے والد صاحب میانوالی میں نہائت معمولی نوکری کرتے تھے۔ سنتا ہوں کہ اُن دنوں میں بہت موٹا تازہ تھا۔ دُودھ اس قدر زیادہ پیتا تھا۔ کہ والد صاحب کی معمولی آمدنی کفالت نہ کرتی۔ اس لئے تنگ آکر مجھ کو دودھ میں پانی ملا ملا کر پلایا جاتا۔ ہوش سنبھالنے پر میں نے اپنے گاؤں کے اسکول میں پڑھنا شروع کیا۔ میرے والد صاحب کا تبادلہ میانوالی سے جالندھر ہوؤا۔ پھر انہیں ڈیرہ دون کے پرنس آف ویلز ملٹری کالج کے اسٹاف میں لے لیا گیا۔ ڈیرہ دون میں میری تعلیم زیادہ تر کیمبرج اسکول میں ہوئی۔ حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا۔ کہ ہم ڈیرہ دون سے پنجاب واپس آ گئے۔ گوجرانوالہ کے مختلف سکولوں میں پڑھنے کے بعد میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ اور میں گھر سے بھاگ نکلا۔ کافی عرصے کی آوارہ گردی کے بعد پھر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوؤا۔ ڈیرہ دون کے اے، پی مشن سکول سے دسویں پاس کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔

بچپن کی بہت سی باتیں بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتا ہوں۔ کیونکہ انسان کے کریکٹر کے مختلف پہلو بچپن ہی میں نظر آنے لگتے ہیں۔ کمسنی میں چلتے وقت اگر کوئی جانور بیل گدھا وغیرہ میرے رستے میں آجاتا تو میں رستہ چھوڑ کر اس سے بچنے کی ہرگز کوشش نہ کرتا۔ بلکہ اسی جگہ رک جاتا اور انگلی کو انکار کے طور پر ہلاتا کہ وہ میرا راستہ چھوڑ کر خود بچ کر نکل جائے۔ میرے والد صاحب کو فخر ہے کہ جب میں ان کے ساتھ گھومنے نکلتا، رستے میں اگر میں ٹھوکر کھا کر یا کسی اور وجہ سے گر پڑتا۔ تو کبھی مجھ کو اٹھانے کی کوشش نہ کرتے۔ وہ پاس کھڑے اس بات کے منتظر رہتے کہ میں خود ہی اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں۔ میری والدہ صاحبہ بتاتی ہیں کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو ترازو کے باٹوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ گھر میں باٹ ترتیب کے ساتھ رکھے جاتے تھے یعنی سب سے نیچے دوسیرا اس کے اوپر ایک سیرا اس کے اوپر آدھ سیرا۔ غرض اسی طرح سب سے اوپر آدھی چھٹانک کا باٹ ہوتا تھا۔ میں ان کے ساتھ کھیلنے کے بعد کسی اور کام میں مصروف ہونے سے پہلے ان باٹوں کو پھر اسی ترتیب سے رکھنے سے کبھی نہ چوکتا۔ ایک بات مجھ کو خود بھی یاد ہے۔ میں ان دنوں ننھیال میں تھا۔ ایک دن ہم سب لوگ دالان میں بیٹھے گڑ میں پکی ہوئی گیہوں کی گھنگنیاں کھا رہے تھے۔ گاؤں میں اتنے چمچوں کا انتظام تو ہوتا نہیں۔ اس لئے ہاتھوں سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ ہاتھوں کی انگلیاں چپچپی ہو جاتی ہیں۔ میں کھانے والوں میں سب سے زیادہ کمسن تھا۔ مجھ کو یہ بات سوجھی کہ کھانے کے بعد ہم کو ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس لئے میں اندر سے پانی کا لوٹا لے آیا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ سب لوگ خصوصاً والد صاحب میری ذہانت پر بہت خوش ہوتے تھے۔

میری گھر کی زندگی بہت تلخ تھی۔ اول تو میرا کوئی بھائی یا بہن نہ تھی۔ میں

گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ دوسرے مجھ کو گھر پر مار بہت پڑتی تھی۔ والد صاحب پیار کم کرتے تھے اور مارتے خوب تھے۔ اس لئے میں گھر کی زندگی سے متنفر رہتا۔ تین دفعہ گھر سے بھاگا۔

میں فطرتاً جھگڑالو تو نہ تھا لیکن پھر بھی میرا لڑکپن مار پیٹ میں گزرا۔ ہمارے جھگڑے زیادہ تر شہر کے نواح میں باغوں کے رکھوالوں سے ہوتے تھے۔ دہرہ دون میں آموں، امرودوں اور لیچیوں کے بہت سے باغ ہیں۔ ہم وہاں جاتے، کچھ نہ کچھ چراتے، رکھوالے للکارتے، بھاگ سکتے تو بھاگ آتے۔ ان کو مار سکتے تو مارتے۔ اگر پکڑے جاتے تو خود پٹتے۔ دو ایک مرتبہ تو درختوں سے باندھ کر اور گھیر گھیر کر ہم کو اس قدر مارا گیا کہ کئی دن اچھی طرح چلنے پھرنے سے بھی ناچار کر دئے گئے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکوں کے ساتھ ہمارے جھگڑے نہیں ہوتے تھے۔ جھگڑے ہوتے ضرور تھے، لیکن کم، یعنی اسی صورت میں جب کہ ہم کو زیادہ دق کیا جاتا۔ ہماری پارٹی میں لڑکے زیادہ تعداد میں تھے اور طاقتور تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہم تنظیم کے ساتھ کام کرتے تھے۔ بعض اوقات یہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے خوفناک صورت بھی اختیار کر لیتے۔ ہم میں سب سے زیادہ طاقت ور لڑکا میرا ایک بہت عزیز دوست تھا جو میرا ہم نام تھا۔ اور تجویزیں مجھ کو سوچنی پڑتی تھیں۔ زیادہ کام بھی ہم دو ہی کرتے تھے۔ اس لئے ہم پارٹی کے کرتا دھرتا تھے۔

ہماری کارروائیاں، باغوں کے رکھوالوں اور اسکول کے لڑکوں تک محدود تھیں۔ لڑکے ہم سے ڈرتے تھے اور رکھوالے ہمارے ہاتھوں تنگ۔ ایک مرتبہ مجھ کو اور میرے ساتھی کو دو اور لڑکوں نے کشتی کے لئے چیلنج دیا۔

ہم دو نو کشتی میں صفر تھے۔ لیکن فوراً راضی ہو گئے۔ ان میں جو طاقت در تھا۔ وہ میرے ہمنام دوست کے ساتھ لڑا۔ اور جو کم طاقت ور تھا وہ مجھ سے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں نے ہم دونوں کو چاروں شانے چت گرا لیا۔ ہماری بڑی سبکی ہوئی۔ طیش کے مارے ہم نے ڈنڈے پکڑ لئے اور ان سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ لڑ پڑتے تو ہم کو نانی یاد آجاتی۔ لیکن وہ بیچارے گھبرا گئے۔ اُن دونوں نے معافی مانگ کر بڑی مشکل سے ہم سے اپنی خلاصی کرائی۔

میری پڑھائی کا یہ حال تھا۔ کہ میں صبح کھانا کھا کر گھر سے نکلتا اور ایک دوست کے کمرے میں پناہ لیتا۔ اس کمرے کا نام تھا پریم کٹیا۔ میں سارا دن گپیں ہانکتا یا ہم سب اپنے کاموں سے متعلق تجویزیں سوچتے، شام کے وقت کتابیں لے کر گھر پہنچتا تو والد صاحب والدہ صاحبہ کو آواز دے کر کہتے "بیٹے کے لئے دودھ لاؤ۔" دودھ پی کر مسکین صورت بناتے میں گھر سے نکل آتا اور پھر دسوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

مجھ کو جاننے والے حیران رہ جاتے جب وہ امتحان میں میری شاندار کامیابی سے واقف ہوتے۔ سو دن میں دس دن حاضر رہتا۔ لیکن نمبر اچھے پاتا۔ ایک تو میں ذہین تھا اور دوسرے ترکیبوں سے کام چلتا تھا۔ میں نے کچھ لڑکوں کی لسٹ تیار کی جس میں اچھے لڑکوں کے نام درج کر لیتا امتحان سے کچھ عرصہ پیشتر ان کی کاپیاں اُڑا لاتا۔ اِدھر بلا محنت میری تیاری مکمل ہو جاتی اُدھر ان کی تیاریاں نامکمل رہ جاتیں۔ عموماً اپنے رویّہ سے مطمئن رہتا میں ان کو اپنی نسبت کم تر خیال کرتا۔ اور خود کو بہت مصروف اور اہم ہستی سمجھتا تھا۔

میں نے کہانی بہت چھوٹی سی عمر میں لکھنی شروع کر دی تھی۔ پہلے پہل سدرشن اور پریم چند کو میں نے بہت پڑھا۔ میرے دوست مجھ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پہلے پہل والد صاحب میرے اس کام میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ مجھ کو کہانیاں لکھنے میں مدد بھی دیتے۔ میری پہلی کہانی "پرتاپ" کے افسانہ ایڈیشن میں چھپی۔ پھر "مسیحی دنیا" اور "تیج ویکلی" میں بھی کہانیاں لکھتا رہا۔ "ساقی" میں میری پہلی کہانی سزا شائع ہوئی۔ اور اسی سے میری طرف لوگوں نے توجہ دی۔ رسالہ "سہیل" میں بھی میری کہانیاں چھپیں۔ "کبھی" میری آخری کہانی ہے۔ جو "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوئی۔ میرے افسانوں کا مجموعہ "جگا" "مکتبہ اُردو لاہور" سے عنقریب شائع ہوگا۔

میں کہانی بہت کم لکھتا ہوں۔ اس لئے کہ میں زیادہ لکھ ہی نہیں سکتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اس بات سے بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں میں افسانہ نویس ہو کر ہی نہ رہ جاؤں۔ مجھ کو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، محمد حسن عسکری، عصمت شاہد لطیف، سعادت حسن منٹو بہت پسند ہیں۔

مجھ کو موسیقی سے دلچسپی ہے۔ مصوری سے بھی لگاؤ ہے۔ کبھی بنسری بجانے کا بھی شوق رکھتا تھا۔ سیر و شکار اور تفریح کا شوقین ہوں۔ مجھ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ خاص طور پر فلسفہ کے مضمون سے دلچسپی ہے۔ سیاسیات سے الگ رہتا ہوں۔ میرا قد میانہ (پانچ فٹ ۶ انچ)، وزن لگ بھگ دو من۔ پہلے کافی ورزش کیا کرتا تھا۔ اب کچھ نہیں کرتا۔

کبسی

برف کے تودے روئی کے گالوں کی طرح آہستہ آہستہ گر رہے تھے۔

پہاڑوں، درختوں، مکانوں، ان دونوں کے کندھوں اور ان کے پیچھے پیچھے آنے والے قلیوں کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان پر برف ہی برف۔ جسم کو چھیدنے والی نہائت سرد ہوا چل رہی تھی۔

ان کے سفر کی آخری منزل تھی۔ وُہ دیر تک باتیں کر کے تھک چکے تھے۔ اب انہوں نے بولنا بھی بند کر دیا تھا۔ بس خاموشی سے تھکے ماندے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے پیچھے قلی بوجھ تلے دبے ہوئے پسینہ میں تر ہو رہے تھے۔ اور ان کے سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے۔

دونوں خوش پوش تھے۔ ایک نو دراز قد چھریرے بدن کا طرح دار نوجوان تھا۔ دوسرا قدرے پست قد کچھ موٹا اور بھدّا سا مگر دونوں کے بشرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔

خوشرو نوجوان نے اُوور کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکال کر اپنی ناک کو چھوا۔ ارے میری ناک، کبسی سرد! جیسے برف کی ڈلی بالکل سُن، جیسے ہے ہی نہیں۔

دوسرا ہنسنے لگا اپنی ناک کی نوک پر پانی کا کانپتا ہوا قطرہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔ ہم
—— کہاں ٹھہر رہے ہیں؟"
جواب ملا۔ سیوائے ہوٹل میں۔
سیوائے ہوٹل کی چکنی سیڑھیوں کے دونوں طرف برقی روشنی ہو رہی تھی۔ ہنڈے
سبز رنگ کے تھے۔ دھند میں اوپر کو اٹھی ہوئی محراب پر گہرے نیلے رنگ کے انگریزی حروف
چمک رہے تھے۔ سبز رنگ کی روشنی آگے سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت بڑی گہما گہمی
تھی۔ خوش پوش لڑکیاں، عورتیں، بچے، بوڑھے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ پہاڑی ٹٹوؤں اور رکشاؤ
کی خوب ریل پیل تھی۔
ایک تحکمانہ آواز گونجی۔ قُولی!
وہیں ستون کے پاس سے تین چار قلی ٹاٹ اوڑھے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے
اپنی اپنی بیڑی مسل کر جیب میں ٹھونس لی۔
ایک سُرخ رنگ کا پست قد گٹھیلا شخص ہاتھ بڑھا کر بولا۔ وِش شائیڈ بلیز۔
دونوں نوجوان آگے بڑھے حسین نوجوان نے اُوور کوٹ کے اُلٹے ہوئے کالروں میں
سے منہ نکال کر پوچھا۔ انراٹ سیوائے؟
اِٹس شِر۔
نوجوان نے "اِٹس شِر" کہنے والے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر چمک تھی۔
اس کی پیشانی اور کنپٹیوں پر نیلی اور سُرخ رگوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ نوجوان بولا۔ آر یو......
اِٹس شِر آئی ام ڈگا۔ تھانک یُو۔ وِش ہوٹیل۔
ہوٹل کے قلیوں نے سامان اٹھا لیا اور وہ تینوں اجلی اجلی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ ہوٹل
کا اندرونی حصہ برف کی وجہ سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونوں نے گھوم کر دیکھا۔ گہرے
میں دھندلی دھندلی برف پوش عمارتیں، ٹمٹماتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لمپ، رکشا قلیوں

کی کالی کالی چھریری ٹانگیں، ہوٹل کے پاس سے نسبتاً تاریک سی ایک گلی جاتی تھی۔
گلی کے اندر روشنی بہت ہی مدھم تھی۔ برف کو چھو کر آنے والی ہوائیں سڑے ہوئے
تیل کی بو لئے ہوتی تھی۔ اس پُراسرار گلی میں ایک دبی ہوئی سی آواز اُٹھی۔

ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے | جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

قدم بہ قدم وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ نوجوان نے گائڈ سے پوچھا۔ یہ گلی کیسی ہے؟
گائڈ نے ٹھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ اُدھر یونہی ڈانسنگ گرلز رہتی ہیں"
ڈانسنگ گرلز!...... جلد آ جا کہ جی ترستا ہے...... جلد آ جا کہ جی..... جلد آ جا...
آہستہ آہستہ آواز مر گئی۔ لیکن اس کی صدائے بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ پہاڑ کی
ہر غار آواز کو دُگنے درد کے ساتھ واپس لوٹا رہی تھی۔

دوسرے دن سہ پہر کو حسین نوجوان باہر نکلا۔ ان کا کمرہ اُوپر کی منزل پر تھا۔ نیچے
ہوٹل کا وسیع صحن۔ اس نے نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا۔ آج بہت رونق تھی چونکہ
آسمان ابر آلود تھا اور موسم خوش گوار۔ اس لئے لوگ ٹولیاں بنائے کھلے صحن میں ہی بیٹھے
لُطف اندوز ہو رہے تھے۔

ایک طرف ایک بھاری بھرکم سکھ رئیس دُوہری پگڑی باندھے چائے پینے میں
مشغول تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک نوجوان عیسائی لڑکی بڑے گملے کے پاس کھڑی
نوکر سے بات کر رہی تھی اور صورت شکل میں خچر سے بہت مشابہ تھی۔ ٹانگیں لمبی اور فربہ
چھاتیاں نوک دار اور بے تحاشہ اُبھری ہوئی۔ منہ لمبوترا سا۔ رنگ زیادہ پکی ہوئی اینٹ
کے مانند، مگر گال سرخی ملنے کے باعث خوب لال ہو رہے تھے۔ پرے مینجر فون کے پاس
بیٹھا اپنی نیم باز آنکھوں سے حاضرین کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی نگاہ صحن کے پرلے
سرے تک پہنچتی تھی۔ جو رنگ برنگ کے دوپٹوں اور پگڑیوں کی وجہ سے پھولوں کی
ایک کیاری بنا ہوا تھا۔

اندر سے آواز آئی "دیوندر! دیوندر!" نوجوان نے بہ آواز بلند جواب دیا "ہاں"

"اندر آؤ بھئی تمہیں ایک چیز دکھائیں" "آیا"

وہ واپس جانے ہی لگا تھا کہ ساتھ کے کمرے سے ایک تیرہ چودہ برس کا لڑکا نکلا۔ جس کے پاؤں پر گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔ وہ ریڈیو کی گت پر پاؤں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ اور اس کے سر پر دوپلی ٹوپی، آنکھوں میں کاجل اور بر میں تنگ پاجامہ کچھ عجیب سی کیفیت پیش کرتا تھا۔ ٹوپی میں سے نکلے ہوئے سیدھے برش کی طرح کے بال اس کی چکنی کنپٹیوں تک پہنچتے تھے۔

اندر سے ایک سانولے رنگ کے آدمی نے باہر نکل کر کہا۔ "کولھے بھی تو ہلاؤ۔ دیکھو۔ یوں اس جگہ ہاتھ رکھ کر یوں، بس۔ اب ہلاؤ کولھے اور آں ہاں اب جھٹکہ دو۔"

دیوندر کا ساتھی دروازے میں سر باہر نکال کر بولا۔ "بھئی آ بھی چکو" اور جب دیوندر اندر گیا تو ———

اس کا ساتھی ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ "توبہ کیجئے، بس گئی کب سے بلا رہا ہوں سرکار کو یہ ساتھ کے کمرے میں ہمارے پڑوسی جانتے ہو کون ہیں؟"

شاید ناچنے والوں کی کوئی پارٹی ہے۔ ابھی ابھی ایک لڑکا باہر کھڑا ناچ رہا تھا۔"

"اوہو تو مجھ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں سمجھا کہ کسی شریف گھر کی بہو بیٹیاں ہیں۔ واللہ آج کل دونوں میں تمیز کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔"

دیوندر شاعر تھا۔ بلدیو اس کا ساتھی۔ دیوندر کو زندگی کی بیشتر سہولتیں مہیا تھیں وہ ایک متمول باپ کا بیٹا تھا۔ یوں تو بحیثیت ایک بے کار شخص کے بھی اس کو شاعر بننے کا پورا حق حاصل تھا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ شاعر بننے کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ بلدیو اس کا مداح تھا۔ اور ہر موقع کا ساتھی۔ بلدیو کی اس سے رفاقت ایسی ہی تھی جیسی باسویل کی جانسن سے

تھی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا لطیفہ اس کی لکھی ہوئی ہر نظم کو قلمبند کرنا اور اس کی عادات کا مطالعہ بلدیو کا سب سے اہم مشغلہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد نوکر چائے کی کشتی اٹھائے اندر داخل ہوا۔ بلدیو نے چائے بنانی شروع کی۔

دیوندر نے نوکر سے پوچھا۔ "کیوں بھئی یہ بغل کا دروازہ بند کیوں ہے"

"حضور! مسافر اپنی مرضی سے اسے بند رکھتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو کھولنا پسند نہیں کرتے۔ ادھر کچھ ہے بھی نہیں۔ ایک گلی سی ہے"

دیوندر نے بلدیو کی طرف پر معنی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیشک! مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے تو سامنے کا دروازہ کھول دینا ہی کافی ہے"

نوکر چلا گیا۔

دیوندر نے اٹھ کر بغل کا دروازہ کھول دیا۔ "اوہو اب راز کھلا تو گویا یہی بازارِ حسن ہے۔ خوب"

وہ دروازے کے پاس ہی رضائی لپیٹ کر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ بلدیو نے چائے کی پیالی بڑھائی۔

دیوندر نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ "کیوں بھئی ہم پہاڑ پر اس شرط پہ تو نہیں آئے تھے۔ کہ چائے پی پی کر سینہ جلائیں کیوں یاد ہے کچھ؟"

بلدیو نے مسکرا کر چائے کی کشتی ایک طرف کو سرکا دی اور ایک بلوری لمبی گردن کی صراحی، اور دو خوش وضع پیالے میز پر رکھ کر گھنٹی بجا دی۔ نوکر اندر آیا۔ بلدیو نے دیوندر کی طرف دیکھا۔ دیوندر نے آرڈر دیا۔ "چار انڈوں کا آملیٹ۔ بھنی ہوئی مچھلی اور تلی ہوئی کلیجی۔"

بادلوں نے گھاٹیوں سے اوپر اٹھنا شروع کیا۔ تیز ہوا چلنے لگی۔ برف پوش چوٹیاں

دھندیں غائب ہوگئیں۔ ریڈیو پر ستار کی گت بجنے لگی۔

دیوندر نے دو چار جام پئے اور رزائی اتار کر علیحدہ رکھ دی۔ اس کے رخسار تمتما اٹھے۔ آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے پڑ گئے۔ شراب کا ہلکا سا نشہ اس کے لئے بے حد سرور انگیز ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دل کو دماغ کی حکومت سے آزاد کر دینے میں وہ چنداں حرج نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے ذہن میں گناہ اور ثواب کا وہ تصوّر بھی نہیں تھا۔ جو عام لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے۔ اِنسان کی بے بضاعتی کا جس قدر شدید احساس اس کو تھا۔ وُہ بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتا ہے۔ وہ نیکی پر یقین رکھتا تھا اور ایک مکمّل اور پرامن زندگی پر ایمان۔ زندگی کو بنانا اور سنوارنا اور اس میں سے دُکھ کے عنصر کو ہر ممکن کوشش سے دُور کرنا وُہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ انسان اور انسان کے درمیان مذہب اور مُلک کی تفریق سے وُہ متنفّر تھا۔ اس کی فکر بلند تھی۔ ذہن رسا اور دل پُرجوش۔

وہ کاؤچ سے اُٹھا اور اُوور کوٹ کھونٹی سے اُتار کر کندھوں پر ڈالے ہوئے وُہ بغل کے دروازے میں جا کھڑا ہؤا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس کی چوڑی پیشانی پر اُلجھے ہوئے بالوں میں پانی کے قطرے لرزنے لگے۔ بلدیو میز پر طبلہ بجا بجا کر "ساون کے نظارے ہیں" گا رہا تھا۔

دیوندر نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو اپنے قریب بلایا۔ دونوں دروازے میں سے گردن بڑھا کر دیکھنے لگے۔ سامنے کی عمارت کے بڑھے ہوئے چھجے پر بیچ کی طرف ایک عورت کی صورت نظر آئی۔ بلدیو نے آہستہ سے کہا حسین!
جانتے ہو یہ بھی "ڈانسنگ گرلز" میں سے ایک ہے۔

حسین!!

دیوندر دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

بلدیو اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ دیوندر کی طرف دیکھنے لگا۔ جو یک بیک سنجیدہ ہو کر

بے چینی سے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ پھر وُہ دروازے کے آگے جا کر رُکا اور کہنے لگا۔ اس عورت کی چھاتیاں شرمناک طور پر نمایاں ہیں۔

بلدیو خاموش رہا۔ وُہ پھر ٹہلنے لگا۔ بلدیو نے ایک جام اُور بڑھایا۔ دیوندر خاموشی کے ساتھ پی گیا۔

اتنے میں مینہ زور سے برسنے لگا۔ بڑے صحن سے لوگوں کے اُٹھ اُٹھ کر بھاگنے لگے۔ اور فرنیچر کے کھسکنے اور گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

معاً دیوندر رُک گیا۔ وُہ سپاہی کی مانند تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی نظر ننگا پربت کی دھندلی برف پوش چوٹیوں پر جمی ہوئی تھی۔

بلدیو نے چپکے سے نوٹ بک اٹھالی۔

تھوڑی دیر کے سکوت بعد دیوندر نے کہنا شروع کیا۔ "تم شائد اندازہ نہ لگا سکو کہ اس وقت میں کیسے ذہنی کرب میں مبتلا ہوں ——— ان کا وجود انسانیت کی توہین ہے۔ یہ اس جہاں کی غلاظت ہیں۔ دوست ان کی بھی کیسی زندگی ہے۔

بلدیو کی پنسل چل رہی تھی۔ وُہ ایسے موقع پر کسی اہم بات کا منتظر تھا۔

دیوندر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کمرے پر نگاہ ڈالو۔ ہر چیز میں سلیقہ یہ کاؤچ، یہ کرسیاں، یہ پلنگ، یہ میزیں اُور پھر صفائی دیکھو، دری، قالین کس قدر صاف ستھرے ہیں۔ صرف ایک شے ایسی ہے جس کی طرف ہم کبھی متوجہ نہیں ہوتے۔ وُہ چیز ہے یہ ردی کی ٹوکری۔ میز کی بغل میں پھلوں کے چھلکوں۔ پھٹے پرانے کاغذوں سے لبریز۔ کیا اس ٹوکری ہی کا صدقہ نہیں کہ کل کمرہ صاف نظر آتا ہے۔

بلدیو نے زیرِ لب کہا "بیشک"

بارہا ہم سڑک پر جاتے ہوئے جب سڑک کے کنارے پڑے ہوئے غلاظت سے لبریز ڈھول کے پاس سے گزرتے ہیں۔ اس وقت اپنی ناک رومال سے ڈھانپ لیتے ہیں

لئے جانے لگتا تھا۔ تو اس پر وہ کرینو آرڈر ہی نافذ کر دیتے تھے۔
انہی کی وساطت سے ہربنس کسی کمپنی میں پینتیس روپے ماہوار پر نوکر ہوا تھا اور شائد یہی وجہ تھی کہ اسے پینتیس کے پینتیس انہی کو دینا پڑتے تھے۔ ہاں مہینے بھر کی دوسری ضروریات کے لئے ان میں سے پانچ روپے اُسے لٹا دئے جاتے جو بعد میں گھر میں ہی خرچ ہو جاتے تھے۔ ہربنس کے اپنے لئے تو بس اتنا تھا۔ کہ دو دنوں میں وہ ایک پیسے کی بیڑی ضرور پی جاتا تھا۔ اس چار پانچ آنے ماہوار کے علاوہ کبھی فضول خرچی تو کیا اس نے ان کے ڈر سے کبھی کچھ خرچ کرنے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔
جب وہ نیا نیا نوکر ہوا تھا تو پہلی تنخواہ کی خوشی میں وہ اپنی بیوی کے لئے نو آنے کی کولڈ کریم کی ڈبیہ، سات آنے کی سلولائڈ کی بنی ہوئی کنگھی، اور پانچ روپے کی ایک ہلکی ریشمی ساڑی ضرور لایا تھا ———"
صرف انتیس روپے ملنے پر جب انہیں ان چیزوں کا پتہ چلا تھا، تو انہوں نے کھڑکی میں کھڑی ہوئی کملا کے سامنے ہی ہربنس کو پیٹنا شروع کر دیا تھا ——
"تمہاری شادی دُنیا سے انوکھی ہوئی ہے سالے؟ سات آنے کی کنگھی لے آیا۔ وہ دو پیسے والی لکڑی تو اس کے بال نوچ ڈالتی ہوگی! اس غصے میں انہوں نے ڈبیہ کی ساری کریم ہربنس کے سر اور منہ پر مل دی تھی۔ دو ہی برسوں میں بیوی کالی نظر آنے لگی ہے! تمہاری ماں تو ساری عمر منہ پر گیلا آٹا ہی ملتے مرگئی ہے۔ ابٹنا بنانے کے لئے میں نے اسے کبھی ایک پیسے کا تیل لا کر نہیں دیا ——" اور ساڑی کو دیکھ کر تو وہ تلملا ہی اُٹھے تھے کہ "غضب خدا کا، پانچ روپے کی ایک دھوتی!" اور ساڑی کا ایک سرا ان کے ہاتھ سے کھسک کر زمین پر ڈھلک گیا تھا۔ پھر وہ کہنے لگے تھے کہ —— "نواب زادہ اب ریشم پہنانے لگا ہے —— آج کل کی

ان چھوکریوں کو دیکھو تو سہی سوت کو چھونا بھی اُن کے لئے گناہ ہے۔ ان ریشموں نے ملک کو کنگال کر دیا ہے سالے! اب تو ان سے میرا گھر بھی تباہ کرنے لگا ہے"
وُہ دن اور یہ دن، ہربنس نے پھر کبھی کوئی چیز لانے کی حماقت نہ کی تھی۔

رام داس اچھے کھاتے پیتے آدمی تھے ——— چار جیبوں والی گاڑھے کی صدری اور اڑھائی گزی، کھدّر کی موٹی دھوتی میں خود کو ملبوس دیکھ کر وُہ اپنے کو ہندوستان کا بادشاہ سمجھتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار باہر جاتے وقت نو بیسے گز والی ایک دھاری دار قمیص اس صدری کے اُوپر سے وہ ضرور پہن لیتے تھے۔ اور وہی پرانے زمانے کا ناڑے کا پھٹا پرانا کلاہ (جس کی تیلیاں کسی پرانے بوسیدہ چھپّر کی طرح خشک ہو ہو کر سیاہ پڑ گئی تھیں) اور اس پر لپٹا ہوا تین گز گیروے رنگ کا موٹا سا کپڑا! ان دونوں چیزوں سے وُہ بادشاہ سے گویا شہنشاہ بن جاتے تھے۔ ایسے موقعوں کے لئے انہوں نے سُرخ چمڑے کا ایک جوتا بھی خدا معلوم کب سے لے رکھا تھا۔ جسے پہنتے وقت وہ اکثر اس پر سرسوں کے تیل کا پالش کر لیتے تھے۔

ہر آخری سنیچر کے روز جب منڈی سے وہ دس پندرہ سیر پیاز لے آتے تھے، تو اس کے کئی کئی دن بعد تک لوگوں میں پرچار کرتے رہتے تھے۔ کہ ———
سبزی کھاؤ۔ سبزی کھانے سے بدن میں طاقت آتی ہے۔ اور دل و دماغ تازہ ہوتے ہیں۔ کند ذہن سے کند ذہن انسان بھی اس کے کھانے سے صرف چند ہی دنوں میں نہائت عقلمند بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی باہر سے نہ جانے وہ کون کون سے جنگلی پودے اکھاڑ لاتے تھے۔ جو اُن کے یہاں پک کر عجیب عجیب ناموں کے ساگ بن جاتے تھے۔ نیز کئی مرتبہ ان کے یہاں چکی میں چنے پیس کر دال بنا لی جاتی تھی۔ جس کے چھلکے شائد اس خیال سے ساتھ ہی پکائے جاتے تھے۔ کہ

لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اگر غلاظت کا وُہ ڈھول وہاں پر نہ ہوتا تو وہی غلاظت سڑکوں پر پھیلی نظر آتی۔ یہ بھی زندگی کی ٹریجدی ہے........ ان میں سے کتنی عورتیں ہیں جنہوں نے یہ پیشہ اپنی خوشی سے اختیار کیا ہوگا۔ کتنی تعداد نے اس کیچڑ سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں نہ مارے ہوں گے۔ وُہ کون تھے جنہوں نے ان کو ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا ــــــ اور پھر اب جب کبھی ہم ان کے قریب سے گزرتے ہیں۔ تو ناک رومال سے ڈھانپ لیتے ہیں...... دوست ایک مرتبہ پھر شریف گھر کی بہو بیٹیوں اور ان بازاری عورتوں میں تمیز کرنے کی کوشش کرو۔"

دیوندر کے اعصاب کا تناؤ کم ہو گیا۔ دریا چڑھ کر اُتر گیا۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے دیوندر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بادل کا ٹکڑا برس کر اڑ گیا تھا۔ اس نے کسی پر نظر جما دی۔ اور پھر گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنا شروع کیا۔

او دیوی!
او مجسم نفس کشی!!
مجھ کو اپنے پاؤں چھو لینے دے۔
انہیں پیچھے مت ہٹا۔
تو وہ زخم ہے۔
جس کی بقا کے ہم خواہاں ہیں، اور
جسے تازہ رکھنے کے لئے ہم اپنی کالی اور پُرسکون راتوں کی نیند حرام کر ڈالتے ہیں۔"

بلدیو نے پنسل رکھ دی۔ اور گلاس اُٹھا کر بچی ہوئی شراب بڑے بڑے دو گھونٹوں میں چڑھا گیا۔

یکا یک تاریکی سے تیز روشنی میں آنے پر دیوندر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کچھ شراب

کا نشہ بھی تھا۔ کیونکہ بلدیو کے ساتھ رات بھیگنے تک شراب کا دور چلتا رہا تھا۔ اتنے میں وہ اندر داخل ہوئی۔

دیویندر غور سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ عام لوگ اس کو رنڈی کے نام سے پکارتے تھے۔ نام کس قدر مکروہ ہے۔ حالانکہ صورت کے لحاظ سے وہ دیویوں کو مات کرتی تھی اس نے معصومیت سے ہنس کر کہا۔ آداب عرض۔ آپ آ گئے۔ مجھ کو یقین تھا کہ آپ آئیں گے ضرور۔

دیویندر کا جی چاہا کہ وہ بھاگ جائے۔

"آپ کے ایک اور ساتھی بھی دوپہر کے وقت جھانک رہے تھے۔ وہ کون تھے؟"

دیویندر ایک کنواری لڑکی کی طرح شرما گیا۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ وہ "میرے دوست ہیں"

"دوست؟ خوب! تو وہ کیوں نہیں آئے"؟

"وہ سو رہے ہیں۔

عورت نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

دیویندر جھینپ کر بولا "میں ان سے کہہ کر نہیں آیا۔ بلکہ ان سے چوری آیا ہوں۔ میں نے جب آپ کو دیکھا تو ......

"اوہ یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل پر کیا گزری ہوگی شاید آپ بھول رہے ہیں کہ ہمارے پاس بہت لوگ آتے ہیں۔

دیویندر شراب کے نشے میں تھا۔ اگرچہ وہ ضبط کئے ہوئے سنبھل سنبھل کر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی وہ یہ بات چھپا نہ سکا کہ وہ شراب پئے ہوئے تھا۔

جتنی دیر تک اس پر سکوت طاری رہا وہ اس کو دیکھتی رہی۔ اسے وہ پسند تھا بہت پسند۔

انہیں دیکھ کر رامداس کے غصّے کا پارہ اور بھی چڑھ گیا تھا۔

"اب فلم دیکھنے لگے ہیں سالے! باپ تو مر مر کر ساری عمر پائی پائی جوڑتا رہا اور یہ سپوت اس کی سب کمائی سینما میں اجاڑنے لگے ہیں۔ اور پھر ستم تو دیکھو بہو کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔ تاکہ دنیا اس کا بناؤ سنگار دیکھے ـــــ ایسے سالوں ہی کی بیویاں تو گھروں سے بھاگتی ہیں ـــــ"

اور پھر یکایک مایا کا خیال آجانے سے ان کی آنکھوں میں خون ہی اُتر آیا تھا ـــــ "اور دیکھو تو سہی، مایا کو بھی لے گیا ـــــ میں کہتا ہوں، تم میاں بیوی جاتے ہو تو جاؤ جہنّم میں۔ ساتھ میری بیٹی کو کیوں بگاڑتے ہو"

شیام چرن نے بات کو ہزار ٹالنا چاہا تھا کہ "آپ کی بیٹی ہے بابوجی، تو اس کی بھی بہن ہوتی ہے ـــــ شانتی کیجیے، ابھی گھنٹے آدھ گھنٹے تک واپس آجائیں گے"

"ہونہہ ـــــ آجائیں گے" رام داس جھلّا اٹھے تھے کہ "واپس تو آ ہی جائیں گے ـــــ پر مایا اور بہو وہاں جو ننگے ناچ دیکھیں گی اور جو فحش گانے سن کر آئیں گی، اس کا ان کے دل پر کیا اثر پڑے گا؟ اور اگر کسی نے ان پر کوئی فقرہ کس دیا تو اُن کے پلّے کیا رہ جائے گا؟ ـــــ میں کہتا ہوں بھیڑ میں اگر کسی حرامزادے نے چٹکی ہی کاٹ لی....... تم نہیں سمجھ سکتے شاہو۔ میں ایسا آدمی ہوں کہ اگر میرے سامنے کوئی مایا کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے، تو میں مایا کا وہ انگ کاٹ دوں۔ اور دیکھنے والے کی آنکھیں تو کیا نکالوں، وہیں قبر بنا کے رکھ دوں ـــــ اس سالے نے سمجھا کیا ہے جو اس کو سینما گھر میں لے گیا۔"

اگرچہ اتنا چلّانے پر بھی ان کا گلا نہ تھکا تھا۔ لیکن زور زور سے بولنے کی بجائے اب انہوں نے دالان میں چکر کاٹنا شروع کر دیے تھے۔ ان کے خوف سے شیام چرن کو تو کھانے کا خیال بھول ہی گیا تھا۔ مگر اس وحشت میں لوٹا زمین پر پھینک کر وہ

خود بھی پاخانے جانا بھول گئے تھے ـــــــــ وہ اس طرح چکر پر چکر کاٹ رہے تھے اور شیام چرن دل ہی دل میں ڈر رہے تھے، کہ ہربنس، کملا یا مایا کے بجائے کہیں وہ انہی پر نہ برس پڑیں۔

رام داس پچھلی جنگ عظیم میں ہیڈ کلرک تھے۔ جنگِ عظیم کے بعد گو اب تو جنگِ عالمگیر بھی اپنے درمیانی مرحلوں پر آپہنچی ہے، لیکن رام داس کے خیالات 'مہا بھارت' سے بھی پہلے کے خیالات تھے۔ گویا ان کی چھوٹی سی دنیا جغرافیہ دانوں کے دست بُرد سے ابھی بچی ہوئی تھی۔ اور اس کو دیکھ کر پتھریا دھات کے زمانے کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

اس کلجگ میں بھی وہ ہربنس کو 'رام چندر' بنانے کے خواب دیکھتے تھے۔ اور پھر رام چندر کو تو صرف ایک ہی بن باس کی عقوبتیں برداشت کرنا پڑی تھیں۔ لیکن یہاں نت نئے نئے بن باسوں کے حکم ملتے رہتے تھے، انہوں نے ایسے عجیب عجیب قانون بنا رکھے تھے، کہ ان کی ایک اچھی خاصی تعزیرات بن سکتی تھی ـــــــــ "سوؤ، جاگو۔ اٹھو، بیٹھو" گھر میں گھڑی نہ ہونے کے باوجود وقت کی پابندیوں نے سارے گھر والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ دن کے وقت دھوپ اور راتوں کو تارے ہی رام داس کو گھڑی کا کام دیتے تھے۔ اور انہی دو چیزوں کی بنا پر وہ اکثر ایسا صحیح وقت بتاتے تھے، کہ ان کا منٹوں تک کا حساب سن کر کئی مرتبہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔

بہو پانچ منٹ دیر سے اٹھتی تھی تو اس کی پیشی ہو جاتی تھی۔ اگر بیوی وقت پر تُلسی کے پیڑ نہ پہنچتی تھی، تو اس کو وہ 'میٹھے وچن' سنائے جاتے تھے، کہ ان کی مٹھاس ہی سے اس کی طبیعت بھر جاتی تھی۔ چھوٹا لڑکا جب کبھی کھیلنے چلا جاتا تھا، تو اس کی شامت تو آہی جاتی تھی۔ لیکن اگر ہربنس بھی کبھی گھومنے کے

دال میں کہیں کوئی وٹامن کم نہ ہو جائے۔
ایک دفعہ جب ان کی بہو بیمار تھی، تو اتفاق سے شیام چرن نے انہیں اپنے ہاتھ سے آٹا گوندھتے دیکھ لیا تھا۔ اور شیام چرن کو اچانک ہی ان کی وہ نصیحت یاد آگئی تھی کہ "گیہوں کی ساری طاقت بھوسی میں ہوتی ہے"۔ اس بار خدا معلوم کس جذبہ کے تحت شیام چرن نے ان سے یہ پوچھنے کی جرأت کر ہی لی تھی کہ ـــــ "بابوجی، تو پھر یہ چھلنیاں کیوں بنی ہیں؟" اور شیام چرن کو دل ہی دل میں ان کی حاضر جوابی کی داد دینا پڑ گئی تھی۔ وہ کہنے لگے تھے ـــ "چھلنی اس لئے نہیں بنی کہ آٹا چھان کر تم بھوسی پھینک دو۔ بلکہ اس لئے، کہ بھوسی کو آسانی سے صاف کیا جا سکے۔ آٹا چھان لینے پر جب بھوسی رہ جائے تو اسے کنکریوں وغیرہ سے صاف کر کے پھر آٹے میں ملا لینا چاہئے"۔ اور یہ کہتے کہتے انہوں نے بھوسی آٹے میں ڈال دی تھی۔
چند دن ہوئے ان کے چھوٹے لڑکے کے پیٹ میں درد اٹھا تھا۔ گھر پر وُہ خود تو تھے نہیں، اِس لئے اس نادان لڑکے کے زور زور سے چلّانے پر ہربنس کا گھبرا جانا ایک لازمی امر تھا۔ بھاگ کر وہ بازار سے جنجر کی ایک بوتل لے آیا تھا۔ اور جب وُہ بوتل کھُلا ہی چاہتی تھی، تو کہیں سے اُنہوں نے آکر اپنے گھر میں یہ جرم سرزد ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اپنی "لقمانیت" بگھارتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ "اس کے پینے سے ہاضمہ بگڑ جاتا ہے سالے! اس عمر میں جس کو سوڈا واٹر دیا جائے وُہ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟" اسی وقت انہوں نے بوتل واپس بھیج دی تھی اور اپنی الماری میں سے تھوڑی سی اَدھ بھنی سَونف اَور تھوڑی سی اجوائن نکال کر اپنے لڑکے کو کھلا دی تھی
ہندو ہونے کے باوجود پردے کے وُہ اس قدر قائل تھے، کہ ان کی بیوی کو اس علاقے میں شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ یوں تو ان کی بیوی کہیں بھی آجا نہ سکتی تھی۔ لیکن جب کبھی جانا پڑ ہی جاتا تھا، تو رام داس خود اپنے ہاتھوں سے، اس کے دوپٹے کا

آنچل اس کے سینے تک ڈھلکا دیتے تھے۔ اور پھر اس دولھن کو لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لئے وہ قصبے کے غیر آباد علاقوں اور اجڑی ہوئی گلیوں کے چکر کاٹ کاٹ کر منزلِ مقصود پر پہنچا دیا کرتے تھے۔ ہاں جب کبھی انہیں تانگے پر جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ تو تانگے کے تین طرف نہیں، بلکہ چاروں طرف چادریں تنوا دی جاتی تھیں۔ تاکہ تانگے والا تک بھی ان کی بیوی کو نہ دیکھ سکے۔

ایک مرتبہ ان کی بیوی رات کی بچی ہوئی باسی روٹیاں ان کے خوف سے ٹھکانے لگانے کے لئے، اپنی ڈیوڑھی کے باہر تک چلی گئی تھی۔ ان دنوں گو اس کی عمر ڈھل رہی تھی، اور معمولی سا گھونگھٹ بھی اس نے نکال رکھا تھا، لیکن رام داس نے اسے ڈیوڑھی تک آتے اور ایک بھک منگے سادھو کے پاس کھڑے دیکھ کر ایسی سزا دی تھی ـــــــ ساری رات انہوں نے بیوی کو دالان میں کھڑا کئے رکھا تھا۔ اس رات جبکہ اندر کمروں میں سونے والے بھی ٹھٹھری بن بن جاتے تھے، تو بھلا دالان کی کھلی سردی اور برفیلی ہوا کی زد سے وہ کیسے بچ سکتی تھی! اگلی صبح جب وہ سردی سے اکڑی گری پڑی تھی، تو اس وقت اگر کسی بھی ڈاکٹر کو بلایا جاتا تو وہ ایم۔ بی نمبر ۶۹۳ کی گولیاں، یعنی نمونیا کی دوا دیتا۔

لیکن وہ خود ٹھہرے اپنے وقت کے لقمان! انہوں نے پاؤ بھر گرم دودھ کے ساتھ اس کو ایک پیسے کے چھوہارے کھلا دئے تھے۔ اس وقت گو وہ چھوہارے اپنا کام کر گئے تھے، مگر اس کے بعد لگاتار غم نے اسے ایسا بخار چڑھایا تھا۔ جو پھر کبھی نہ اترا ـــــ اڑوسی پڑوسی سبھی جانتے تھے کہ ایک عرصے سے وہ دق کی مریضہ بن چکی ہے، لیکن رام داس کی تشخیص معمولی حرارت سے کبھی آگے نہ بڑھ پائی تھی۔ اور اس حرارت کے لئے ہزاروں امراض کے لئے تیر بہدف، ان کی وہی اکسیر کام دیتی تھی۔ ـــ اسے دونوں وقت پانی میں تلسی کے پتے رگڑ کر پلا دئے جاتے تھے۔ آج

تک وہی ان کی بیوی تھی، وہی چارپائی تھی، اور وہی تلسی کے پتے!

ملیا جب گرہست آشرم میں داخل کی گئی تھی، تو اس وقت اسکی عمر صرف نو برس کی تھی۔ کسی مغالطے میں انہوں نے اس کمسن لڑکی کو کسی ایسے چھوکرے کے پلّے باندھ دیا تھا، جو بڑا ہو کر حد درجہ اوباش اور نکھٹو ثابت ہوا تھا۔ اور اسی اوباشی کی وجہ سے، اس کے ایک قتل کے جرم میں دھر لئے جانے پر، ملیا عین جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ سسرال والوں کی تکلیفوں اور اذیتوں سے تنگ آ کر جب روتی پیٹتی وہ مائکے آئی تھی، تو انہوں نے اس کو اُلٹے پاؤں واپس بھیج دیا تھا۔ وہاں جا کر اس پر جب پھر وہی ستم ٹوٹنے لگے تھے، تو ان اذیتوں سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا، کہ کہیں بھاگ جائے۔ اور بارہا وہ اس کام کے لئے تیار بھی ہو جاتی تھی لیکن رام داس کے خوف کا تصور گھر کی چوکھٹ ہی پر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتا تھا۔

آخر وہ ظلم وستم اس کی زندگی کی خوراک بن گئے تھے۔ لیکن ان حالات میں بھی، جب وہ ماں باپ سے ملنے کے لئے کبھی مائکے آ جاتی تھی۔ تو اس کی بالکل وہی حالت ہو جاتی تھی، جیسے کوئی کنوئیں سے نکل کر کھائی میں گر جائے ——— اس کو بیوہ ہوئے اگرچہ ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اسے مائکے میں کوئی چمکیلا یا بھڑکدار کپڑا نہ پہننے دیا جاتا تھا۔ صرف سادہ، سفید رنگ کے کپڑے ہی پہننے کی اجازت تھی۔ اور وہ بھی میلے چیکٹ! پاؤڈر، لوینڈر اور کریم تو دور اس غریب کو سرمہ، مسّی اور دنداسے تک کی بھی سخت ممانعت تھی۔ ہاں دنداسے کی جگہ رام داس اس کو ہر روز نیم کی ایک داتن ضرور لا دیتے تھے۔ یا کبھی کبھی کوئلے کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی بخش دیتے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں ملیا کے سر میں خشکی نہ ہو جائے، ہر اتوار کو وہ خود اس کے سر کی مالش کر دیتے تھے۔ لیکن اس مالش کے بعد ان کے حکم کے مطابق ملیا کو کپڑے دھونے والے گھٹیا قسم کے صابن سے تین تین بار اپنا سر دھونا پڑتا تھا۔ تاکہ اس کے

بالوں میں کوئی تیل لگانا، دیکھ لے کنگھی کرنے کی اجازت انہوں نے ضرور دے رکھی تھی، لیکن وہ بھی رات کو سوتے وقت! وہ سوچتے تھے کہ رات کو کنگھی کرنے سے صبح تک بال پھر بکھر جائیں گے۔ اس طرح نہ تو اس کے بالوں میں الجھنیں پیدا ہو سکیں گی۔ اور نہ ہی لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ بیوہ بیٹی کو کنگھی پٹی کئے اِتنے پھرتے ہیں ــــ اور کسی سے ملنے کیلئے تو وہ خواب میں بھی نہ جا سکتی تھی!

رہی کملا ــــ ہربنس کی بیوی ــــ تو یہ سسرال ملتے ہی اس کی قسمت کے بھی دروازے کھُل گئے تھے۔ باپ کے گھر میں اس کو جس طرح نازوں سے پالا گیا تھا، اس طرح یہاں آ کر اس کو زندگی کے تلخ سے تلخ تجربات حاصل ہونے لگے تھے۔ صبح چار بجے اُٹھ کر اس کو پہلے تو تین چار آدمیوں کی روٹی کے لئے چکی پیسنا پڑتی تھی۔ اور دوپہر کو رسوئی گھر سے فارغ ہو کر سارے گھر کے میلے، گندے کپڑے بھی دھونے ہوتی تھی۔ رام داس اکثر کہا کرتے تھے کہ "خدا جانے یہ دھوبی لوگ کس مصالحے سے کپڑے دھوتے ہیں۔ ایک ہی دھلائی میں کپڑے کی آدھی جان اُتر جاتی ہے۔ اور چار دھلائیوں میں تو کپڑا کام ہی کا نہیں رہتا۔ ان کا یہ بھی ایک بلند پایہ سخن تھا کہ ــــ "مشینی آٹے نے ہندوستان کی نسلیں کمزور کر دی ہیں۔ جب یہ مشینیں ہمارے دیس میں نہ آئی تھیں، تو سارا ہندوستان ہیرے کی طرح جوان اور طاقت ور تھا،" رات کا کھانا بنا کر کملا کو ان کے اس مقولے کے مطابق کہ "بناؤ گے نہیں تو پہنو گے کیا!" آدھی رات تک چرخے کی گھوں گھوں سے بھی دل بہلانا پڑتا تھا۔

گھر تو گھر گلی محلے کی بھی کوئی عورت ان کے سامنے سے گزر جانے کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔ جب کبھی وہ باہر گلی میں کھڑے ہوتے تھے، تو کیا مجال کہ کسی کے سر سے دوپٹہ کھسک جائے، یا کسی کی نگاہیں اوپر اُٹھ جائیں! ایسے وقت میں اگر کسی کو باہر جانا بھی ہوتا تھا تو ان کی شرم اور خوف سے وہ یا تو گھر ہی میں رک جاتی تھی، اور یا اُسے

گلی کی دوسری جانب سے چکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا ـــــ ایک مرتبہ کوئی پڑھی لکھی، آزاد خیال لڑکی جب اس گلی میں کسی سے ملنے کے لئے آئی تھی، تو اس کا ننگا سر، نیم عریاں باہیں اور بکھری ہوئی زلفیں دیکھ کر وہ دانت پیس کر رہ گئے تھے۔ اور پھر آگے بڑھ کر انہوں نے اس لڑکی کے ساتھی کو واپس بلا کر اتنا کہہ ہی دیا تھا کہ ـــــ "دوپٹہ گلے میں ڈالنے کے لئے نہیں ہوتا، سر ڈھکنے کے لئے ہوتا ہے ـــــ ان ٹیڑھی مانگوں نے ہندوستان کو غلام بنا دیا ہے" اتفاق سے اس اجنبی کا میزبان اسی وقت وہاں آپہنچا تھا، نہیں تو خدا جانے کیا ہو جاتا!

گھر میں وہی سب سے پہلے اُٹھتے تھے۔ اور اس وقت ان کا پہلا کام یہی ہوتا تھا کہ اپنے ساتھ سارے گھر والوں کو جگا لیں۔ اگر نیند کی غفلت میں کبھی کوئی اُوں بھی کر دیتا تھا، تو اس کا کان پکڑ کر وہ اسے زمین پر کھڑا کر دیتے تھے۔ اور اسی وقت دو چار گرم گرم طمانچے رسید کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ اس سزا سے ان کی بیمار بیوی، تقدیر کی ماری ہوئی جوان بیٹی اور بانجھ بہو بھی مستثنیٰ نہ تھیں۔

ہر روز دونوں لڑکوں کو وہ قصبے کے باہر، ایک پرانے کنوئیں پر نہانے کے لئے لے جاتے تھے۔ جس میں گرمی، سردی کبھی حائل نہ ہو سکی تھیں۔ دونوں لڑکوں کو کنواں چلانے پر لگا کر پہلے تو وہ خود نہاتے تھے۔ اور پھر ان دونوں تھکے ہاروں کو باری باری کنواں چلا کر نہانا پڑتا تھا۔ جب کبھی سردیوں میں وہ کسی لڑکے کو نہانے سے کتراتے یا اس کام سے جلدی فارغ ہوتے دیکھ لیتے تھے، تو وہ دوبارہ اس کے کپڑے اُتروا کر اسے ٹھنڈے، برفیلے پانی کی دھار کے نیچے بٹھا دیتے تھے۔ اور دوبارہ نہلانے کے علاوہ، اس کو دس بیس منٹ سزا کے طور پر زیادہ نہلایا جاتا تھا۔ صرف اپنے لڑکوں تک ہی نہیں بلکہ گلی کے بچے بڈھوں، وہ سبھی سے یہی کہتے تھے کہ "صبح سویرے نہانے سے کوئی روگ نہیں رہتا۔ سات میل کی سیر اور ٹھنڈے پانی سے نہانا سب

بیماریاں دُور کردیتا ہے۔ انسان اگر ان دونوں باتوں پر کاربند رہے تو موت بھی اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی —— میں پینتیس سال سے یہ دونوں کام کر رہا ہوں، اور کیا مجال کہ آج تک کبھی حرارت بھی ہونے پائی ہو۔"

اس سیر اور غسل کے بعد گھر آکر پوجا پاٹھ کا دور شروع ہوتا تھا۔ بھاگوت گیتا کی تین جلدیں انہوں نے شائد اس خیال سے خرید رکھی تھیں کہ کسی کو اس کام میں پیچھے رہنے کا بہانہ نہ مل سکے۔ پہلے وہ دونوں لڑکوں کے پاٹھ کی نگرانی کرتے تھے، اور پھر اپنی تیسری گیتا لے کر بیوی اور بہو کو پڑھانا شروع کر دیتے تھے۔ یا جب کبھی مایا یہاں آئی ہوتی تو اسے بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔ چونکہ وہ سب کی سب ان پڑھ تھیں، اس لئے وہ خود آگے آگے پڑھتے تھے اور وہ دونوں تینوں ان کے ساتھ ساتھ انہی الفاظ کو دہرایا کرتی تھیں۔ اگر کوئی بھی کسی لفظ سے چوک جاتی تھی، تو بھاگوت چھوڑ کر وہ اپنی "گیتا" سنانے لگتے تھے ——

جب انہوں نے گھر میں یہ کام شروع کیا تھا، تو دیکھنے والوں کو ان لمحوں میں ان کا گھر پہلی جماعت کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ ان نادان چھوکروں سے وہ بالکل پہلی جماعت کے مغز مار استاد کی طرح سر کھپاتے رہے تھے۔ اور مغز پچی سے اکتائے ہوئے اُستاد ہی کی طرح، اُنہوں نے کئی بار اپنے دونوں لڑکوں کو چپتوں سے اُڑا دیا تھا۔ دو ایک مرتبہ تو بہو اور بیوی بھی اس سزا سے نہ بچ سکی تھیں۔ ہاں، اتنا ضرور تھا کہ شہتوت کے درخت سے توڑی ہوئی ایک باریک چھڑی صرف لڑکوں ہی کے لئے موقوف تھی —— آہستہ آہستہ استاد کی مار کھا کھا کر اب سبھی گھر والے اس کام میں چل نکلے تھے۔

رات کو سوتے وقت کبھی کبھی وہ سارے گھر والوں کی تلاشی ضرور لے لیا کرتے تھے۔ کسی کی جیبیں ٹٹول، کسی کی الماری دیکھ! کسی کا صندوق اور کسی کا کچھ! اگر کہیں

سے ذرا بھی کوئی ایسی ویسی چیز نکل آتی تھی، تو وہ برآمد گی، ناجائز اسلحہ کی برآمدگی سے کم اہمیت نہ رکھتی تھی ـــــ ایک بار انھوں نے رات کے گیارہ بجے ہربنس کو اٹھا کر اپنے "شلوک" سنانا شروع کر دئے تھے ـــــ "گیتا کے بجائے اب فوٹو پوجنے لگے ہو سالے؟ بات یہ تھی کہ دو چار سال پہلے جب ہربنس پہلی بار سینما دیکھنے گیا تھا، تو اور لوگوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی چھ پیسے میں 'لیلا چٹنس' کا ایک فوٹو خرید لایا تھا۔ اور ان کے ڈر سے اس نے وہ فوٹو اپنی بھاگوت گیتا میں رکھ چھوڑا تھا۔ اگرچہ ہر روز وہ فوٹو کو پڑھنے والے اوراق سے ادھر ادھر ہٹا دیا کرتا تھا، لیکن اس رات اتفاق سے بھاگوت گیتا زمین پر گر پڑی تھی۔ اور رات کو الماری میں رکھتے وقت انھوں نے وہ فوٹو دیکھ لیا تھا ـــ ہربنس مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ اور وہ غصّے کے جوار بھاٹے میں بہ کر اس پر برستے رہے تھے کہ "سالے! جب تمہارے پاس جیتی جاگتی بیوی موجود ہے تو یہ فوٹو تمہیں کیا کام دے سکتا ہے! اور پھر اگر یہ فوٹو ہی رکھنے تھے تو تم نے شادی کیوں کرائی تھی؟ میں تو سوچتا تھا کہ اب تم اپنے آپ بھاگوت کا پاٹھ کرنے لگے ہو، لیکن یہاں فوٹو کی مالا جپی جا رہی ہے۔" انھوں نے اس وقت وہ فوٹو جلا کر ہربنس کو جو سزا دی تھی، وہ کورٹ مارشل کی سزا سے شاید کم نہ تھی ـــــ آدھی رات کے وقت پورے دو درجن بید!

دالان میں دو گھنٹے تک چکّر لگانے کے باوجود ان کا غصّہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ابھی تک اسی طرح چکّر کاٹ رہے تھے اور شیام چرن وہیں ڈیوڑھی میں کھڑے اس "ہٹلر" کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے یہ سارے واقعات گھوم گئے ـــــ باہر گلی میں آہٹ ہوئی اور کتّا بھونکنے لگا۔

"دیکھو تو شامو، آیا نہیں وہ سالا!"

شیام چرن نے دیکھا ـــــ گلی میں سے مویشی گذر رہے تھے، اور بابو رام داس کے
کھونٹے سے بندھے ہوئے مویشی بھی اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ملنے کیلئے رسّی تڑوانے کی
ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اچانک شیام چرن کی نگاہیں اس کھونٹے پر مرکوز ہو گئیں۔
یہ کھونٹا رام داس نے آٹھ فٹ لمبی اور گیارہ انچ موٹی لکڑی سے خاص طور پر تیار
کرایا تھا۔ اور اپنی گائے باندھنے کے لئے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے چھ فٹ
تک زمین میں گاڑ دیا تھا۔ تاکہ ان کی گائے بھاگ نہ سکے۔ مگر اب تو ان کی گائے کو مرے ایک
عرصہ گذر چکا تھا۔ اور اسکے بجائے اب گلی کے دو ایک آدمیوں کی چند گائیں بھینسیں اس سے بندھی تھیں
وہ مویشی بھاگنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، لیکن وہ کھونٹا انہیں اپنے ساتھ جکڑے
جوں کا توں زمین میں گڑا تھا ـــــ کھونٹا!!

—— × ——

خلیق ابراہیم

پیدائش: حیدرآباد دکن، ۱۹۲۱ء
تعلیم: بی اے، آنرز ان اُردو۔
موجودہ پتہ: جھوائی ٹولہ، لکھنؤ۔

اس دَور میں جس سے میں آج کل گذر رہا ہوں اپنے ماضی کے سیاہ پردوں کو چاک کرکے آپ کو دعوتِ نظارہ دینا میرے بس کی بات نہیں!

تاہم، اگر آپ کسی نہ کسی انشائیے کے منتظر ہی ہیں تو غالباً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ گو "بال و پر" نہیں رکھتا لیکن "مذاقِ پرواز" کا حامل ضرور ہوں اور شاید اسی وجہ سے کبھی کبھی اپنی زندگی کا ثبوت دیتا رہتا ہوں!

سیاسی اعتبار سے "مارکسزم" کو انسانیت کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتا ہوں، اسی لئے کچھ دن تک لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار جریدہ "آگ" نکالتا رہا۔ پھر تعلیم کے سلسلے میں دہلی اور لاہور گھوم آیا۔ اپنی ذہنی اُفتاد کے باعث بہت سی آسائشوں کو ٹھکرایا اور تکالیف اور زحمتوں کا بخوشی سودا کیا۔ کچھ عرصے تک قبلہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب آنریری سیکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کے ذاتی معاون کی حیثیت سے کام

کرتا رہا، لیکن اِس تین چوتھائی سامنتی شہر کی گلیوں میں، جہاں سے میں آپ کو یہ سطور تحریر کر رہا ہوں نہ جانے کیا ایسی کشش تھی کہ کولھو کے بیل کی طرح گھوم گھام کر پھر یہیں آموجود ہوتا۔

اب حالت یہ ہے کہ اس شہر سے نفرت ہو گئی ہے۔ یہاں کا ذرّہ ذرّہ مُنہ چڑاتا اور مضحکہ اُڑاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ابھی چند روز اُدھر جب میں یہاں سے کچھ دن غیر حاضر رہ کر واپس لَوٹ رہا تھا۔ تو ٹرین نے جب دلکشا کیبن کو چھوڑ دیا۔ اور چار باغ جنکشن کی سُرخ سُرمئی بُرجیوں کو غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی حسین طلائی کرنیں الوداعی بوسے دیتی ہوئی نظر آئیں۔ تو میں بے ساختہ مجاز کی وُہ نظم گنگنانے لگا ——— "رخصت اے ہمسفرو شہر نگار آہی گیا!"

آکاش کے ادھر!

کالج چھوڑنے کے بعد رمیش سے کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ملازمت کے سلسلے میں دہلی چلا آیا اور اس نے لاہور ہی میں اپنا اسٹوڈیو کھول لیا۔ وہ مصوّر تھا اور اُس کے مزاج و طبیعت میں وہ تمام وارفتگی، خود فراموشی اور اک مبہم سا انجان پن رچا ہُوا تھا جو سب ذہین آرٹسٹوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ خط پتر کی تو اُس سے قطعی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لئے کہ ایسی غلطیوں کا وہ شاذو نادر ہی مرتکب ہُوا کرتا۔ لیکن اس کی ایک حرکت سے ہم سب ناراض تھے۔ ہم سب سے میری مراد وہ تمام دوست ہیں۔ جنہیں رمیش سے کچھ لگاؤ تھا۔ اور جو کالج کے زمانے میں یاجوج ماجوج کی طرح اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ وہ حرکت یہ تھی کہ اُس نے بغیر ہمیں اطلاع کئے ہوئے شادی کر لی۔ ہم لوگ اتنے گئے گذرے بھی نہیں تھے کہ رمیش ایسے دوست کی شادی میں نہ شریک ہوتے اور اس کی بیوی کے لئے خوشنما اور سجیل تحائف نہ لے جاتے۔ اُس نے مجھے ایک خط ضرور لکھا جس میں اپنے رومان اور شادی کا مختصر ذکر کیا تھا۔ لیکن ایک تو خط شادی ہو جانے کے بعد لکھا گیا۔ دوسرے اس میں میرے پہلے سے مدعو نہ کرنے کی نہ کوئی معذرت تھی اور نہ آئندہ کے لئے کوئی بلاوا۔ اس لئے مجھے بجائے خوشی کے اور چڑ سی ہوئی۔

اس نے لکھا تھا ——— نازو (وہ پیار سے مجھے ہمیشہ نازو کہا کرتا) تم بہت زیادہ خفا ہوگئے پیارے، لیکن دیکھو نا میں اِس تمام عرصے کس قدر بیمار رہا۔ مجھے تو اُلٹی تم سے شکایت ہے کہ کوئی خیر خبر نہ لی۔ اور اُف یہ کمبخت بیماری اگر گوشت پوست کی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی، یہ تو کوئی بہت ہی شدید روحانی مرض تھا۔ دل دھڑک رہا ہے، دماغ کو ایک سیکنڈ کے لئے چین نہیں۔ مَیں تو اس ذہنی کشاکش سے عاجز آ گیا ہوں ———" یہ کوئی نیا مرض نہ تھا۔ رمیش نے میرے ساتھ جب گورنمنٹ کالج کی الیف۔ اے کلاس میں داخلہ لیا ہے جبھی سے وُہ وقتاً فوقتاً ایسے ذہنی اور دماغی امراض میں مبتلا رہتا۔ ہر وقت سوچ رہا ہے۔ ساتھی ہنسی مذاق کر رہے ہیں اور آپ گم سُم جانے کِن خیالات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں تو اُس کے اس خواہ مخواہ کے تفکّر سے عاجز آ گیا تھا۔ خیر تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اس قسم کی بیماری اُس کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی اور جب کبھی وہ اس کا ذکر کرتا مجھے چڑ سی ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو سوچتے رہنا، ذرا ذرا سی بات کو شدت سے محسوس کر لینا، آسمان پر خیالی گھروندے بناتے رہنا۔ سچ پوچھئے مجھے تو اِن سب باتوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ ایسا بھی تفکر اور زُود احساسی کس کام کی۔ اچھی خاصی خود فریبی تھی۔ ہاں تو آگے لکھا تھا:۔

"یقین مانو نازو مرض کی شدت اِس درجہ بڑھ گئی تھی کہ سوائے خودکشی کے میرے لئے اور کوئی علاج باقی نہیں رہا تھا۔ اور شاید میں جلد ہی پھول کی خوشبو کی طرح اُس وسیع خلا میں گم ہو جاتا جس کے دُھندلکوں میں مَیں نے اپنی بعض بہترین اتصاویر کے پس منظر کے لئے انتہائی شوخ اور نہایت سادہ رنگ دریافت کئے تھے کہ عین اسی وقت اُمید کے اُفق پہ ایک جھلجھلاتا ہوا تارہ چمکا اور یہ میری بیوی رنملا تھی، اس سے میری ملاقات ایک فنکشن (FUNCTION) میں ہوئی جہاں میری تصاویر کی نمائش کی گئی تھی۔ جاڑوں کی سہ پہر تھی، سفید ہلکی ولائی جیسی دھوپ جس میں سے معلوم ہوتا تھا ساری گرمی نچوڑ لی گئی ہے۔ دیواروں کی

بالائی گمٹیوں اور درختوں کی پھنگیوں پر چڑھ چکی تھی۔ چائے کی میز پر وُہ بالکل میرے سامنے تھی میری کسی تصویر کا ذکر تھا، کہ یکایک سیاہ پلکوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی اور وُہ نشتر یا پلکیں اس طرح اٹھیں جیسے کوئی رقاصہ توڑا لے کے بیٹھے اور ایک انداز دلربائی سے آہستہ آہستہ اُٹھے۔ یہ بھی برداشت کر جاتا۔ لیکن جب پتلیاں نمودار ہوئیں تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جادو جگا دیا ہے۔ آناً فاناً وسطِ چشم میں ٹھہر کر میری آنکھوں سے چار ہوئیں۔ میری آنکھوں سے چار ہونا تھا کہ ایک چکر کے ساتھ گوشۂ چشم میں جا کر ٹھہر گئیں۔ اِس نگاہ کے ساتھ لبوں کے گرد ایک خفیف سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اِس نگاہ اور تبسّم سے مِل کر ایسا بُت بنا اور ایسے کفرِ زیبا کی نمود ہوئی کہ سجدے میں گرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ قلب و ذہن اک ایسی گرمی سے بھرپور ہو گئے جو باوجود زمانے کی سرد و تلخ نگاہوں کے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ اِک دائمی آگ اِک سُنہری اور روشن آگ! سُنو، میری نرملا عام سوسائٹی گرلز (SOCIETY GIRLS) کی طرح نہیں ہے۔ بڑی ہی معصوم، بڑی ہی پاکیزہ لڑکی ہے۔ چند ملاقاتوں کے بعد ایک روز مَیں نے بہت ڈرتے ڈرتے اُس سے کہا۔ نرمل! تم آج بہت اچھی لگ رہی ہو۔ وُہ مُسکرا دی۔ مَیں نے پُوچھا تم مُسکرائیں کیوں؟ کہنے لگی، میرا دل، دل تو ہے۔ مگر مُسکرانے پر کیوں مائل ہُوا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی، مَیں نے ذرا زور دے کر کہا۔ وجہ ہو یا نہ ہو، آپ کو پوچھنے کا کونسا حق ہے؟ اُس کے لہجے میں بناوٹی درشتی تھی۔ حق! میں نے کہا حق تو تمہارے مُسکرانے سے حاصل ہُوا۔ نہ تم مُسکراتیں نہ مجھے یہ سوال کرنے کی جرأت ہوتی۔ عورت نے ہنس کے بات کی کہ مرد کو گوناگوں حقوق حاصل ہو گئے، آپ اس خیال میں بھی نہ رہئے گا، وُہ بولی، وُہ انیسویں صدی کی عورتیں تھیں جن کے تبسّم سے مرد حقوق حاصل کر لیتے تھے۔ اُن کے ذرا سے مُسکرا دینے سے مردِ شوق کے قدم آگے بڑھاتے تھے۔ یہاں تک کہ پیش دستی اور دست درازی پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ان کی مسکراہٹ کو پیامِ بوس و کنار خیال کر لیتے تھے۔ مَیں پوچھتی ہُوں آخر آپ مرد یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ عورت مرد کے

بوس وکنار کی بھوکی ہے۔ بیسویں صدی کی عورت اپنی زندگی کو جذبات کے جامے میں پھنسانا کبھی پسند نہیں کر سکتی۔ وہ اِن کپڑوں کو بہت پہن چکی ہے اور ان کی خامیوں سے بخوبی واقف ہے، ——————— دیکھا نازو! "ہنسی اور پھنسی" والا مقولہ میری نرملا پر کبھی صادق نہیں آسکتا۔ تو نرملا اب میری بیوی ہے اور میری حالت یہ ہے کہ ؎

"فرشِ پری وشاں پہ اڑا جا رہا ہوں"

آمدنی بہت قلیل ہے۔ تم جانتے ہی ہو ہم آرٹسٹوں کی بسر اس ناقدری میں کس طرح ہوتی ہے۔ کل لاہور چھوڑ کر ہم لوگ بمبئی جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہاں ایک بہت بڑے انگریزی ماہنامے کی تصاویر تیار کرنے کے سلسلے میں مجھے ملازمت مل گئی ہے اپنا الگ کام بھی کر سکوں گا۔ بہت شاندار نہ سہی، یہاں سے بہتر ہی حالت رہے گی۔ پھر نرملا کے ساتھ تو جہنم بھی جنت ہے"

اِس خط کو بھی پورے دو سال ہو گئے۔ اِس تمام عرصے میں مجھے رمیش کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ابھی چند روز ہوئے میں ایک دفتری کام کے سلسلے میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ بمبئی پہنچ کر رمیش کا خیال آیا۔ اتنے بڑے غدار شہر میں بھلا کون کسی کو ڈھونڈ سکتا ہے۔ رسالوں اور اخباروں کے دفتروں میں جا کر پوچھا، وہاں بھی کوئی پتہ نہ لگ سکا۔ میں بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اور دوسرے روز دہلی واپس آنیوالا تھا۔ شام کو میرے ایک شناسا جو بمبئی کے نامور سیٹھوں میں سے تھے۔ مجھے اپنے کلب پکڑ لے گئے۔ ذرا ہی دیر ہم ساتھ بیٹھے تھے کہ اُن کی ایک معشوقہ تشریف لے آئیں۔ اور وہ تھوڑی دیر میں واپس آنے کا وعدہ کر کے اُن کے ساتھ چلتے ہوئے۔ میں کچھ دیر تو وقت ٹالتا رہا۔ پھر کوئی کھانے کی چیز منگالی اور آہستہ آہستہ شغل کرنے لگا۔ سامنے ایک گدبدا سا ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کے سامنے وسکی کی ایک بوتل اور دو تین گلاس رکھے تھے۔ جب وہ دو تین پگ چڑھا چکا، چہرے پر سرخی آئی اور رگوں میں خون کی رفتار تیز ہوئی تو خاموش اور اکیلا نہ بیٹھا گیا۔ اُٹھ کر میرے پاس آیا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اس مقام پر تنہا اور خاموش بیٹھنا معصیت ہے۔ آپ کیا

تماشہ دیکھ رہے ہیں؟ اپنے تماشے میں آپ مجھے شریک کیجئے۔ یا پھر میرے تماشے میں شریک ہو جائیے؟

میں اُٹھ کر اُس کی میز پر چلا گیا۔ اُس نے مجھے بھی شراب پیش کی۔ مجھے منشیات سے بالکل پرہیز نہیں، گاہے ماہے استعمال کر لیتا ہوں۔ چنانچہ رسمی انکار کے بعد میں نے جام لے لیا۔ اور آہستہ آہستہ پینا شروع کیا۔ وہ کہنے لگا آپ شمالی ہندوستان کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں میرا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ خیر آپ کون ہیں میں کیا ہوں فی الوقت ہمیں اس سے کیا غرض، یہاں کا لطف اٹھانا اس وقت کا سب سے اہم فریضہ ہے۔ ہر میز پر دیکھئے ایک ایک مہ جبین بیٹھی ہوئی ہے اور اپنے چاہنے والوں کا دل خوش کر رہی ہے۔ یہ سب ہماری آپ کی ہی بیویاں ہیں" پھر ذرا دیر تک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا " ایک عورت سے بھی گھر پہ کہاں تک سیری حاصل کی جائے؟"

میں کچھ افسردہ سا تھا۔ اس وجہ سے اور بھی کہ خود میری جانِ معاشقہ دہلی میں ناکام سی ہوتی نظر آ رہی تھی۔

میں نے کہا " ان میں سے کتنے ہیں۔ جن کے پہلو میں دل ہے۔ جب دل ہی نہیں تو خوش کرنے کا سوال کب باقی رہتا ہے؟"

"اوہ یہ سوال تو بہت گہرا ہے" اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا " جب سطح پر ہمیں زندگی کے لطف حاصل ہو جائیں۔ تو زندگی کی عمیق باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟"

پھر تھوڑی دیر رُک کر بولا " اُس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں آپ، وہ بائیں طرف۔ کیسی پیاری لڑکی ہے۔ ایک روز اس کے ساتھ بہت اچھا بہت ہی اچھا وقت گزرا۔ اس کو شاید خیال ہے کہ میں نے اپنا سارا روپیہ اُس روز صرف کر دیا"

یہ کہہ کر اُس نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور پھر یوں گویا ہوا۔ " ہم روپے والے

بعض وقت اس خیال سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ کہ ہماری دولت کس کام کی جب ہماری زندگی مزے سے بے بہرہ ہو گئی ہو۔ مزدوروں کی ہڑتالوں، ٹریڈ یونینوں کے جھنجالوں سے آزردہ خاطر ہو کر شام کو کلب آتے ہیں۔ تاکہ زندگی کا پتھرپن اور لوہے کی ایسی سختی تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی دُور ہو جائے۔ عورت کا حسن اس سختی اور سنگینی کو دُور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا ملائم جسم جب اپنے جسم سے مس ہوتا ہے تو رگوں میں خون پھُدکنے لگتا ہے۔ آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں۔" اُس نے ایک جرعہ لیتے ہوئے کہا:۔

"دیکھئے ایک گُر کی بات بتاؤں۔ جب کسی عورت کی صحبت کا لطف اٹھانا ہو تو دس پانچ پگ اچھی شراب کے ضرور پی لیجئے۔ تاکہ اُس کے حسن کا اثر شراب کے نشے کے ساتھ زائل ہو جائے۔ اگر یہ باقی رہا تو سیدھا دماغ پر پہنچے گا۔ اُسے پریشان کرے گا اور تمام کاروبار خراب اور ستیاناس ہو جائے گا۔ کسی حسین عورت کو دیکھتے ہی فوراً یہ فکر ہونی چاہئے کہ اس کے جسم سے لذت اٹھائی جائے۔ حسن کے خیال کو اپنے دماغ کی گہرائیوں میں جانے دینا بہت بری بات ہے۔ حسن زہریلا سانپ ہے اور اُسے آپ جانتے ہیں کون سی غذا مرغوب ہے اور اُس کے لئے مقوی بھی؟ انسان کے دل و دماغ کا اندرونی حصہ! عورت اگر بیوی ہے تو بزنس (BUSINESS) کا برتاؤ کیجئے۔ اگر دل بہلانے والی ہے تو کھلونا سمجھئے کسی صورت میں اُس کے حسن کو اپنے دماغ میں جگہ نہ پکڑنے دیجئے۔ ذہن نے حسن کی لپک پائی کہ آگ پکڑ لی اور زندگی کی تباہی شروع ہوئی۔ لیجئے ایک پگ اور"―――― وہ پورے طور پر پُرجوش تھا۔ میں اس کی سبق آموز باتیں سنتا جا رہا تھا۔ ابھی سنتا کبھی عبرت پکڑتا تا کہ وہی لڑکی ہماری میز کی طرف آئی جس کی جانب میرے ساتھی نے ابھی اشارہ کیا تھا۔ اُس کے دوسرے ساتھی اُٹھ چکے تھے۔

میرے دوست نے بڑے چاؤ سے اُٹھتے ہوئے کہا "تم آگئیں میرے دل

میں آرہا تھا کہ تمہیں اُس میز پر سے گھسیٹ لاؤں۔ اِن سے ملو۔ یہ میرے نئے دوست ہیں۔"
ہم نے خندہ پیشانی سے ہاتھ ملائے۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے اُسے چوبیس پچیس سالہ قبول صورت لڑکی جس کی آنکھوں میں گئی گزری حیا کی ایک آدھ لہر اب بھی اِس طرح جھلک دے جاتی جیسے دُور افق پر کوئی تارہ ٹوٹا ہو۔
میرے دوست نے پوچھا۔ "کیا تم انہیں پہلے سے جانتی ہو؟"
"میں تو ہر نئے آدمی کو غور سے دیکھتی ہوں۔" وُہ سنجیدگی اور مزاح کے ملے جُلے اثرات اپنے چہرے پر پیدا کرتے ہوئے بولی۔ "تاکہ اُسے بیک نظر پہچان سکوں۔"
ہا ہا ہا — ہا ہا ہا — وُہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تم دیکھ رہی ہو گی۔ یہ اِنسان کہاں تک ہیں اور حیوان کہاں تک؟!"
"انسانیت اور اسی قسم کی بے معنی باتوں کے لئے تو نئی تہذیب نے گرجوں، مندروں اور مسجدوں کو الگ کر دیا ہے۔ انسانیت، رُوحانیت، ترس، مُروّت، ہمدردی، عشق و محبت یہ سب چیزیں زندگی کی ساخت میں شامل نہیں ہیں۔ زندگی سخت اور صلب چیز ہے۔"
اُس نے ایک انگڑائی لی۔
"کیا فلسفہ بیان کیا ہے تُم نے۔" میرے دوست نے اُسے نیم آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔ "جب زندگی کا قوام تیار ہونے لگتا ہے تو ابال کے وقت یہ بُلبُلے اُٹھتے ہیں۔ اِس جوش و اُبال کو کفگیر سے چھانٹ کر الگ کر دینا پڑتا ہے۔ حسین عورت کے لبوں کا ایک گرم و عمیق بوسہ (اُس نے اس لڑکی کے گال کو کاٹتے ہوئے کہا) اُس کے اُبھرے ہوئے سینے کو ایک مرتبہ اپنے مرتعش جسم سے مس کر لینا اس پر دُنیا کے پورے آرٹ کا ذخیرہ صدقے ہے۔ تمام عشق کے قصے حُسن کی داستانیں ننانوے ہیں۔"
اُس نے لڑکی کو پورے طور پر دبوچ لیا۔ اور پے در پے بوسے لینے لگا۔ وُہ پورے طور پر مست تھا۔ میری طبیعت برابر مکدّر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے جانے کی اجازت چاہی

لڑکی نے کہا "ہم بھی چلتے ہیں۔ یہاں گرمی بہت ہے۔ کھلی ہوا زیادہ خوش گوار ہوگی۔"
باہر آکر ٹیکسی کی گئی۔ مجھے زبردستی بیٹھنا پڑا۔ میرا مالدار دوست لڑکی سے مخاطب ہوا
"ہاں تمہارے پاگل شوہر کا کیا حال ہے؟"
"بدستور" وہ ہنستے ہوئے بولی "چاہتا ہے کہ بمبئی ایسے شہر میں میں دو سو کی آمدنی میں اُس کے ساتھ گزارا کروں۔"
"ایک بات ہے۔" وہ بولا "آدمی ہے نیک۔ تم سے کوئی باز پُرس نہیں کرتا۔"
"اُسے مجھ سے اُلفت اتنی ہے کہ کبھی کوئی بات میرے خلاف اُس کے ذہن میں آتی ہی نہیں۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔ "پھر اُسے اپنی تخیل آرائی اپنی دماغی کاوش ہی سے کب فرصت ہے جو ان باتوں پر غور کرتا پھرے۔ وہ تو ہمہ وقت آکاش کے پرے اُڑتا ہوا حسین سپنوں کے جال بنتا رہتا ہے۔ اُس کے دشمنوں کو بھی خبر نہیں کہ میں کلب آتی ہوں۔"
"بڑی شریر ہو۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور اُسے گدگدانے لگا۔ پھر دست درازیاں شروع کر دیں۔ پیار پر پیار، لپٹانا، چمٹانا اور عجیب عجیب ناگفتہ بہ حرکتیں کرنے لگا۔
وہ کہنے لگی "دُنیا بغیر دولت کے ہیچ ہے۔ پیارے تمہاری دولت نے تمہیں پیارا بنا دیا ہے۔ تم پر جانورپن بھی زیب دیتا ہے۔ تمہاری بہیمیت میں بھی ایک حُسن ہے۔ تمہاری چاہ دولت ریز ہے۔ تمہارے پیار میں اشرفیوں کی چھنک اور چمک ہے۔ وہی جھنکار وہی سُنہری آگ۔"
میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے زبردستی کار رکوائی اور اتر پڑا۔ لڑکی نے بھی رُخصت چاہی۔ میرے ادھیڑ دوست کی گرمی بھی شاید ختم ہو چکی تھی کہ اُنہوں نے لڑکی کی لجاجت پر اُسے چھوڑ دیا۔ اور نوٹوں کی گڈی تھما دی۔
میں اس فکر میں تھا کہ سڑک پر پہلا موڑ ملے تو اس لڑکی سے چھٹکارا حاصل کر دوں کہ وہ میرے بازو کا سہارا لیتے ہوئے بولی "تم سمجھتے ہو مجھے اس خبیث بڈھے سے محبت ہے؟

نہیں نہیں میرے پیارے۔ دیکھو آج اُس نے مجھے دو سو روپے دے ڈالے ہیں۔ الّو کہیں کا ——— تم جوان ہو، خوبصورت ——— میں کل تمہارے ساتھ مفت رات بسر کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تم مالدار نہیں۔ ہاں ہاں تمہاری صورت کہہ رہی ہے میں نے ایک طرف مڑنا چاہا۔ وُہ مجھے بازو سے گھسیٹتے ہوئے بولی: "مجھے گھر تک تو چھوڑ آؤ۔ اِس اندھیری رات میں!"

خُدا خدا کر کے اس کا گھر آیا۔ ایک فلیٹ پر اُس نے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی: "بڑی رات کر دی۔ میں تمہارا بے چینی سے منتظر تھا"

"ہاں پیارے! شیلا نے کسی طرح کھانا کھائے بغیر آنے ہی نہ دیا۔ بڑی شریر ہے۔ کہنے لگی جیجا جی کو خوب سا انتظار کراؤں گی۔" وُہ ہولے ہولے ہنسی۔

دروازہ کھُلا۔ ایک تپلی لمبی برقی شعاع باہر سڑک پر آ گری۔ میری نظریں جستجو یانہ دروازے کے اندر داخل ہوئیں۔ ارے یہ تو رمیش تھا۔ وہی لمبے لمبے بال، وہی سُتا سُتا سا چہرہ، وہی کھوئی کھوئی آنکھیں جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہوں۔ میں فوراً ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ——— اندھیرے میں تاکہ وُہ پہچان سکے!

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

وُہ اب کیا آتی !! ——— اور حقیقت میں وہ اس دن نہیں آئی ! وُہ ہے کون اور کب آتی ہے ——— آتی ہے کہ ادھر سے گذرتی ہے، یہ بات بتانے کی نہیں، ابھی تو محض چھیڑ چلی جاتے ہے۔

جب اس کے گذرنے کا وقت گذر گیا تو میں نے سوچا شاید کوئی خط آجائے ——— کِس کا؟ چمن کا، یہ کالج کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ پندرہ کے بعد لکھیں گے کہ آئندہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا۔ گریجویٹ ہونے کے بعد مستقبل کی بابت سوچنا ہی پڑتا ہے۔ ان کے وعدہ کا مجھے خیال آیا ہی تھا کہ چند منٹ بعد ڈاکیہ دبے پاؤں آیا۔ بارش ہو چکی تھی اِس لئے اس کے قدموں کی چاپ سُنائی نہیں دی۔ جس کو مَیں پہچان لیتا ہوں۔ یوں تو وہ پڑوس کے ایک مکان پر تقریباً ہر روز آواز دیتا ہے اور یہ آواز اس کی آمد کے اعلان کے ساتھ یہ خیال بھی بندھا دیتی ہے کہ شاید وہ ادھر آنکلے اور ۱۶ جولائی کو وہ آہی گیا اور جو خط اس نے مجھ تک پھینکا وہ چمن کا خط تو نہیں نکلا۔ بلکہ بشیر ہندی کا کارڈ تھا۔ فرمائش تھی کہ جو مجموعہ وہ ترتیب دے رہے ہیں اس کے لئے مَیں خود نوشت سوانح حیات اور اپنا پسندیدہ افسانہ جلد بھیج دوں

اِس لئے کہ ان کے خیال میں مَیں ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہوں۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا مَیں اس اعزاز کا مستحق ہوں ؟ بار بار دماغ میں یہ سوال ابھرا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک ہفتہ بعد مَیں نے بشیر صاحب کو خط لکھا کہ وہ کس عقلمند کی رائے سے مجھے افسانہ نگاروں میں اور وہ بھی ترقی پسند افسانہ نویسوں میں شامل کر رہے ہیں۔ جواب میں انہوں نے مجھے بھی اپنی تالیف بنا دیا، ان کا اصرار ہے کہ بواپسی ڈاک اپنا حال اور افسانہ بھیج دوں۔ سوچتا ہوں موقعہ اچھا ہے کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاؤں۔ ایسا موقعہ بار بار تو نہیں آیا کرتا اور اس کے پر ہوتے ہیں، پکڑو نہیں تو اُڑ جاتا ہے ——— سو اس کو ان صفحات میں بند کئے دیتا ہوں۔

پہلا کارڈ جس دن آیا تھا اس روز کی طرح مَیں دوسرے کارڈ کے آنے کے وقت بھی اس مکان کی بیٹھک میں بیٹھا تھا جس میں ہم کرایہ پر رہتے ہیں، یہ مکان مولانا شوکت علی کے بعد ان کے صاحبزادے زاہد صاحب کی ملکیت ہے اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس لئے نہیں کہ اس میں عزت رہتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ علی برادران کے طفیل اس میں کبھی گاندھی جی، پٹیل، راجگوپال آچاریہ اور سروجنی نیڈو قیام کر چکی ہیں ——— شوکت صاحب کی لڑکی سلطانہ کی شادی کی تقریب میں ——— میرے دن کا زیادہ حصہ اسی بیٹھک میں بیٹھے بیٹھے گذر جاتا ہے اور خصوصاً گذشتہ چار ماہ سے، جب سے مَیں بیکار ہوں۔ زمانۂ جنگ میں اپنے آپ کو بیکار بتانا گالی دینے کے مترادف ہے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ اپنی تحریروں کی خاطر مجھے ہمیشہ نقصان اُٹھانا پڑی۔ ریاستوں میں تحریر و تقریر کی جو نام نہاد آزادی ہے اس کی قربانگاہ پر میری ملازمتوں کو بھینٹ دیا گیا، ہُوا یہ کہ اسکول ماسٹر ہونے کے ساتھ ہی

ساتھ، ایک امتحان مقابلہ میں کامیاب ہونے کے بعد، مَیں روزنامہ "ناظم" میں مترجم کی حیثیت سے بھی کام کرنے لگا۔ سیکرٹری تعلیمات کے ایک حکم پر کہ کوئی استاد ان کی اجازت بغیر ٹیوشن، مضمون نگاری اور نامہ نگاری نہ کرے، مَیں نے تبصرہ کیا، ایڈیٹر نے اس کو شائع کر دیا اس کو تحریر کرنے کی پاداش میں پہلے اخبار اور پھر اسکول کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا، پھر ڈیڑھ ماہ ایک کارخانہ میں ملازم رہا۔ اُس کے بعد سے خالی بیٹھا کرسی توڑتا رہتا ہوں۔

یہی بیٹھک ہے جہاں بیٹھ کر مَیں نے ٹینی سن کی نظم "اینک ارڈن" کا ترجمہ صاف کیا تھا۔ یہ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے، گرمی کا موسم تھا، اسکول بند ہو چکا تھا کہ مَیں نے اس طویل نظم کو اُردو میں منتقل کرنے کا کام شروع کیا۔ اُسی سال مَیں نے نواں درجہ پاس کیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب مَیں اس ترجمہ کو ــــ جس میں مَیں نے کسی سے مدد نہیں لی ــــ صاف کر رہا تھا تو ایک نجومی اِدھر آ نکلے تھے اور بہت سا کاغذ میز پر پھیلا دیکھ کر انھوں نے مجھے لکھنے پڑھنے کا شوقین بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں دوستوں کی خاطر پریشان رہتا ہوں!!

یہ افسانہ مَیں نے جرأت کر کے ہمایوں کو بھیج دیا جس کی اکتوبر اور نومبر ۱۹۳۳ء کی اشاعتوں میں وہ شائع ہؤا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اشاعت سے قبل رسالہ کے جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں صاحب نے اس پر نظرِ ثانی کی اور بعض جگہ اس کو درست کر دیا تھا۔ جب اِس کی رسید انھوں نے بھیجی تھی تو والد دیوانہ مصطفیٰ آبادی کا پتہ دیکھ کر بہت چیں بہ جبیں ہوئے تھے، بات یہ تھی کہ اس زمانہ میں وہ عدالت دیوانی میں پیشکار تھے اور گھر کے خطوط ان ہی کے پاس آتے تھے۔ ان ہی کے ڈر سے مجھے یاد ہے بعد کو مَیں نے حامد صاحب کو کارڈ پر ڈی، ایم لکھ بھیجا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں

ہمایوں — اور ادبی دنیا ہیں، جس میں اکتوبر ۳۳ء میں مترجمہ کہانی "نصیب" نکلی۔ مضمون چھپ جانے سے میری ہمت ضرور بندھی ہوگی ورنہ اس سے قبل مجھے مایوس ہو جانا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ باقاعدہ رجسٹری سے عالمگیر کو افسانہ بھیجنے اور مینیجر کے اس جواب کے ساتھ کہ "حافظ صاحب دورے پر ہیں واپس آنے پر جواب دیا جائے گا"۔ میری جرأت ناکامی کا مُنہ تکتی رہ گئی ہوگی۔ بہرحال مجھے مسرت ہے کہ "اینک ارڈن" سے لیکر اب تک میں نے جو کچھ لکھا اس پر کسی کی اصلاح نہیں لی، عالمگیر کو جو افسانہ بھیجا تھا اور "میں تمہیں یاد کرتا ہوں" اور "شاعر کی آرزوئیں" کو جعفر صاحب گنتیہری نے دیکھا تھا جنہوں نے ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کی شرح بھی لکھی ہے۔ ہاں "اینک ارڈن" سے قبل ایک افسانہ "نظام رنگین" فانوس (لاہور) نومبر ۱۹۳۲ء میں نکل چکا تھا، اس کو میرے ہم جماعت شاہد کے بھائی فدا مرحوم نے لکھا تھا اور ناتمام رہ گیا تھا۔ اس کے چھپ جانے کے بعد مجھے وہ میگزین ملا جس سے وہ اس کو ترجمہ کر رہے تھے۔ ورنہ اس کے باقی حصہ کا بھی ترجمہ کر دیا جاتا۔ فدا کے تراجم "قوس قزح" میں میں نے دیکھے ہیں۔ وہ عشرت رحمانی اور راز یزدانی مجھ سے قبل کے نثر نگار ہیں اور شاکر علی میرے ساتھ ہی اُبھرے ہیں، ان کے تراجم ادب لطیف میں شائع ہوئے ہیں۔ البتہ موجودہ دور میں شاعروں میں شاد عارفی اور ادیبوں میں دیوانہ مصطفیٰ آبادی کا نام بیشتر رسائل میں نظر آتا ہے۔

بہرحال اس بیٹھک کے شمال میں ہمارا آبائی مکان ہے، جس کے بغیر چھت کے نئے بنے ہوئے دروازے میں بیٹھ کر میں نے "حرامی" لکھا جو اگھانی کے عنوان سے "داستان" فروری ۴۱ء میں شائع ہوا۔ مطبوعہ مضامین میں بھی

آخری طبعزاد مکالمہ ہے۔ اس آبائی مکان میں ہی، مَیں ۱۲ مارچ ۱۹۱۶ء کو صبح تڑکے ۳½ بجے پیدا ہُوا۔ (اسی وجہ سے شاید صبح سویرے اُٹھنے کا عادی ہوں) اسی میں میرا بچپن گذرا، جس مکان کا اب ہم کرایہ دیتے ہیں اس میں مَیں نے دو ہندو ماسٹروں سے یکے بعد دیگرے انگریزی پڑھی، اور جس بیٹھک میں بیٹھا میں "اس" کے گذرنے کی راہ دیکھتا ہوں، اس کے آگے سڑک پر مَیں نے کئی سال شام کو قرآن پڑھنا سیکھا لیکن جس کو اب مَیں بالکل بھُول گیا ہوں۔ اس کے بھُول جانے کی پاداش میں، عام عقیدہ کے مطابق، مجھے دوزخ کی آگ میں تپایا جائیگا۔ حالانکہ اب بھی میں اس کو اُردو یا انگریزی میں پڑھ سکتا ہوں۔ ہمارے آبائی مکان کے سامنے کوئی سو گز کے فاصلہ پر ایک میدان پڑا ہے جس کو خدا معلوم کیوں چمن کا نام دے دیا گیا ہے حالانکہ اس میں خود رو گھاس کے علاوہ کوئی پیڑ نہیں اور جو ہموار ہونے سے قبل ایک کھنڈر تھا، اس چمن میں، مَیں نے اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھیل کُود کا زمانہ گذارا ہے اور کتنی ہی چاندنی راتیں شعور کرتے صرف کی ہیں جس پر ہمیں کئی بار شاکر کے دادا حافظ احمد علی خان شوقؔ کے ملازم نے ٹوکا کہ میاں کے آرام میں خلل ہوتا ہے، واقعی میں ہوتا ہوگا۔ وہ نواب حامدؔ علی خاں کے مقربوں میں تھے، سردار ڈیوڑھی کے عہدہ پر فائز، ہمارے دادا بھی حافظ تھے اور حامدؔ علی خاں کی تخت نشینی سے قبل جنرل عظیم الدین خان مدار المہام کے ساتھ شہید ہوئے۔

اس چمن میں ہی ہم نے ایک کلب بھی قائم کیا تھا، ہاکی کا، تب ہی سے مجھے ہاکی سے شوق ہے۔ کالج میں اس کی جگہ بیڈمنٹن نے لے لی تھی لیکن ۳۹ء میں اسکول ماسٹر ہونے کے بعد مَیں نے پھر اسٹک سنبھال لی۔ اس کلب کے ساتھ ایک لائبریری بھی وجود میں آئی تھی۔ دونوں کا سیکرٹری مجھے بنایا گیا تھا۔

اس لائبریری میں سروش (لاہور) اور نئی روشنی (دہلی) آیا کرتے تھے فضل بکڈپو کے ناول بھی بعض ممبروں کو مرغوب تھے۔ شکر ہے کہ میں نے ان کا چٹکارا نہیں لیا۔ عام بازاری ادب سے تب ہی سے میں نفرت کرتا ہوں۔ وہاں مذکورہ رسائل اور مکان مولانا محمد علی کا ہمدرد پڑھنے کو ملتا رہا۔ ہمدرد بھائی کے پاس آتا تھا جن کو بیگم محمد علی نے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ یہ میری پھوپھی زاد بہن ہیں۔ مجھے یاد ہے جب محمد علی صاحب جیل میں تھے تو انہوں نے مجھے ان کی رہائی کی دُعا کے لئے کہا تھا۔ اخبار بینی کا شوق ہمدرد نے پیدا کیا اور وہ عمر کے ساتھ ساتھ اتنا بڑھا کہ اب بھی اخبار نہ ملے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کھانا نہیں کھایا۔ نیرنگ، نیرنگ خیال اور ادبی دنیا کا بھی میں نے اسکول کی طالبعلمی کے زمانہ میں مطالعہ کیا۔ سکول اور کالج کے کتب خانوں سے میں نے بمشکل چند کتابیں مستعار لے کر پڑھی ہوں گی۔ البتہ مرتضٰی اسکول میں لائبریری انچارج کی حیثیت سے میں نے جتنا ذخیرہ نئے ادب کا جمع کیا (اس ذیل میں آنیوالی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو خریدی نہ گئی) وہ سب میری نظر سے گذرا۔ لیکن یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ رہ گئیں درسی کتابیں، وہ اگر کسی قابل ہوتیں تو شاید ہر طالبعلم افسانہ نگار بن جاتا۔ ان کتابوں میں سے تاریخ نے مجھ پہ بہت بُرا اثر ڈالا۔ خصوصاً گوتم بدھ کے حال نے جو دُنیا سے بیزاری اور زندگی سے فرار کی ترغیب دیتا ہے۔ جن خالہ زاد بھائی نے مجھے اسکول میں داخل کرایا تھا وہ مجھے ایک فاضل ادیب اور لائق پروفیسر دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اپنی تحریروں سے اعلاں کی طرح ان کو بھی ناراض کر دیا ہے۔ داخلہ کے وقت حساب کا ایک سوال صحیح نہیں نکلا تھا اور یہ بنیادی کمزوری نویں تک باقی رہی، اسی کی خاطر میں ایک بار آٹھویں میں روک لیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں

ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے میں بریلی کالج چلا گیا جہاں انٹر کامرس میں داخلہ لیا، ہوسٹل میں کمرہ ۳ میں پہلا سال جس کرب و بے چینی میں گذرا اس کے بعد کے دو سال آزاد بسر ہوئے، ادبی زندگی نے اُسی زمانہ میں عروج پایا، اور اگر والد کی سن ۱۹۳۸ء میں پنشن نہ ہو جاتی تو شاید میں گریجویٹ بھی ہو جاتا۔ میری ماں اور بھائی کی بڑی خواہش تھی کہ میں بی۔ اے کر لوں۔ لیکن میں خوش آئند امیدوں کا مرکز بننا نہیں چاہتا تھا، میں اس عزت و احترام سے تنگ آ گیا تھا جو دوسروں کے دلوں میں میرے لئے موجود تھا۔ میں محبت کئے جانے کا آرزو مند تھا۔ اس وقت محبت کے جس سہارے جی رہا تھا وہ جب مٹتا نظر آیا تو ۱۵ مارچ ۳۹ء کو میں نے خود یہ آرزو کی کہ کوئی لڑکی ڈیکنس کے ناول کی Great Expectations کردار ایسٹلا کی طرح مجھ سے نفرت کرنے لگے تا کہ میں کچھ کر کے دکھا سکوں، لیکن جب مجھے لکھا گیا "میں آپ سے بالکل محبت نہیں کرتی" تو میں نے سوچا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا حاصل، اور جب خلا ہی خلا نظر آیا تو میں نے کالج کی بے فکری کو چھوڑا، اسکول ماسٹر بنا اور پھر انبار کا مترجم۔ اور جب تک غربت میں رہا احساس محبت نے تخیل کو گرمایا اور جب امارت کا سراب نظر آیا تو یہ احساس فنا ہونے لگا اور کچھ کرنے، کچھ بننے اور کچھ ہونے کی تمنا بھی سرد پڑ گئی لیکن دل نے کہا ادبی موت نہ مرو اور میں نے "ادبی دنیا" میں پھر سے "حیات" پائی۔

میرا پہلا مضمون چمنستان (امرتسر) نومبر ۳۱ء میں شائع ہوا۔ اس کا خاص نمبر ۱۹۳۰ء میں منگا کر پڑھ چکا تھا اور غالباً شاطر غزنوی کا حال پڑھ کر مجھے اِدھر سے ہمت افزائی کی توقع پیدا ہوئی اور فضل احمد خان صاحب ایڈیٹر

چمنستان نے میرا مضمون قبول کر کے واقعی میں میرے شوق کو بڑھایا چنانچہ "شاعر کی آرزوئیں" بھی اسی میں شائع ہوا، یہی مضمون اگست ۳۲ء میں میخانہ (لکھنؤ) میں بھی نکلا، میرے سب سے پہلے مضمون کا عنوان تھا "میں تمہیں یاد کرتا ہوں" میرا پہلا مترجمہ افسانہ ہمایوں میں چھپا اور پہلا طبعزاد افسانہ "ناکام افسانہ نگار" نومبر ۳۵ء میں اختر نے شائع کیا۔ رومان سے اس کا تراشا میں نے ایک لڑکی کو بھیجا تھا جس کا ایک خط "اعتراف" مطبوعہ رومان فروری ۱۹۳۶ء کا موجب بنا۔ ناکام افسانہ نگار "اختر" کے انعامی مقابلہ کے لئے بھیجا گیا تھا لیکن اس کے بند ہو جانے پر اس کو رومان کے لئے روانہ کیا جس میں میرے ادبی مضامین شائع ہو رہے تھے۔ اس کے آخر میں جو خط ہے وہ اختر یا اُن کے رفیق عاشق بٹالوی نے لکھا اور مجھے یہ لکھنے میں پس و پیش نہیں کہ میرا لکھا ہوا خط اس جگہ بالکل پھیکا تھا۔ اس افسانہ کو "بیسویں صدی" کے مدیر خوشتر گرامی نے "جوانی کی راتیں" میں شامل کیا لیکن اس کا حال مجھے ۳۹ء میں معلوم ہو سکا جب اچانک اس کی ایک جلد میری نظر پڑی، بعد میں میرے لکھنے پر انہوں نے ایک جلد مجھے بھیجی بھی۔

میرے بیشتر مضامین اور افسانے لاہور کے رسائل میں شائع ہوئے ۳۲ء و ۳۳ء میں فانوس، ادبی دنیا، یادگار، ہمایوں اور شباب اُردو میں، ۳۴ء میں اس فہرست میں "زیب النسا" کا اضافہ ہوا۔ ان رسائل میں سے آپ فانوس کے بجائے انوارِ خیال، ادبی دنیا کے بجائے ادب لطیف، یادگار کے بجائے فلمکار، ہمایوں کے بجائے رومان لکھ دیں تو ۳۵ء میں جن رسائل میں میرے مضامین نکلے ان کی فہرست بن جائے۔ ۳۶ء میں،

میں نے کلیم، رومان، زیب النساء، ادب لطیف اور شاہد کی قلمی اعانت
کی۔ ۳۷ء میں ۳۶ء کی فہرست سے ادب لطیف کی جگہ بیسویں صدی،
شاہد کی جگہ پیمانہ (میرٹھ) اور زیب النسا کی جگہ یگانہ (رام پور) نے لے لی۔
۳۸ء میں پیمانہ، ایشیا، رومان اور آزادی (بریلی) میں لکھا۔ ۳۹ء میں
رومان، ایشیا، بیسویں صدی، شہباز، عادل، اقبال (رام پور کے ہفت روزہ
اخبار) ہمایوں، اور تصویر (رام پور) کے قارئین کی خاطر کی۔ ۴۰ء میں تصویر،
سب رس، اقبال، بیسویں صدی، ایشیا، ادبی دنیا میں پھر نظر آتا ہوں۔ ۴۱ء
داستان میں اور ۴۲ء ایشیا میں ایک ایک مضمون شائع ہوا۔ ۴۳ء سے
بہت امیدیں تھیں لیکن ابھی تک میں اپنی جبری تعطیل کو کام میں نہیں لایا،
آئندہ کا حال خدا جانے!! "آوازیں" (مطبوعہ ہمایوں جولائی ۳۹ء) وہ کہانی
ہے جس میں ایک ایڈیٹر کے مشورہ کے مطابق میں نے ترمیم کی کہ
ملازمت چاہنے والے آئی، کام کو باغباں سے اونچا درجہ دیا یعنی اُسے
پرنسپل اسسٹنٹ کی جگہ کا خواستگار دکھایا اور ایک جملہ کو اڑا دیا جس میں
اس نے صاحب کی بیٹی کو لے اڑنے کا منصوبہ باندھا تھا۔ حامد صاحب
کا خیال تھا کہ کوئی شریف لڑکی کسی ملازم سے اس طرح ربط ضبط نہیں
بڑھاتی حالانکہ اسی زمانہ میں ایک تعلیم یافتہ صاحبزادی تفریح کی خاطر
ایک موٹر ڈرائیور کے ساتھ جا چکی تھیں۔ حامد صاحب کا سا خیال حال میں
ایک جج نے بھی ظاہر کیا ہے کہ ایک امیر لڑکی دس روپیہ کے ملازم کے ساتھ
تعلق قائم نہیں کر سکتی۔ شاید اس کو ایک جج ہی سے ناطہ جوڑنا چاہئے!
"ہمایوں" میں اس طبعزاد افسانے کے علاوہ میرے کئی افسانے "رومان"
میں شائع ہوئے اور صرف دو "ادبی دنیا" اکتوبر اور دسمبر ۴۳ء میں، اس کے

بعد (فروری ۱۹۶۱ء کے داستان کا ذکر آچکا) ادبی دنیا میں میرا نام و نشان نہیں ملتا اس غیر حاضری کو اب تین سال ہوئے جاتے ہیں، اس "ادبی موت" کا اعلان "ابن مریم" کے الفاظ میں اس طرح ہو سکتا ہے۔

عرصہ ہوا میں نے حسن و عشق کی دو چار کہانیاں لکھی تھیں۔ ان کی تخلیق اور اشاعت دونوں میں لطف تھا اور اس خیال سے کہ میری کہانیاں پڑھ کر بہت سے مردوں اور عورتوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہوگی اور جانے پہچانے بغیر وہ مجھے تھوڑا بہت چاہنے لگتے ہوں گے، نشہ سا چھا جاتا تھا — سالہا سال سے میرے ذہن پر گویا موت طاری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میری زندگی نئے تجربوں سے محروم ہو گئی ہو — ان گنت، بے پناہ صدمے شخصیت کا درہم برہم ہو جانا، تجزیہ نفس کے دو سال، جس میں ہیجانی کیفیتوں کے طوفان اُٹھتے رہے اور اپنی روح کی حیران کر دینے والی خلوتوں سے آشنائی ہوئی۔۔۔ بہت سی باتیں ہیں، جنھوں نے میری نگاہ اور میرے جذبات میں بے اندازہ وسعت اور گہرائی پیدا کر دی ہے — نظروں کے سامنے بہت کچھ ہے مگر لفظوں میں اس کی تصویر نہیں اُترتی اور بھولے سے کوئی نقش بن جائے تو وہ اپنی زندگی کا اس قدر پھیکا اور نا تمام عکس نظر آتا ہے کہ اپنے آپ سے شرم آنے لگتی ہے — اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے کئی بار لکھا لیکن صفحہ، سوا صفحہ لکھ سکا، یہاں تک کہ بخار سے جلتی ہوئی ایک رات میں پلنگ پر پڑے پڑے بھی میں نے لکھا۔ لیکن نا تمام، اب یہ حال لکھنے سے قبل جب میں نے خطوط کا فائل، ڈائری کے اوراق اور بیاض کے صفحات اُلٹ پلٹ کئے تو میں حیران رہ گیا کہ "ماضی کے دھندلکے میں چمکنے والی خوبصورت چیزیں میری تخلیق نہیں!!"

"ابن مریم" نے "خالہ زاد بہن" لکھ کر آرزو کی تھی کہ اس رسالہ کو جس میں

وہ شائع ہو، وہ اپنی خالہ کے پاس بطور نمونہ بھجوا دیں لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں بہن یہ نہ کہہ دے کہ یہ باتیں میرے متعلق ہیں۔ معلوم نہیں یہ عزت رسوائی ان کو تدبیر سے حاصل ہو سکی۔ لیکن جو باتیں "رومان" کے صفحہ ۴۴ سے سُنی گئیں ان کی بابت اک خالہ زاد بہن نے یہ اعتراف کر لیا کہ وہ سب اس کی کہی اور سُنی ہوئی ہیں۔ "ہونے والی بات" کہ رومان ختم ہو گیا اور زندگی کی حقیقتوں نے یہ بھی بتا دیا کہ "اور بھی دُکھ ہیں زمانہ میں محبت کے سوا۔"

باتیں جس حقیقت کی مظہر ہیں ان کی طرح میرے بیشتر مضامین اور افسانے تاثرات، خیالات و جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ ابتک میں نے جو کچھ لکھا وہ کسی واقعہ، منظر یا گفتگو سے متاثر ہو کر اور بعض افسانے تو محض واقعاتی کہانیاں ہیں۔ گو زیب داستان کے لئے ان میں خیال آرائی بھی کی گئی ہے، اس کے باوجود میں وہ باتیں چھوڑ دیتا ہوں جن کو کامل بے ریائی سے بیان نہ کر سکوں۔ "اب مجھ سے رہا نہیں جاتا" سراسر واقعات و حادثات پر مشتمل ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جن دو انسانوں کے گرد وہ کہانی گھومتی ہے انہوں نے اس کی اشاعت کے بعد شادی کر لی۔ اسی طرح "شادی" میں ریل کے سفر کا ذکر ہے اسی سے میں نے اس کا مواد حاصل کیا۔ "آوازیں" اور "مردم آزاری" اپنے ہی تجربات کا عکس ہیں۔ آخر الذکر میں جو آنکھیں نشہ برسائی ہیں۔ وہ ۲ ۱/۲ سال بعد، اب بھی کبھی سرِ راہ نظروں کو بہکا دیتی ہیں۔ غرض یہ کہ مجھے محرک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں فرمائشوں پر بہت کم لکھ سکا ہوں۔ یہ حال بھی کئی کئی دن کے وقفہ کے بعد مختلف اوقات میں، بہانوں سے لکھ پایا ہوں۔

اپنے لکھے ہوئے افسانوں میں مجھے "سونے میں پیلی" پسند ہے۔ اس

لئے نہیں کہ ساغر یہ سمجھ نہ سکے کہ اس میں میں کیا دکھانا چاہتا ہوں یا اس کی
مخالفت و موافقت میں ایڈیٹر ادبی دنیا کو متعدد خطوط موصول ہوئے (جن
کے مطالعہ کی مجھے آرزو ہے) یا تمنائی "زندہ چین" کے مترجم کے خیال میں اس
طرح کی کہانیاں بہت کم لکھی گئی ہیں بلکہ محض اس لئے کہ بشیر کے ایک ہمنام کے
قول کے مطابق وہ اخلاقی بیماری کی مظہر ہے جس میں آجکل کے نوجوان ادیب
گرفتار ہیں ــــ کیسا نفیس تضاد ہے یہ!! ایک ترقی پسند سمجھتا ہے دوسرا
ان تحریروں کو اس قابل بھی خیال نہیں کرتا کہ "دنیا کے سامنے پیش کی جائیں"
یوں تو اس کہانی کی اساس بڑی بوڑھیوں کی اس دعا پر رکھی گئی ہے "سونے
میں پیلی، موتیوں میں سفید" لیکن اس کے ابتدائی مکالمہ کی بھنک میرے
کان میں پڑ گئی تھی۔ جب میں نے اس کو ختم کیا ہے تو حقیقت میں "جو کلیاں
بس ان میں انار آ گئے تھے" ــــ آغاز و انجام اگر میں سوچ لوں تو درمیانی کڑیاں
خود بخود بن جاتی ہیں۔

ادبی مضامین اور تراجم سے میں نے ادبی زندگی کا آغاز کیا، تراجم کا دور
دورہ تھا اور ٹیگوریت اپنے شباب پر تھی۔ مجھے مسرت ہے کہ میرے ادبی
مضامین پر ادب لطیف کی ان تعریفوں کا اطلاق نہیں ہوتا جو ہری چند
اختر نے "ادب لطیف" اگست ۳۵ء میں کی ہیں، اس لئے کہ وہ بے معنی
لکیریں" ــــ!!!" نہیں ہیں۔ ترجمہ کرنے کی جو صلاحیت مجھ میں پیدا ہو گئی ہے
وہ میری تعلیم و عمر کے کسی اور شہری میں نہ ہو گی لیکن ساغر کے بقول اس
سے دماغ عاجز ہو جاتا ہے اس لئے میں نے طبعزاد کہانیوں کی طرف توجہ کی۔
غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا، مجھے کرداروں کے انتخاب
نے! شروع میں میں نے جو تخلص رکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایڈیٹروں

پر یہ ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا کہ اسکول کا طالب علم ہوں ۔ ورنہ یقین مانئے ہر جگہ سے یہی جواب ملتا کہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ادھر توجہ کیجئے جیسا کہ کالج کے پرنسپل نے آئی کام میں فیل ہو جانے پر مجھ سے کہا بھی "تم کافی ذہین تھے اور پاس ہو جاتے لیکن تمہیں مضمون نگاری سے فرصت نہ تھی حالانکہ وہ تم امتحان بعد دو ماہ کی چھٹیوں میں بھی کر سکتے تھے ۔ ان ہی اے سی دت کو محض اس بہانہ کہ میری ڈاک لمبی چوڑی ہوتی ہے یونین اسکالرشپ دینے میں پس و پیش تھا ۔

اپنے قلمی نام کے ذیل میں مجھے ایک مذاق بھی یاد آیا ۔ ۳۶ء میں بریلی سے "شاہد" نکلا ، ایڈیٹر کو میں نے مضمون بھیجا اور اس تحریر کے ساتھ کہ " دیوانہ مصطفیٰ آبادی سے حاصل کیا ہے اور اپنے قلم سے صاف کر دیا ہے ۔ " انہوں نے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور لکھا کہ اور مضامین بھجوائیے چنانچہ دو ایک ماہ یہ سلسلہ رہا ۔ اس کے بعد میں ان سے ملا اور دوران گفتگو میں یہ بات ظاہر کر دی کہ عزتؔ اور دیوانہؔ مصطفیٰ آبادی ایک ہی انسان کے دو نام ہیں یہ بات پھر انہوں نے کالج کے ایک اور شاعر طالب علم شائق وارثی سے کہی ہوگی ۔ اس لئے کہ ان کے ایک ساتھی اچانک مجھ سے ملنے آئے ۔ بریلی کے ایک مشاعرہ میں روشؔ سے میں خود ملا ، " لالہ صحرا " کے سلسلہ میں ان سے خط و کتابت ہو چکی تھی ۔ اور رام پور میں عزتؔ کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی بعید گوشہ صحرا میں " لالہ صحرا " کی ، سنسان خموشی میں کھلے اور ویرانی کی گود میں مرجھا جائے (ساغر) " ۔۔ ۳۹ء کے بعد یہ لوگ دو تین بار رامپور بھی آئے لیکن مزدور شاعر کو ایک سرمایہ دار نے اپنا لیا ہے اور روشؔ کو ایک روشن خیال مجسٹریٹ نے ۔ اور میں چونکہ شاعر نہیں ہوں اس لئے

وُہ لوگ مجھ تک آنے کی عزت حاصل نہیں کرتے اس کے علاوہ فروری ۳۶ء میں لکھنؤ میں جوشؔ سے ملنے کے بعد میں نے یہ اندازہ کیا کہ جس طرح ستاروں کا اسٹیج پر چمکنا ان کو نقصان پہنچا سکتا ہے ایسے ہی میرے لئے ملاقات کرنا کچھ زیادہ سود مند نہیں۔ افسوس ہے کہ جوشؔ نے جب شام کو بکس میں سے بوتل نکالی اور ایک گلاس اپنے اور ایک ساقی (جو شاید اسرائیل احمد خاں تھے) کے لئے بھرا تو مجھے فرمائش نہیں کی ورنہ یہ بات یادگار رہتی کہ شاعرِ انقلاب کی صحبت میں مَیں نے شراب کا پہلا جرعہ لیا۔ دن میں ملاقات کے دوران میں وصل بلگرامی نے میرا تخلص سُن کر جو کچھ کہا تھا اس کا تاثر تھا، نیز یہ خیال کہ نام کا اثر پڑتا ہے۔ اِس لئے مَیں نے ۳۷ء سے "عزت" کے نام سے بھی لکھنا شروع کر دیا اور گو "میراجی" نے یہ خواہش کی کہ "سونے میں پیلی" پر عزت کے بجائے دیوانہ مصطفیٰ آبادی کا نام جانے دوں لیکن ایک وجہ سے مجھے "حیات" بننا پڑا۔ ہوا یہ کہ جس زمانہ میں، مَیں اس کو لکھ رہا تھا میری ماں نے خواب دیکھا کہ ان کے ایک بھائی ان سے کہہ رہے ہیں کہ عزت نے اپنی حرکت نہیں چھوڑی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہر وقت تو نظر کے سامنے رہتا ہے پھر کیسے لکھ لیتا ہے جس پر انہوں نے فرمایا کہ اس کے پاس لکھا رکھا رہتا ہوگا۔ بہر حال میری خاطر ایڈیٹر ادبی دنیا کو اپنا اصول بدلنا اور فرضی ناموں کی اشاعت پر راضی ہونا پڑا۔ ادھر مَیں نے جو پردہ ڈالا تھا وہ کسی سے اُٹھائے نہ بنا، کم از کم گھر والوں کو اس کا علم نہ ہو سکا اور یہی میرا مقصد تھا ورنہ پھر مجھ پر ماں ناراض ہوتی اور "باتیں" چھپنے کے بعد جو جملہ اس نے کہا تھا —— کیا بھائی کا گھر خراب کرنا چاہتا ہے —— ویسے ہی کوئی صلوات پھر سُناتی، اس نے کہا تھا کہ ایسے ہی لکھنا ہے تو اپنے

گھر والوں پر لکھو پرائی بہو بیٹیوں پر کیوں لکھتے ہو۔ ممکن ہے گورکی کی طرح کبھی میں بھی "ماں" کو موضوع بناؤں، جو اس زمانہ میں جب میں ادیبانہ شہرت کے خواب دیکھتا تھا کہا کرتی تھی۔ "میراجی جلاتا رہتا ہے"، اس لئے کہ میں اس کے امتیازانہ برتاؤ سے چڑتا تھا۔ جب میں ملازمت سے علیحدہ ہوا تو اس نے کہا "تیری خودی بہت بڑھ گئی تھی" اور غالباً یہ ہے بھی سچ کہ میں نے اپنی خودی کو اتنا بلند کر لیا ہے کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا مجھ سے پوچھتا ہے بتا تیری رضا کیا ہے ـــــ ملازمتیں ختم ہو جانے کے بعد کارخانہ میں ملازمت کی خواہش پوری ہونا، اور اس کو چھوڑ کر روزنامہ "انصاری" دہلی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی جگہ کا پیش کیا جانا، اپنی تقدیر بنانے کا بیّن ثبوت ہے لیکن افسوس ہے کہ ماں کے آنسو میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے اس سے قبل ۳۸ء میں بھی "ریاست" کا بلاوا کم کشش انگیز نہ تھا لیکن وہ بھی موقعہ گھر والوں کے کہنے سے کھو دیا۔ دوسروں کی مشورہ پر چل کر میں سکھ نہیں پا سکا ہوں، اور شاید چین میرے نصیب میں نہیں، دیکھئے نا، گھر میں بجلی لگی تھی، جاڑے کی راتوں میں میں اس کی روشنی میں لکھنے کا کالج کے زمانہ سے عادی ہو گیا ہوں، لیکن وہ Leakage. کی خاطر علیحدہ کر دی گئی ـــــ!!

کالج کے زمانہ میں مجھے فوٹو گرافی کا شوق بھی چرایا تھا میرے قلم کی طرح کیمرہ بھی حادثات کا مرکز رہا۔ بات یہ تھی کہ جس سال میں کالج میں داخل ہوا اسی سال دو لڑکیوں نے بھی داخلہ لیا۔ ان میں ایک شکنتلا جیسوال بھی تھی ـــــ نام میں نے اس سے لکھ دیا کہ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کریکٹ میچ کی تصویر کی اشاعت کے ساتھ اخبارات میں آچکا ہے۔ اس کی تصویر کھینچنے

کا قدرتی موقعہ اس طرح ہاتھ آیا کہ تانگہ والوں نے ہڑتال کر دی اور وہ پیدل آنے لگیں، کمرہ نمبر ۱۱ کے بعد ڈائننگ روم تھا اس کی کھڑکی سے ——کہیں کوئی دیکھتا نہ ہو—— مَیں نے تصویر کھینچی لیکن تصویر آئی اس کی بڑی سائقن کی۔ اس واقعہ کے چند دن بعد ایک سی، آئی، ڈی نے، جو خوشامدی ٹٹو تھے، اسسٹنٹ گیمس سیکرٹری سے رپورٹ کی کہ مَیں نے تصویر کھینچی ہے انہوں نے گیمس سیکرٹری سے کہا جو وارڈن بھی تھے چنانچہ وہ تحقیقات کو تشریف لائے۔ مَیں نے صاف انکار کر دیا اور حقیقت میں اس دن میں نے تصویر کھینچی بھی نہیں تھی۔ "ناکامی" (مطبوعہ بیسویں صدی مئی ۳۷ئہ) اور "تصویر" (بیسویں صدی اکتوبر ۳۹ئہ) مذکورہ واقعہ اور کیمرہ کی بدولت وجود میں آئے۔ تصویروں کا ذکر آیا ہے۔ اِس لئے مَیں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ مجھے اچھی تصویروں سے محبت ہے اور دستخطی فوٹوؤں کی مَیں بڑی قدر کرتا ہوں۔ چنانچہ رتن کی تصویر جب میرے کمرے سے چوری گئی تو مجھے بڑی تکلیف ہوئی اس لئے کہ اس کی چوری "مونالزا" کی گمشدگی سے کم نہ تھی۔ مَیں نے سوچا تھا کہ بڑی بڑی ہستیوں کے دستخطی فوٹو جمع کروں گا۔ جس محل کے خواب دیکھتا تھا۔ اس میں ایک "پکچر گیلری" بھی ہوتی لیکن ایسے خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔ اور سفر نہ بھی کیا جائے تب بھی ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بہت سی تصویریں جمع ہو سکتی ہیں لیکن جب اُن کے لگانے کی جگہ نہ ہو تو ان کو بند کر کے رکھنے سے کیا فائدہ ورنہ مَیں دیوندر ستیارتھی کو ضرور لکھتا کہ وہ اپنا، رفیقہ حیات اور بیٹی کا وہ گروپ —— تینوں کا دستخطی، ضرور بھیج دیں جو ہمایوں میں شائع ہوا۔ دیوندر اسکول کے ایک عزیز ساتھی کا نام ہے، شاید اسی لئے مجھے دیوندر کے مضامین بے حد پسند ہیں۔ ان کے علاوہ ہمعصر افسانہ نگاروں

ہیں مجھے احمد ندیم ___ خوشی کی بات ہے کہ ہم دونوں ہم عمر ہیں۔ ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، عمر فاروق، محمد حسن عسکری، حجاب امتیاز علی۔ اِس لئے نہیں کہ وہ بہت پیارے جھوٹ بولتے ہیں بلکہ اپنے لطیف طرز نگارش کی خاطر۔ سعادت حسن، اختر انصاری، اختر حسین رائے پوری اور کرشن چندر بہانے ہیں۔ ان کے "نئے زاویے" کو میں افسانوں کا بہترین مجموعہ خیال کرتا ہوں۔ کون سا شاعر مجھے پسند ہے، یہ بات یہاں موزوں نہیں۔ ہاں یہ میری خواہش ہے کہ عاشق بٹالوی کے ایک افسانہ کا ہیرو بن سکوں!

ادبی زندگی سے متعلق میری تمام آرزوئیں پوری ہوگئی ہیں۔ ایڈیٹروں کی فرمائشیں۔ خطوط کی اشاعت، پہلا خط بھی بزم ہمایوں میں آیا۔ مفت کے رسائل۔ لمبی چوڑی ڈاک۔ اخبار کی نامہ نگاری (شہباز)۔ اداروں کی رکنیت (ماہنامہ "تصویر" اور روزنامہ ناظم)۔ اور اب یہ دوسرا اور غالباً آخری اعزاز۔ اپنے ہاتھوں اپنی رسوائی!! پہلی عزت ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت سے ملی تھی جو نومبر ۳۶ء میں حاجرہ بیگم کے اہتمام سے الہ آباد میں ہوئی تھی لیکن جس میں میں شریک نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ میرے پاس کوئی مقالہ نہ تھا۔ ریڈیو پر بولنے، اپنا مجموعہ شائع کرانے اور اگر ہو سکے تو گاہے گاہے "حیات" ہونے کا ثبوت دیتے رہنے کی ٹمٹماتی ہوئی ننھی سی قندیل تمنا، سینے کے کسی گوشے میں چھپی بیٹھی ہے، لیکن شاید اتنی بھی توانائی نہیں کہ "بڑھ کر ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے"!!

میں فطرۃً یاس پسند واقع ہوا ہوں، زندگی کے تاریک پہلوؤں پر میری نظریں جاتی ہیں، ہاں کبھی کبھی، جب "حال" روشن ہوتا ہے یا ماضی کی خوشگوار ساعتوں سے کوئی کرن پھوٹ نکلتی ہے تو اُجلے رُخ بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔

میری داستان چمن میں بکھری ہوئی نہیں کہ کچھ بلبلوں کو یاد ہو کچھ قمریوں کو حفظ ہو البتہ اگر کسی سوانح نگار کو اور زیادہ جاننے کی ضرورت ہو تو اس کو کچھ مواد اِن لوگوں سے مل سکتا ہے جو میرے ساتھ رہے ہیں - برق زیدی تھا بہت حال جانتے ہیں - یا اُن خطوط سے جو مَیں نے دوسروں کے نام لکھے ہیں اور جو میرے پاس آئے ہیں - میرے پاس آئے ہوئے خطوط کا جو فائل ہے اس میں اسکول اور کالج کے ساتھیوں اور اُستادوں کے خطوط کے علاوہ ساغر نظامی، جوش ملیح آبادی روش صدیقی، میرزا ادیب، منصور احمد، حامد علی خاں، میراجی، خوشتر گرامی اختر شیرانی، صلاح الدین احمد، سلیمان ندوی، خلیل احمد، حیات اللہ انصاری اور بہزاد نظر آتے ہیں - افسوس ہے کہ یہاں ان کی جھلک نہیں دکھا سکتا - اِن میں سے ساغر، جوش، روش، اختر، بہزاد اور سلیمان سے میں مل چکا ہوں -

ایک "ہندوستانی ریاست میں رہ کر مَیں نے جس طرح اپنی ذاتی قابلیتوں کو اجاگر کیا" اس سے مَیں مطمئن ہوں - اب تک مَیں نے جو کچھ لکھا اس میں سے چند چیزیں چھپ نہ سکیں - (۱) ہرجائی - ایک افسانوی مکالمہ، جو رومان کے لئے بھیجا تھا - اور جس کا پتہ نہیں چلتا - سُنا ہے رومان کے مینیجر شیخ نواب نے ضبط کر رکھا ہے - (۲) جھومر - جو بیسویں صدی کے ایڈیٹر شائع کرنے کی جرأت نہ کر سکے اور ایک اور افسانہ - "باجی" شاید اس کا عنوان تھا، جو حیات اللہ کو بھیجا تھا اور جس کی انہوں نے رسید نہ دی - میرے مضامین کہاں کہاں نقل ہوئے اس کا مجھے علم نہیں البتہ ایک چوری کا پتہ ہے - "باتیں" جو "سب رس" بابت ماہ اپریل و جون ۴۰ء اور "تصور کی ملاقاتیں" کے عنوان سے بیسویں صدی جولائی ۴۰ء میں نکلیں، کسی اختر انصاری الہ آبادی نے حرف بہ حرف اپنے نام سے ہندوستانی ادب ستمبر ۴۲ء میں چھپوا دیں - پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی رائے

ہے کہ اس پر مجھے خوش ہونا چاہئے کہ میرا لکھا اتنا مقبول ہے کہ دوسروں کو سرقہ کی تحریص ہوتی ہے !! میرا خیال ہے کہ اگر مَیں کوئی تازہ چیز لکھوں تو وہ گذشتہ پر حاوی ہو گی لیکن اپنے قلم پر جو اعتماد تھا وہ اب نہیں رہا — ہر وہ خیال، جس نے الفاظ کا جامہ پہن لیا اپنی بے قیمتی کا خود ہی اعلان ہے !!!

کبھی حسن نظامی سے ملاقات ہوئی تو اپنا حلیہ لکھا لوں گا تاکہ یہ حال مکمل ہو سکے - اب بھی اس کی تکمیل میں شبہ ہے - اتنا بھی مَیں نے اس لئے لکھا ہے کہ مَیں جانتا ہوں کہ میرے متعلق مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا !!

کاش کوئی میرے لئے اناطول کی ایلزا بن جائے !

nonsence

Not good book.

جانے کو کہتی تھی اب جو اس کو چچی نے بلایا تو اس نے خیال کیا کہ حمیدہ میری وجہ سے
ٹھہر گئی۔ اسے بن ملے جانا بھی نہ چاہیئے تھا۔ اچھا ہُوا ایک نازک معاملے کی صفائی کا
موقعہ اِتنی جلد مل گیا۔ وہ خوش خوش اُٹھی، سنگار میز کے آئینے میں اس نے بال دیکھ کر
ان کو ہتھیلیوں سے جمایا اور پان کھا کر ملازمہ کے ساتھ باہر نکلی اور اک سنسنان گلی
میں چند قدم چلنے کے بعد حمیدہ کے مکان میں داخل ہوئی اور چچی کو سلام کرتی ہوئی
سیدھی اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ حمیدہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "یہ بھی کیا لکھنؤ ہے
جہاں سے اتنے بلاوؤں کے بعد آئی ہو" اس کے شوہر نے اس کو سیدھے ہاتھ کی آغوش
میں لے کر اس کے صندیں ماتھے کو چوما۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ تم بیٹھی ہو گی!"

"میں تو تم سے بغیر ملے چلی جاتی نا اور یہ دو دن سے جو تمام میں گھوم رہی ہو میرے
یہاں آنے میں کیا ہل بیل لگتے تھے؟"

"ہل بیل نہیں، اک گھوڑا تو تانگے میں ضرور لگتا۔ تم اتنی دور نور رہتی ہو قریب
کے گھروں میں ہی جانا نہیں ہوا، خالہ ہی کا گھر رہ گیا ہے۔"

"خیر خالہ کا گھر تو پھر دیکھا جائے گا —— جلدی سے اپنے کپڑے لے آؤ اور
چلو میرے ساتھ۔"

"میں پرسوں کو آؤں گی۔"

"پرسوں ورسوں میں نہیں جانتی، نہیں چلو گی تو صباحت ہی کو رات بھر
نیند نہ آئے گی۔"

"تو کیا وہ بھی تمہارے یہاں ہوں گے؟"

"اور کیا —— دفتر اور کلب کے علاوہ اس کا باقی وقت ہمارے ہی
یہاں گذرتا ہے۔"

"خوب اپنی چیز کے ہوتے تمہیں پرائی سے کیا مطلب؟
"اللہ رے پرائی ـــــ گویا آپ بھی تو کوئی غیر ہیں ـــــ یہ لو اب نہ جانے سے رہی، ذرا آپ چچی سے کہہ آیئے کہ ان کو ہم چار دن کے لئے مہمان لئے جا رہے ہیں۔"
اس کا شوہر تعمیل حکم میں اُٹھ کر باہر چلا گیا تو ممتاز نے پوچھا۔ "تم نے ان پر کیا جادو کر دیا ہے۔" وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے شوہر کو کس طرح اتنا اطاعت شعار بنا لیا ہے۔ لیکن حمیدہ نے اُن کا اشارہ اُس کے منگیتر کی طرف سمجھا "میں تو جادوگرنی ہوں نا، پگلی کہیں کی، یہ سب تیری ہی خاطر کیا ہے۔ آخر وہ جاتا بھی کہاں، اس کی ماں آگرہ ہیں، بہن اپنی نند کے یہاں، اکیلا گھر میں کیا تمہارے تصور سے ہی دل بہلاتا اور ہمارے یہاں کوئی ایسا نیا جانا تو ہے نہیں کہ تم کچھ اور سمجھو، آخر کانپور میں بھی تو وہ اُن کے پاس کئی سال رہا۔ اب چند دن کو یہاں بھی رہ گیا تو کیا بگڑ گیا۔"
"اچھا، وعدہ کرو کہ آج سے چوتھے دن ان کی مہمانداری ختم۔"
"اچھی بات ہے، تو اب چل رہی ہو؟"
"ہاں ہاں امی جان منع نہ کریں۔"
اس کا شوہر اجازت لے کر آ گیا، نوکر تانگہ بھی لے آیا تھا، وہ حمیدہ کے ساتھ چلی گئی۔

(۳)

جمال ساڑھے چار بجے دفتر سے واپس آیا تو اُس نے خالہ کو موجود پایا جو اپنی بڑی آپا کے سلام اور اپنی بھانجیوں کو دیکھنے آئی تھیں۔ انہوں نے حسب معمول اس کو گلے لگایا اور اس کے سلام کے جواب میں اس کی کمر پہ بزرگی کا ہاتھ پھیرا۔ ناشتہ دیتے وقت اس کی ماں نے اپنی بہن کے برتاؤ کو دیکھ کر اس سے کہا "خالہ ناراض تو نہیں معلوم ہوتی" جب اس نے جواب میں کہا کہ "ناراض ہونے کی بات بھی کیا تھی" تو اس کی بڑی بہن

نے جو پاس ہی بیٹھی تھی۔ اس کو تسلّی دی اور کہا "ایسے بات بنانے والے کچھ بنا لیں تو کیا۔" اس نے جلد ہی سے ناشتہ ختم کیا اور ہوا خوری کے لئے باہر نکل گیا۔

راستے میں وہ یہ سوچتا رہا کہ آخر اس خط، اک نامۂ محبت لکھنے کا اسے یہ صلہ کیوں دیا گیا کہ ممتاز کو بھی اس کی زندگی سے چھین لیا گیا۔ اس کی زندگی کی ناکامیوں کی تاریکی میں اک روشنی تھی جس سے اس کو محروم کر دیا گیا، اس کو اس طرح بے سہارا چھوڑ دیا گیا جیسے ایک اندھے سے اس کی لاٹھی چھین کر اسے بھٹکنے دیا جائے۔ اس کے دل میں آرزو کی چنگاری دبی ہوئی تھی جسے فراق کی تیز و تند آندھیوں نے بھڑکا دیا اور اس طرح سب نے اس کو جلتا دیکھ لیا۔ یوں تو اس خط میں کچھ بھی نہ تھا البتہ اس میں مرہم لگانے کی کوشش کی گئی تھی ان پھڑیوں پر جو ممتاز کی پنڈلیوں میں ابھر آئی تھیں۔ لیکن اپنی قسم کا وہ پہلا خط تھا، جو اس کو پہنچا اور جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکی سوائے اس کے کہ اس نے اپنے حجلۂ ناز پر کم خواب کے دبیز پردے کھینچ دیئے یا وہ دور رہنے اور اس کے سامنے نہ آنے کے لئے مجبور کی گئی۔ گویا وہ کوئی آئینہ تھا جس میں وہ اپنے شباب کا عکس دیکھ لیتی اور یہ چاہتی کہ دن میں کئی مرتبہ نہیں تو کم از کم اک بار ضرور اپنی جوانی کی اس جھلک کو عریاں پا لیتی جسے ابھی ایک آدھ سال زریں ملبوسات سے آراستہ رہنا چاہیئے تھا۔

اس نے اس کی آمد سے قبل خواب دیکھے تھے کہ ملاقات کا کمرہ جو کھلا ہوا تھا اس کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ گویا مندر کے دوار میں قفل ڈال دیئے گئے ہیں۔ اور مورتی —— (وہ اک دیوی تھی جس نے ابھی تک اپنے پجاریوں سے اعتنا نہ کی تھی) کئی ایوانوں سے محصور اک کمرے میں بند کر دی گئی ہے اور پجاری باہر کھڑا رہ گیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ خالہ کے ہمراہ نہ آئی ہوگی۔ وہ تلافیٔ مافات کے لئے اک راہ تلاش کر رہا تھا۔ کسی طرح پہنچ کر وہ اپنے گذشتہ برتاؤ کی صفائی پیش کر دے لیکن یہیں اسے

خیال آیا کہ ابھی ایک ہفتہ ہوا جب اس کے آنے کی خبر گرم تھی اس کے تصوّر نے
استقبال کا ایک نقشہ اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اس کے یہاں گیا ہے۔
وہ اپنے کمرے کی چھت پر اپنے بال سکھا رہی ہے یا سورج سے اپنے تمتماتے ہوئے
چہرے کا مقابلہ کر رہی ہے وہ اس سوچ میں ہے کہ کون بہتر ہے وہ یا سورج اور
اپنا پلہ اس لئے بھاری سمجھ رہی ہے کہ اس نے اک خرمن ہستی کو جلا دیا ہے عشق وارفتہ
کی آگ میں۔ اور وہیں سے اس نے اپنی نگاہوں سے یہ ظاہر کیا ہے کہ تم نے مجھے رسوا
کیا۔ جاؤ اب میں کبھی تم سے بات نہ کروں گی۔ اپنے تخیّل کی اس سرد مہری کے باوجود
اس کا ارادہ تھا کہ وہ اس تک جائے گا اور اگر حقیقت میں وہ روٹھ گئی ہے۔
تو وہ اس کو منائے گا۔ اسے روٹھوں کو منانے کا ایک بہت لطیف طرز آتا ہے،
اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اک بار اس نے اسے ناراض سمجھ لیا تھا اور جب وہ اُسے
رخصت کرنے دروازے تک آئی تھی تو اُس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر
اس سے پوچھا تھا۔

"آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"میں اور تم سے ناراض، — کیوں آخر؟"

"یوں ہی میرا خیال تھا۔"

"اچھا خیال تھا۔ میں تو ناراض نہیں ہوں" اتنا کہہ کر وہ جلدی سے اندر بھاگ
گئی تھی، شاید اس کی آنکھوں میں کوئی چور تھا۔ لیکن اگر اب وہ اسے رخصت کرنے
نہ آئی یا اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ ہاں میں تم سے بہت ناراض ہوں تو شاید وہ اس کے
پیروں پر گر جائے گا۔ اور اپنی آنکھوں کے موتی اس کے حسین قدموں میں ڈال دیگا۔
اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ناراضگی اس کے جیون کو انتہائی کٹھن بنا دے گی۔
آخر اس سے دلچسپی رکھنے کی خاطر تو اس کی ماں نے اسے اپنا بیٹا سمجھنے سے انکار کر دیا

تھا۔ شاید وہ اسے پتھر کے ایک مجسمے کی طرح ایک بے حس بُت دیکھنا چاہتی تھی۔ ممتاز کو اپنا منے کی حسین فردوس تخیل سے اس کو حقیقت ——— (جو ہمیشہ تلخ ہوتی ہے ——) کے زندانِ تاریک میں پھینک دیا گیا تھا تو اب اس کو اس دوزخ میں رہنا کیوں ناگوار ہوتا جو ماں کے پیروں تلے نہیں ہوتی؟

وہ ٹہلتے ٹہلتے کافی دُور نکل آیا تھا۔ اس وقت ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا۔ یہیں وہ کلب واقع تھا جہاں امیر زادے تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے، اور جہاں پر جُوا بھی ہوتا تھا۔ لیکن اسے خلافِ قانون تصور نہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ سرمایہ داری تمام عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اسے اس بات کا تلخ احساس ہوا کہ وہ غریب ہے، وہ اگر اس سے ملنے جائے تو کم از کم ظاہرات تو اس بات کا اظہار کر سکیں کہ وہ اس کے نہ ملنے سے کچھ ایسا متاثر نہیں، قمیص پر ایک پُلوور ہونا چاہئے، پیروں میں مخمل کی سُبک جوتیاں۔ اس لئے کہ فیتہ والے جوتے تو شیروانی کے ساتھ ہی پہنے جاتے ہیں اور اپنے عزیزوں کے گھروں میں، جو بہت ہی قریب ہوں، اسے پہن کر جانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اگر کسی دوپہر کو یوں ہی ایک قمیص پہن کر جایا جائے تو شاید وہ اس سے یوں کہے گی "ابھی آپنے پُل اوور نہیں خریدا؟" اور اس کے جواب میں اسے یہ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ "میں خریدنا نہیں چاہتا، بُنوانا چاہتا ہوں" اس پر اگر اس نے ہمدردی کے لہجے میں یہ کہہ دیا "تو اون لا دیجئے" تو وہ اون کہاں سے لائے گا۔ وہ اس کی نظروں میں حقیر ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا معیارِ زندگی اتنا اونچا تو ہونا چاہئے جتنا اس کے "ان" کا۔ لیکن اگر وہ اس قابل ہوتا تو اسی کو اپنا لیتا، آہ، دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے بھرپور جوانیاں، ان کا حُسن و شباب، رفیقانِ عشرت، غرض خدا کی خدائی اور شاید خدا بھی۔ اسے اس غیر مساوی تقسیم دولت پر غصہ آیا جو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو منتقل ہوتی ہے لیکن غریب کو نہیں پہنچ پاتی،

اس کی غربت میں آنکھ کھلتی ہے مفلسی میں بسر ہوتی ہے اور بے کفن ختم ہو جاتی ہے
اس پر خدا کی رحمتیں اولاد کی بے شمار تعداد میں یوں نازل ہوتی ہیں جیسے بارش کے
قطرات ـــــ جو ذرا سی دیر کو خشک زمین کو تر کرتے ہیں۔ لیکن ایک کھیت کے
لئے پانی کے علاوہ گرمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی سے غریب ہمیشہ
محروم رہ جاتے ہیں۔

جاڑے کی شام تھی مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس نے دیکھا کہ سکریٹریٹ
کے آٹھ آٹھ روپیہ ماہانہ کے ملازم سُوں سُوں کرتے اپنے جھونپڑوں کو واپس جا رہے
ہیں، قابلِ رحم ہیں یہ انسان جو صبح سات بجے اپنی ملازمت پر آتے ہیں، صاحب
کے کمروں کی صفائی کرتے ہیں۔ مالی کے لائے ہوئے تر و تازہ پھولوں سے ان کی میزوں
کو آراستہ کرتے ہیں، چونکہ اُن کا دفتر لنچ کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسی لئے دن کے
ختم ہونے پر کام بند ہوتا ہے، اچھا ہوا اُس کے پاس بڑا کوٹ نہ تھا۔ ورنہ اس
وقت وہ اس کے جسم پر ناقابلِ برداشت بوجھ بن جاتا۔

وہ بڑھتے بڑھتے اسٹیشن کے قریب پہنچ گیا تھا اور جب واپس ہونے لگا تو
چودھویں کا ... چاند نکل آیا تھا۔ اس کے جذبات نے ایک جوان کروٹ بدلی۔
اس پر یہ خواہش غلبہ پانے لگی کہ کاش وہ ایسے میں تنہا نہ ہوتا۔ کوئی چمکتا ہوا تارا
اس کے پہلو میں ہوتا۔ محل باغ کے کسی کنج میں وہ آرام کے بہانے بیٹھ جاتا۔ اک
خوبرو لڑکی اس کے سودائی سر کو اپنے زانو پر رکھ لیتی اور وہ اس کے التفاتِ بے پایاں
سے سرشار ہو کر آنکھیں بند کر لیتا تو اس کا چہرہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر جھکتا
اور اس کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مل جاتے اور وہ محبت کی ان بنیادوں
پر اک فردوسِ نو تعمیر کر لیتا۔ زندگی یکسر شباب و نغمہ بن جاتی!
یوں نہ ہوتا تو یوں ہوتا کہ جب وہ سر دبوانا چاہتا تو چند نازک اُنگلیاں اس

کے بالوں میں کنگھی کرنے لگ جاتیں۔ اسے اپنی بھابی سے تو درخواست نہ کرنا پڑتی۔ آج صبح ہی انہوں نے جب اس کے سر میں تیل ملنے میں پس وپیش کیا تھا تو اس نے ایک بیوی کی ضرورت کا اندازہ کیا تھا۔ اسے دفتر جاتے وقت شیروانی کے بٹن بھی خود ہی ٹھیک کرنا پڑے تھے۔ اگر ممتاز موجود ہوتی تو وہ محبت سے اس کو کہتی "لائیے بٹن میں لگا دوں نا" اسے یاد تھا کہ اک بار جب وہ کالج جا رہا تھا۔ تو اُس کی قمیصوں کی آستینوں میں اس نے بٹن ٹانکے تھے اور اسے جب بورڈنگ میں اس کی یاد آئی تھی تو اس نے اُن بٹنوں کو ہی چُوم لیا تھا اور یہ خیال کر لیا تھا کہ اس طرح اس نے اس کے نفیس و ملائم ہاتھ پر اپنا بوسہ ثبت کر دیا — آج اسے نہ معلوم کیوں اپنی زندگی میں ایک غیر معمولی خلا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں بائیں طرف ایک ایسا کاری زخم لگا ہے۔ جو اب کبھی نہ بھر سکے گا۔ اس کا دل و دماغ مجروح ہو رہا تھا۔

اگر وہ اس سے شادی کر لیتا — اسے حاصل کرنے میں کوئی خاص دشواری تو نہ تھی — تو نئے زمانے کے میلانات کی تسکین کا کیا سامان ہوتا۔ اتنی قلیل تنخواہ میں اس کے لئے ساڑیاں اور زیورات کس طرح خرید پاتا۔ مانا کہ محبت اس کی سادگی میں چار چاند لگا دیتی لیکن وہ اپنے ہمجولیوں میں بیٹھ کر اس کا کون سا ظاہری ثبوت پیش کرتی۔ وہ کیوں کر اس کی زندگی کو دلکش و جاذب توجہ بنا سکتا اور آجکل کی لڑکیاں اسے علم تھا کہ ایک خواہش، محبت کئے جانے کے علاوہ اور بہت سی خواہشات رکھتی ہیں جن کی تکمیل نہ ہو تو زندگی غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔

غرض اس چاندنی رات میں، ان تصورات کی چاندنی سے اپنے آپ کو تسلی دیتا جب وہ گھر پہنچا تو اس نے اس قید کا احساس کیا جس میں غیر شعوری طور پر وہ مقید تھا۔ ان کبوتروں میں سے ایک کی طرح جو صبح کو اپنے آشیانے سے اُڑا دیئے

جاتے ہیں اور شام ہوتے خود بخود واپس آجاتے ہیں۔ لیکن کبوتر تو زمانۂ جنگ میں بھی پیام برداری کرتے ہیں۔ کاش ان تخیلات کے حصار سے نکل کر وہ بھی اپنا کوئی پیام اپنی چہیتی تک پہنچا آیا ہوتا لیکن اس کے تو پر کتر دیئے گئے تھے کیا اس کی ماں نے اسے منع نہ کر دیا تھا "جب تک میں پوچھ نہ لوں وہاں نہ جانا" اسے اذنِ پرواز ہی کب تھا؟

کہا جاتا ہے کہ عورتیں محبت کے راز ——— اس راز کی باتیں بڑی جلد سمجھ لیتی ہیں، شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ جب جمال کی بہن نے اس کو بے دلی سے کھانا کھاتے دیکھا۔ شاید وہ اپنے سامنے کی کرسی پر اک جانی پہچانی لڑکی کو بیٹھا دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی طرف وہ کھانے کی پلیٹیں بڑھا دیا کرے ——— تو اس نے ممتاز کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس طرح اسے یہ معلوم ہوا کہ خالہ کے ساتھ اس کے نہ آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لکھنؤ سے آنے کے فوراً بعد ہی حمیدہ کے ساتھ چلی گئی تھی۔

کھانے کے بعد وہ جلد سونا چاہتا تھا۔ لیکن اس ذکر یک لمحہ نے تو اس خیال کی چاندی کو اور نکھار دیا ——— جو سونا چاہے اسے ملے چاندی تو نیند اچاٹ نہ ہو جائے گی، غرض رات کے گیارہ بجے، کتنی سرد رات خیالات کو یک سو کرنے میں گذر گئی، اس کی آنکھ لگی ——— وہ ممتاز سے ملنے کی آشائیں لئے سویا تھا، شاید اپنے ہی احساسات کا عکس تھا جو اس شام اس کے دماغ پر چھائے رہے تھے کہ اس نے بیداری کا ایک خواب دیکھا۔

(۴)

رات کے نو بج چکے ہیں۔ ممتاز اک گھنٹہ سے حمیدہ کی ساس کے پاس انگیٹھی کے قریب دالان میں بیٹھی لکھنؤ کے حالات سنا رہی اور وطن کے واقعات، جو اس کی غیر موجودگی میں پیش آئے سن رہی تھی کہ سائیکل کے چلنے کی آواز کانوں میں آئی، آواز

ویسی ہی تھی جیسے اس نے دولھا بھائی کی سائیکل سے اس وقت سُنی تھی جب ان کو اس میں تیل دیئے زمانہ ہوگیا تھا۔ اس کے سُنتے ہی اس نے صباحت کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ اتنی جلد وہاں پہنچ گیا کہ.......... وہ اُٹھ کر بھاگ بھی نہ سکی۔ بس وہ اتنا کر سکی کہ اپنا چہرہ ایک طرف کو پھیر کر بیٹھ گئی۔

صباحت نے کہا "آپ کے یہاں بغیر اطلاع کے بھی مہمان آجاتے ہیں۔"

"لو اور سُنو، کہیں بیٹیاں بھی میکے میں مہمان ہوتی ہیں!!"

"تب تو بیٹے بھی مہمان نہ ہوتے ہوں گے۔"

"ایسا ہوتا تو تم اتنے دن تک یہاں کیوں رہتے۔"

ممتاز کو یقین ہوگیا کہ وہ یہیں کھڑا رہے گا "تو یہ بڑوں کا بھی لحاظ نہیں۔" اپنے دل میں کہتی ہوئی وہ نظر بچا کر بھاگی اور شرمائی۔ لجائی حمیدہ کے کمرے میں اس کے پلنگ پر جا پڑی اس نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا ہی تھا "کیوں کیا کوئی ہوّا آگیا" کہ صباحت آموجود ہوا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ البتہ اس کی مزاج پرسی کے جواب میں اُس نے صرف اتنا کہا "آپ نے خالہ کا بھی خیال نہ کیا۔"

"خالہ کو معلوم ہے کہ تم میری بیوی ہو۔"

"خوب، یہ کس شیطان نے کہہ دیا آپ سے، میں تو آپ کی بیوی نہیں ہوں۔

"اب نہیں ہو تو کیا۔ چند ماہ بعد ہو جاؤ گی۔"

"یہ قبل از وقت کی راگنی کیوں۔"

"وقت قریب آرہا ہے۔"

"جیسے آپ اس وقت قریب آگئے ہیں! یہ تو بتایئے آپ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں کیوں آپڑے ہیں۔"

"یہاں ——— تم سے ملنے کی آزادیاں حاصل ہیں۔"

"مَیں یہاں روز روز تو نہیں آتی ۔"

"اِدھو اسی دن کے لئے تو یہاں آ گیا ہوں، تمہارے ساتھ نقل مکانی ہوتا تو سب کو بات پکڑنے کا موقعہ ملتا ۔"

"بہت دُور اندیش ہیں آپ"

"اور تم بہت نکتہ شناس ۔"

"اب باتیں ختم جناب، پہلے ہمارا شکریہ ادا کیجئے ۔"

"تمہاری محبّت کا شکریہ" ممتاز محبّت کا لفظ درمیان میں آتے ہی اُٹھ بیٹھی اور اس نے کہا "مَیں کسی کا شکریہ نہیں ادا کروں گی بلکہ حمیدہ کو میرا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ مَیں نے اس کی بات مان لی ۔"

"مجھے کیا پڑی ہے شکریہ ادا کرنے کی، یہ جانیں اور تم ۔"

"مَیں آپ کی عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں" عنایت کا لفظ سُن کر وہ جل ہی تو گئی ۔غیر کی محبّت اپنوں کی عنایت، بہت "اچھا آپ کے اس نظریئے کو بھی تبدیل کرنا ہے" اس نے اپنے دِل میں طے کر لیا ۔

اتنے ہی میں حمیدہ کا شوہر آ گیا اور یہ سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے ۔ میز پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چاندنی رات کا لُطف اُٹھانے سنسان سڑکوں پر جایا جائے ۔تجویز حمیدہ کی تھی اور تائید صباحت کی ۔ممتاز نے اس کی اس لئے مخالفت کی تھی کہ اس کے پاس جاڑے کی اس سرد رات میں پہننے کے لئے بڑا کوٹ نہ تھا ۔لیکن حمیدہ کے شوہر نے یہ کہہ کر کہ تم میرا اوورکوٹ پہن لینا اس تجویز کو پاس کر دیا تھا ۔تھی بھی آخر وہ اس کی دلشاد دُلہن کی اُٹھائی ہوئی ۔۔۔ چنانچہ کھانا ختم کرنے کے بعد یہ لوگ باہر نکل گئے ۔ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ رات کی رانی کی انتہائی مست خوشبو نے ان کے دل و دماغ کو معطر کر دیا ۔ صباحت حمیدہ اور ممتاز کے درمیان آ گیا اب اس کے بائیں جانب

حمیدہ تھی سیدھی طرف ممتاز۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چاندی تھی۔ یہ چاروں اس سہانی رات کو قہقہوں میں گذار دینا چاہتے تھے۔ خموشی میں جب ان کی گونج پیدا ہوتی تو ممتاز کو ایسا معلوم ہوتا جیسے آس پاس کے بنگلوں کے دالانوں میں کھڑے ہوئے جوڑے، بیلوں اور درختوں کی آڑ میں سے انہیں دیکھ کر مذاق اُڑا رہے ہیں۔ صباحت ذرا خاموش چل رہا تھا ممتاز نے خیال کیا کہ شاید میں جو ان سے مخاطب نہیں تو ان کو یہی ناگوار گذر رہا ہے۔ اس کی طرف دیکھ کر اس نے کہا "کیا سوچ رہے ہیں آپ، کیا چُپ کی نیند آگئی۔"

"ہاں اک خمار سا چھا رہا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ سردی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"

"انگیٹھی پہلو میں تو ہے" حمیدہ بولی "کیا گلے کا ہار بنانا چاہتے ہو۔ سُنا ہے کشمیر میں لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"حمیدہ، تمہارے اُن کا پہلو بھی تو خالی ہے اِدھر آجاؤ نا۔" ممتاز کو ناگوار تھا کہ اس کے شوہر کا بایاں پہلو وہ گرم کرے۔

"ابھی وقت نہیں آیا۔"

"کِس بات کا۔"

"پہلو گرمانے کا۔ فی الحال تو ہوٹل چل کر چائے پئیں گے۔"

ٹرنک روڈ پر ہوتے، ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ، یہ دو جوڑے اسٹیشن کی سڑک پر جا رہے ہیں لیکن اب اُن کے چلنے کا انداز یوں ہے کہ حمیدہ اور صباحت آگے ہیں اور اس کا شوہر اور ممتاز دس قدم پیچھے چل رہے ہیں۔ اس نے شادی کا ذکر چھیڑ دیا ہے اسے افسوس ہے کہ منگنی کو چار سال ہوگئے لیکن ابھی رُخصتی نہیں ہوئی اور وہ اس کو بتا رہی ہے کہ ابھی تو انتظامات میں دو تین ماہ اور لگ جائیں گے" میں تو

چاہتی ہوں کہ یہ جھگڑا جلد ختم ہو۔ اور کچھ نہیں تو ان کا یہ آوارہ پھرنا تو جائے میں نے سُنا ہے یہ آپ سے ٹہلنے کا بہانہ کر کے ہوٹل میں جا کر شوق کرتے ہیں۔"

"اس میں ہرج بھی کیا ہے۔"

"خوب شراب تو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔"

"کہتے ہیں کہ عورت اور شراب دونوں نشیلی چیزیں ہیں۔ جب وہ نہ ملے تو اس کو مُنہ لگانا ہی پڑتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ بچے ہوئے ہیں۔"

"اس میں شک بھی کیا۔"

"اس وقت تو آپ ان کو نہ پینے دیں گے۔"

"میں کون ہوتا ہوں تمہارے ہوتے۔"

اس کے بعد گفتگو کا موضوع پلٹ گیا اور جب دونوں ہوٹل پہنچے تو دیکھا کہ درمیانی گیلری سے حمیدہ اور صباحت مسکراتے سیڑھیوں کی طرف آرہے ہیں۔

ممتاز نے کہا "تم تو ہوا پر سوار ہو گئیں۔"

"بلکہ میرے کندھوں پر۔"

"آپ بھی بس ان ہی کا ساتھ دینا جانتے ہیں۔"

"تمہارا خیر مقدم تو کرنا تھا یہاں" اور یہ کہہ کر وہ تینوں کو ساتھ لئے اسی گیلری میں واپس ہوا۔ اس سے نکلا تو ہوٹل کے مینجر سے "سامان بھجوائیے" کہتا ہوا ان کو ایک کمرے میں لے گیا۔ اس میں یوں تو سب سامان تھا۔ لیکن مسہری ایک ہی تھی۔ ممتاز کمرے کا جائزہ لے رہی تھی کہ چائے اور پینے پلانے کا سامان آگیا۔ حمیدہ چائے بنانے لگی تو صباحت نے ممتاز کے سامنے بوتل بڑھا کر کہا "تم اس کا کاگ اُڑا دو جام بھرو۔"

"افسوس ہے کہ میں ساقی نہیں ہوں۔"

"تو کیا آپ کوئی پیمانہ ہیں۔"

"اگر ایسا سمجھیں۔"

"گردن تو واقعی صراحی دار ہے ــــ لو، صباحت چائے پیو، جب ممتاز کو منظور نہیں تو اسے اٹھا رکھو۔"

"اس شرط پر کہ انہیں اپنے ہونٹوں سے پلانا پڑے گی۔"

ممتاز سوچنے لگی کہ بن پئے تو ان کا یہ حال ہے اگر کہیں چڑھا لی تو پھر شاید یہیں لیٹ رہیں گے۔ اسے چائے کڑوی معلوم ہوئی اس نے حمیدہ سے کہا "مجھے تو ڈر معلوم ہو رہا ہے جلدی سے چائے ختم کرو واپس چلیں۔"

"لیکن ابھی تقریباً دس منٹ تو ٹھہرنا پڑے گا۔"

"وہ کیوں ــــ کیا دس پیالیاں چڑھاؤ گی۔"

"ذرا ان کے ساتھ یہاں کا ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم دیکھوں گی۔ مجھے کوئی رت جگا تو نہیں کرنا کہ اتنی پی لوں۔"

اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا اور وہ یہ کہتا "ہم ابھی آتے ہیں" باہر نکل گیا۔ ممتاز نے ایک لمحہ کی دیر کر دی ورنہ وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیتی لیکن ان کو تنہا چھوڑنا بھی تو مناسب نہ تھا ــــ اب وہ تنہا اس نئے ہوٹل میں کیونکر اتنی رات گئے جرأت خرام کرے۔ وہ ذرا سنبھل کر بیٹھی تھی کہ کسی نے باہر سے درواز بند کر دیا۔ صباحت اس کی طرف لپکا لیکن اس کے جھٹکا دینے سے قبل وہ بند ہو چکا تھا۔ ممتاز نے کہا "حمیدہ کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

"اور کیا اب ہم ان کی واپسی تک اُٹھ بھی نہیں سکتے۔ صبر کریں اور کچھ۔" اس نے انڈیل لی۔ لیکن ابھی جام لبوں سے لگا نہ پایا تھا کہ ممتاز کا ہاتھ بڑھ گیا اور اس نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "کیا مذاق ہے، چھوڑیئے میرا ہاتھ چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔"

"ابھی چھوڑتا ہوں لیکن اک پیار" ممتاز محجوب ہوگئی اس نے آنکھیں نیچی کر لیں، صباحت نے اپنا چہرہ آگے بڑھا کر اس کے لبوں کا ایک بوسہ چرا لیا۔ کتنا شیریں تھا وہ، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے گلاب کی پنیاں اس کے ہونٹوں سے چھوا دیں۔ —— اور پھر تاش کی بازی شروع ہوئی۔

ممتاز نے اپنے ہونے والے شوہر کے جذبے کی دل ہی دل میں تعریف کی لبوں ہی کو چومنا چاہیئے تھا لیکن جمال نے تو صرف اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا تھا، شاید وہ پرعظمت تھا اور یہ لطیف —— تاش کھیلنے میں وقت گذرتا معلوم نہیں ہوا۔ یک دم وہ کسی خیال سے چونکی اور غسل خانے میں جا کر اس نے منہ دھویا۔ کہیں وہ بوسہ ادلیں چپکا تو نہیں رہ گیا۔ حمیدہ نے اگر اس کا نشان دیکھ لیا تو بہت بنائے گی۔ اور جب وہ وہاں سے نکلی تو میز پر رکھی ہوئی گھڑی ایک بجا رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ اب واپس نہیں آئے گی۔ اسے شک گذرا کہ اب اس کو کہیں کوئی اور قیمتی چیز نہ کھونا پڑے اُلفت کی قمار بازی میں وہ، بہت مدت ہوئی جمال کو ہار چکی۔ ابھی چند گھنٹے گذرے وہ اپنے ہونٹوں کی عفت کھو چکی، تاش وہ برابر ہار رہی تھی گیا اس کے بعد بھی کوئی ہار اس کے نصیب میں لکھی گئی ہے —— بہر کیف کسی نہ کسی صورت آج وہ اپنے ہونے والے شوہر کے دل سے اس سوئی کو نکال پھینکے گی جو کسی دوسری نے پرونا شروع کی ہے۔ اس نے واپس چلنے کی خواہش کی لیکن سب دروازے بند تھے۔ صباحت نے مجبوری ظاہر کی۔ اور کہنے لگا۔ "یہ بستر موجود ہے اس پر آرام کرو۔"

اس نے پوچھا "اور آپ"

"میں اس آرام کرسی پر لیٹ رہوں گا۔"

"تکلیف تو نہ ہوگی۔"

"اگر تمہیں راحت پہنچانے کا خیال آئے۔"

"مَیں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"اک جام پلا دو۔"

"باقی کا کیا ہوگا۔"

"تم شریک ہو جاؤ۔" اس میں اب مخالفت کی سکت نہ تھی۔ اس نے دوسرا جام بھرا اور ایک پی کر مسہری پر جا لیٹی۔ تھوڑی دیر بعد میز پہ رکھا ہُوا لمپ روشن ہُوا اور پھر چند منٹ بعد اس نے اپنے جسم میں گرمی سی محسوس کی۔ کروٹ بدلی تو صباحت کرسی پر موجود نہ تھا اور شراب کی بوتل خالی ہو چکی تھی۔

(۵)

صبح کے روشن اجالوں میں جمال کی آنکھ کھلی اور اس نے آسمان پہ اک ستارہ جھلملاتا دیکھا دوپہر کو جب وہ کھانا کھانے مکان آیا تو ممتاز اسی کے یہاں موجود تھی۔ وہ بجائے رنگے ہوئے پاجامے کے سفید شلوار پہنے تھی اِس کے پیروں میں سینڈلوں کی جگہ سچے کامدار جوتیاں تھیں۔ سُرخ مخمل کی اور بالوں میں آڑی مانگ نکلی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ یا شاید بسنت رت کی وجہ سے جمال کو ایسا دکھائی دیا۔ اس نے جمال کو سلام کیا اور فوراً ہی اپنی جگہ بدل دی۔ کمرے میں جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ درخت میں جو کلیاں تھیں اِن میں انار آ گئے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہُوا کہ ممتاز سونے میں پیلی ہو چکی لیکن موتیوں میں سفید نہ ہوئی، جمال کے اشکوں کی لڑیاں وہ اپنے پیروں میں کیوں ڈالتی۔ شاید وہ اپنا ہی موتی کھو چکی تھی، دوسروں کے موتیوں سے کیوں بوجھل ہوتی !!!

دیوندر ستیارتھی

۱۹۰۹ء میں موضع بھدوڑ ریاست پٹیالہ میں پیدا ہوا۔ شروع ہی سے لوک گیتوں کا شوق رہا۔ کالج چھوڑ کر خانہ بدوشی اختیار کی۔ جگہ جگہ کے گیت اکٹھے کئے۔ لوگوں کو دیکھا۔ ان کے دکھ سکھ کو ٹٹولا، اور پھر آج سے دو سال پہلے یکایک افسانہ نگار بن گیا۔

میری تصنیفات کے نام یہ ہیں۔

میں ہوں خانہ بدوش (افسانے)

نئے دیوتا (افسانے)

لال دھرتی

کوئی رنگ مظلوم نگاہوں کی طرح خاموش اور فریادی ہوتا ہے۔ کوئی رنگ خوشبو کی طرح کچھ کہتا ہوا اور داد طلب دکھائی دیتا ہے۔ کوئی رنگ مچلتا ہوا کسی ضدی بچّے کی یاد دلاتا ہے۔ اور کسی کو دیکھ کر غنودگی سی چھا جاتی ہے۔ ...... لاری کے ڈرائیور نے دریا پار کرتے ہوئے کہا۔ "اب ہم آندھر دیش میں داخل ہو رہے ہیں۔ بابو جی!" مَیں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سُرخ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آندھر دیش کی سُرخ زمین کیا کہہ رہی ہے۔"

آنکھیں موند کر مَیں نے اپنے دِل میں جھانکا۔ وہاں سبز رنگ لہلہا رہا تھا۔ اپنے دماغ سے اس رنگ کا مطلب سمجھنے کی مَیں نے چنداں ضرورت نہ سمجھی۔ اور آنکھیں کھول کر سُرخ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے مَیں نے محسوس کیا کہ یہ رنگ بہت بلوان ہے اور میرا اپنا رنگ اس کے سامنے ٹِک نہ سکے گا۔

ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اُس نے سُرخ زمین کے بھید خود اس کی زبانی سن لیے ہیں۔ اور اب اِس کے لئے یہ مشکل ہو رہا ہے

کہ انہیں چھپا کر رکھ سکے۔

لاری بھاگی جا رہی تھی۔ سُرخ دھول اُڑ اُڑ کر ڈرائیور کے گالوں پر اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ مَیں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دھول وہاں بھی آ جمی تھی۔ مَیں نے سوچا کہ میرے چہرے کی میل خوری زمین پر سُرخ رنگ چڑھ گیا ہو گا اور یہ بہت بُرا تو نہ لگتا ہو گا۔

"پہلے یہ سارا ضلع بہار اڑیسہ میں تھا۔ بابو جی!"

"اور اب؟"

"اب نقشہ بدل گیا ہے، بابو جی!"

"نقشہ بدل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جب سے اڑیسہ الگ صوبہ بن گیا ہے، اس ضلعے کے تیلگو بولنے والے حصے آندھر دیش کو مل گئے ہیں۔"

"بہت خوب۔"

"لیکن ہم خوش نہیں ہیں، بابو جی! گورنمنٹ نے ابھی تک آندھر دیش کو الگ صوبہ بنانا منظور نہیں کیا۔"

"مگر کانگرس تو کبھی کی یہ قرار داد پاس کر چکی ہے کہ زبان کی اہمیت کو قبول کیا جائے۔ ہر بڑی زبان کا اپنا صوبہ ہو۔ تاکہ ہر زبان کے ادب کی پوری پوری پرورش کی جا سکے۔ ہر تمدن اپنے اپنے ماحول میں آزاد ہو کر نشو و نما پا سکے۔"

"جی ہاں۔ کانگرس نے تو یہی کہا ہے کہ آندھر دیش کا الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ مگر گورنمنٹ نہیں مانتی۔"

گورنمنٹ کیوں نہیں مانتی؟ مدراس میں تو اب کانگرس منسٹری قائم ہو چکی ہے اور اس کے پردھان شری راجگوپال آچاریہ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ وہ یہ کام

ضرور کر سکتے ہیں!"

"مگر اس کا حکم تو لنڈن سے آنا چاہئے بابو جی!"

"لنڈن سے؟"

"جی ہاں...... اور اگر یہ حکم نہ آیا تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دیں گے۔ اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔"

"لہو بہا دو گے اپنا؟ پہلے ہی یہ زمین کیا کم سُرخ ہے؟"

ڈرائیور نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیا رنگ جھلک رہا تھا۔ وہ نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

زمین سُرخ تھی۔ کبھی گہرا بادامی رنگ زور پکڑ لیتا۔ پھر یہ سیندوری بن جاتا.... سیندوری رنگ گلناری میں تبدیل ہو جاتا......

سُرخ رنگ مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ میرے لہو کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ کئی بڑے چھوٹے پلوں اور ننھی ننھی پلیوں کو پھاندتے ہوئے لاری وجے نگرم کے قریب جا پہنچی۔ مندروں کے بڑے بڑے کلس دکھائی دینے لگے۔ اس بھاگم دوڑ میں ہمیں وجے نگرم اپنی طرف بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گویا ہماری لاری ساکن تھی۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی سڑک تربینی کی طرح تین طرف دوڑی جاتی تھی۔ دو سڑکوں کے سنگم پر بھیم راؤ کا مکان تھا۔ ڈرائیور اُنہیں پہچانتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے مجھے اُتارتے ہوئے اس نے دوست نواز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آندھر دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔ لاری آگے بڑھ گئی۔

میں نے آواز دی۔ بھیم راؤ باہر نکلے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرے پر سینلا مائی کا آٹوگراف نظر آ رہا تھا ــــ چیچک کے بڑے بڑے داغ۔ توند کی طرف دھیان گیا تو میں بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکا۔ ہمارے سکول میں ایسا ہیڈ ماسٹر

کبھی رعب قائم نہ رکھ سکتا۔

تعارفی چٹھی کو پڑھتے ہی وہ مجھے اندر لے گئے۔ بولے۔ "آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس غریب کے ہاں چلے آئے۔ اس چٹھی کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی۔"

"آندھر دیش کی بہت تعریف سُنی تھی" مَیں نے مُسکرا کر کہا۔ "بہت دنوں سے ادھر آنا چاہتا تھا۔"

"آپ شوق سے رہئے۔"

مجھے ایک الگ کمرہ مل گیا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہُوا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ آندھر دیش کی سُرخ زمین میرے پیروں سے چھُو رہی ہے۔ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کبھی کبھی مَیں قالین پر لیٹ جاتا اور دھیان سے اپنے دل کی دھڑکنیں سُننے لگتا۔ اچھا شغل تھا۔ سُرخ رنگ کیا کہہ رہا ہے! —— بار بار یہ سوال زبان تک آیا۔ مگر ہونٹ بند رہے۔

بھیم راؤ کے مکان پر کانگریس ترنگا لہرا رہا تھا۔ . . . . سبز، سفید اور سُرخ . . . . اس ترنگے جھنڈے کا مفہوم میرے ذہن میں اجاگر ہوا اٹھتا۔ دل ہی تو تھا بیچ بیچ میں یہ کہنے لگتا کہ اس جھنڈے کا سرخ رنگ آندھر دیش کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اور یہ خیال آتے ہی مجھے ایک ناقابل بیان مسرت محسوس ہوتی۔ جہاں سفید رنگ ختم ہو کر سُرخ رنگ شروع ہوتا تھا۔ وہیں میری نگاہ جم جاتی۔ اور اس نوجوان لاری ڈرائیور کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھتے۔ "اب ہم آندھر دیش میں داخل ہو رہے ہیں، بابوجی!"

میرے کمرے میں بڑا مختصر سا فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک ٹائلٹ میز پڑا تھا۔ دو کرسیاں، ایک تپائی، اور ایک طرف ایک تخت جس پہ مجھے سونا ہوتا تھا۔ بستر پر دن کے وقت کھادی کی دودھیا سفید چادر بچھا دی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس ٹائلٹ میز کا گول آئینہ وہاں نہ ہوتا تو وہ چند ہفتے اتنے دلچسپ نہ ہو پاتے۔ میرے جذبات کا رنگ

پکی ہوئی اینٹوں کی طرح سُرخ ہو چلا تھا۔ یہ رنگ میرے چہرے پر بھی تھرک اُٹھتا۔ اس کے لئے میں آئینے کا ممنون تھا۔

میرے کمرے کی دائیں کھڑکی میدان کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سبز گھاس اُگتی ہوئی نظر آتی پانی نہ ملنے پر یہ گھاس پیلی ہو سکتی تھی۔ سُرخ نہیں۔

دن چڑھتا اور پتہ ہی نہ چلتا کہ کیسے بیت گیا۔ وجے نگرم میرے لئے نیا تھا۔ ہر آنکھ میں کوئی نہ کوئی صدیوں کا جمع شدہ رنگ تھرک اُٹھتا۔ اس سے پہلے کہیں ماضی اور حال کو یوں بغلگیر ہوتے نہ دیکھا تھا۔ رات ختم ہوتی تو صبح سورج کا تمتماتا ہوا تلک لگائے آ حاضر ہوتی۔ اُسے دیکھ کر مجھے کرشنا وینی کی پیشانی کا "بوٹو" یاد آجاتا۔

پیچھے سے آ کر کرشنا وینی میری آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور جوں ہی وہ پرے ہٹتی، میری آنکھیں اس کی پیشانی کی طرف لپکتیں۔ کنکم کا سُرخ "بوٹو" پانچ کینڈل کی بجائے پچاس کینڈل کا برقی قمقمہ بن کر اس کی پیشانی کو روشن کرتا دکھائی دیتا۔ کوشش کرنے پر بھی میں کبھی اُسے ایسی حالت میں نہ دیکھ سکا جبکہ غسل کے بعد یہ "بوٹو" دُھل کر اتر چکا ہو۔ پھر میں نے یہ کوشش ہی چھوڑ دی۔ بس ٹھیک ہے۔ یہ قمقمہ ہمیشہ روشن رہے، دن ہو چاہے رات —— کنکم کا سُرخ بوٹو!

اَن پورنا اور کرشنا وینی دونوں بہنیں تھیں۔ وینی پورنا سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں گھر پر پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن سنگیت کی ابتدائی منزلوں کو طے کر کے اس کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی۔ چھوٹی بہن صرف بہن کی دنیا کو دیکھ چھوڑتی تھی۔ اس کا گانا سُن لیتی تھی۔ اور اگر اس نغمہ نے اس کی فسطانت کا کوئی سویا ہوا رنگ جگا دیا تو اس نے تھوڑی بہت تک بندی کر لی۔ نہیں تو کس کی دینا۔ کون اَن پورنا، وہ اپنی کتابوں میں اُلجھی رہتی۔

بھیم راؤ اپنی بیٹیوں کی تعریف میرے سامنے بھی لے بیٹھتے۔ دونوں کے سُرخ "بوٹو" میرے ذہن میں تیرنے لگتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرے منہ میں پان کی پیک اور بھی سُرخ

ہوگئی ہے۔ میرے جذبات چھالیا کے ننھے باریک ریزے بن جاتے جو پان چباتے وقت پھسّ سے دانتوں کی درزوں میں سے گذر جاتے ——

"یہ تو اپنے آدمی ہیں بیٹیو!" بھیم راؤ کہتے "ان سے خوب باتیں کرو، ان کی کہانیاں سنو، دیس دیس کا پانی پی رکھا ہے۔ انہوں نے —— ہاں دیس دیس کا" اپنی تعریف سُن کر میرے ہر مسام کے کان لگ جاتے۔ نتھنوں میں ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو جاتا۔ ذہن میں ایک گدگدی ہونے لگتی۔ یہ آندھرا دیش کی سُرخ زمین کا خلوص تھا۔ ایک ترقی پسند خلوص!

"یہ کرشنا وینی تو نری گلہری ہے۔ مسٹر راؤ!" ایک دن میں نے دونوں بہنوں کی موجودگی میں کہا" اور یہ اچھا ہی ہے ——"

"خوب خوب! اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔ نچلی تو بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ گلہری ہی تو ہے۔"

کرشنا وینی ہنسی نہیں۔ آخر اس میں گلہری کی کیا بات ہے؟ شاید ہمارے عزیز مہمان کے دیس میں کنیائیں گلہریاں نہیں ہوتیں۔ وہ حیا سے سمٹی رہتی ہونگی لیکن دیس دیس میں، دھرتی دھرتی میں فرق ہوتا ہے نا۔

بھیم راؤ بولے "یہ آندھرا دیش ہے ——"

انّ پورنا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا، "اور یہاں کی کنیائیں آزاد نظمیں بن گئی ہیں۔"

کرشنا وینی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ بولی "جی ہاں آزاد نظمیں ——"

اور میں نے محسوس کیا کہ کم از کم کرشنا وینی ضرور ایک آزاد نظم ہے، نہ بحر کی جھنجھٹ نہ قافیئے کی پابند۔

انّ پورنا نے اپنے بازو کرشنا وینی کے بازوؤں میں ڈال دیئے اور بولی "وینی!

چلو آج وشیشری کے ہاں چلیں۔ کل تو آئی تھی ادھر۔ آج اس نے شکل ہی نہیں دکھائی۔"
کرشنا وینی نے اپنا چھوٹا سا، خوبصورت سر ہلا دیا اور پنکھے کی ڈنڈی کو قالین پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "ان پورنا! مَیں باہر نہیں جا سکتی۔"
"کیوں نہیں جا سکتی باہر؟" ان پورنا نے حیران ہو کر پوچھا۔
وینی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ان پورنا کے گلے میں بازو ڈال دیئے۔ بولی "دیدی ——" اور اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہہ گئی۔ ان پورنا اچھل پڑی بولی۔
"سچ!"
وینی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ مَیں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔
وینی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ ان پورنا نے تالی بجائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وہ بھی اپنی کھڑاؤں پر گھوم گئی اور سامنے رسوئی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جہاں اماں بیٹھی زمین قند چھیل رہی تھی۔
اُن پورنا نے کہا۔ "اماں ——"
اماں نے سر ہلا دیا۔ ان پورنا اس کے قریب پہنچ کر جھک گئی۔ اور اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ اماں کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اُس کے گالوں پر ایک تمتماتی ہوئی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر ایک مسکراہٹ ناچتی ہوئی اس کے چوڑے چکلے چہرے پر چوگان کھیلنے لگی۔ اماں نے چاقو اور زمین قند کو ایک طرف رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔
"پنتلو گارو (پنڈت جی)"
میرے لئے یہ سب ایک پہیلی سے بڑھ کر تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیم راؤ اس سے کورے ہیں۔ وہ اُٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ریل گاڑی

بیں بیٹھا ہوں۔ جو وندنا کی ہوئی ایک سرنگ میں سے گذر رہی ہے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ کوئی عورتوں کی بات ہوگی یہ سوچتے ہی سرنگ ختم ہو گئی۔

کرشنا وینی نے پہلے کبھی وہ سبز رنگ کی ہلکی گھگھری نہ پہنی تھی۔ گھگھری کا رنگ گہرا سبز تھا۔ اور انگیا کا پھیکا سبز۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں بھی سبز رنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ یہ رنگ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ سوال مجھے اس سے ضرور کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے لہو میں کس نے سونا پگھلا کر ڈال دیا تھا؟ مانگ کیا تھی پوری پوری پگ ڈنڈی تھی۔ کیا مجال کوئی لٹ پھسل جائے، کوئی بال سرک جائے۔ کنگھی چوٹی کا فن جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ ناک کی سیدھ رکھ کر سر کے بیچوں بیچ مانگ کاڑھنا ان پورنا کی ٹیڑھی مانگ سے کہیں سندر لگتی تھی۔ اس وقت دونوں بہنیں میرے قریب بیٹھی ہوتیں تو میں اپنا ووٹ چھوٹی بہن کے حق میں دیتا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد پورے گیارہ بجے اندر سے وینا کے سُر سنائی دیے۔ صرف ان پورنا ہی کی وینا تو یہ رنگ نہیں جما سکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ محلے بھر کی وینا بجانے والی سہیلیاں سُر میں سُر ملا کر کوئی راگ سادھ رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا خوشی تھی؟

بہت سی عورتیں اور لڑکیاں جن کا ٹھٹھا اور ہنسی مذاق ہوا کو چیرے ڈالتا تھا۔ آخر کس تقریب پر بلائی گئی تھیں؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ بائیں کھڑکی کا پردہ سرے سے ذرا سرکا کر مَیں نے آنگن کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کرشنا وینی سامنے والے کمرے میں پیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہے اور دروازے کے قریب آرتی اتاری جا رہی ہے۔ تھال میں کنکم نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی جوکھا دیا نہیں جلایا گیا تھا۔ کرشنا وینی نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ اتنی بھی کیا لاج تھی؟ یا کیا یہ کوئی دیوی بننے کا اپائے تھا؟

کرشنا وینی کی ماں کو بدھائیاں مل رہی تھیں۔ ان پورنا کی وینا سب سے زیادہ چمک رہی تھی۔ رنگا رنگ کی ساڑھیاں میرے ذہن میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ ابھی ایک بجی

رونے لگی۔ اسے ایک کیلا مل گیا۔ ادھر ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے منہ میں گڑ اور تلوں کا لڈو ڈالنے لگی کہ ایک لڑکا اچک کر اسے چھین لے گیا۔ کچھ پروا نہیں لڈوؤں کی کیا کمی ہے، بھائی خوش رہے۔ جیتا رہے۔ ... میری فطرت کے ایک پراسرار کونے میں کوئی تان سین جاگ اٹھا جسے ان پورنا نے اپنے گیت کی لہروں پر اٹھا لیا۔ یہ کیسا گیت تھا، شاید یہ دودھ اور شہد کا گیت تھا۔ دودھ دوہتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ کچھ ایسی ہی آواز ان پورنا کی وینا پر پیدا ہوئی تھی۔

"اب تم گاؤ، وشیشری!"

"تم سے اچھا تو نہ گا سکوں گی۔ ان پورنا! اچھا بتاؤ کونسا گیت گاؤں؟"

"وہی جو تم نے اس روز گایا تھا جب وینی کی طرح میں نے پیلی دھوتی پہنی تھی اور اسی طرح اسی آنگن میں —— برکت والے آنگن میں، عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوئی تھیں —— وہی شہد کی مکھیوں کا گیت۔"

وشیشری نے گانا شروع کیا۔ آندھرا دیش کی شہد کی مکھیاں کیا کہہ رہی ہیں، یہ سوال میرے ذہن کی چار دیواری ہی میں بند رہا۔ وینا کے سُر آگے بڑھتے گئے۔ یہ کوئی معمولی گیت نہ تھا۔ صدیوں کی نسوانیت کا جذبہ بہ تیزی تھا۔ ابھی تو دوپہر تھی۔ لیکن ہر عورت اور لڑکی کی پیشانی پر ایک چاند نظر آ رہا تھا —— کنکم کے سُرخ بندو!

کرشنا وینی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں کیا یہ وہی لڑکی تھی جسے اب تک کبھی اپنی چوکڑی نہ بھولی تھی؟ اس کے آویزے ساکن تھے، ان کے نگینے چپ تھے۔ لاج اور دوشیزگی پہلے تو کبھی یوں توام بہنوں کے روپ میں نظر نہ آئی تھیں۔ مگر وہ کوئی کبوتری تو نہ تھی جسے پہلی بار انڈے سینے سے سابقہ پڑا ہو۔

ٹھٹھا اور ہنسی مذاق خاموشی میں بدل گئے۔ گیت بھی کافی ہو چکے تھے۔ ویناؤں کے تار تھک گئے تھے۔ کرشنا وینی کی ماں اور بہن نے کنکم کی تھالیاں اٹھا کر ہر کسی کی پیشانی

پر پھر سے نئے بوٹو لگا دیئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پہلے لگے ہوئے بوٹو ہی جلی کر دیئے گئے۔ ایسا دن تو بہت مبارک تھا۔ ہر کسی کو پان پیش کیا گیا۔ ناریل اور کیلے تقسیم کئے گئے اور یوں سب کو وداع کیا گیا۔ صدیوں سے یونہی ہوتا آیا تھا۔ کنکم کے سُرخ بوٹو اَن گنت نسلوں سے قائم رہے تھے۔ ان کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے نہیں دیا جائے گا۔

دوسرے روز یہ محفل شام کے قریب جمی۔ پھر تیسرے روز بھی شام ہی کو۔ چوتھے دن شام کی بجائے صبح ہی کو یہ رونق شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں مجھے پتہ چل چکا تھا کہ کرشنا ویی رجسولا ہو گئی۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسی رسم میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

بھیم راؤ کی باتوں میں میناکاری کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بولے "چھوٹی شرم میں آندھر دیش کوئی وشواش نہیں رکھتا۔ سچ کہتا ہوں، مجھے تو حیرانی ہے۔ یہ سُن کر کہ آپ کے ہاں ایسی کوئی رسم منائی نہیں جاتی۔"

"جی ہاں حیرانی تو ہونی ہی چاہیے۔" مَیں نے بڑھاوا دیا۔

"کتنا فرق ہوتا ہے دھرتی دھرتی کا۔"

"یہ تو ظاہر ہے۔"

"رجسولا ہونے پر تو گویا کنیا کو قدرت کا آشیرباد ملتا ہے۔"

"آپ کا مطمحِ نظر بالکل ٹھیک ہے، مسٹر راؤ اور ایسے موقع پر خوشی منانے سے ہرگز نہ چوکنا چاہئے۔"

ہمارے یہ گیت آپ کو کیسے لگتے ہیں؟"

"یہ سب گیت، دیتا ہے یہ شعر آندھر دیش کے ابدی بول معلوم ہوتے ہیں۔"

"آندھر دیش کے ابدی بول! ہماری یہ رسم بہت پرانی ہے۔"

"ضرور پرانی ہو گی۔"

پہلے روز جب کنیا کو اپنے رجسولا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح فوراً ماں تک یہ خبر پہنچا دیتی ہے۔ تین دن تک اُسے ہلدی کے پانی میں رنگی ہوئی دھوتی پہن کر ایک الگ کمرے میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ کوئی اُسے چھوئے گا نہیں۔ اس کی آرتی بھی دُور ہی سے اُتاری جاتی ہے۔

"آرتی میں ہمارے ہاں جلتا ہوا دیا، چومکھیا دیا نہ بھی ہو تو پروا نہیں، ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں ــــ"

"فرق تو ہوتا ہی ہے۔ دھرتی دھرتی کا رہما رے ہاں بس کنکم ہی سب سے ضروری مان لیا گیا ہے آرتی کے لئے؟"

"سُرخ کنکم؟"

"کنکم ہمیشہ سُرخ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ بھیم راؤ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کھانے میں بھی رجسولا کو کافی پرہیز کرنا ہوتا ہے۔ سُرخ مرچ اور گرم مسالے اس کے لئے منع ہیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کھچڑی دودھ اور کچھ پھل مل جاتے ہیں۔ کھائے اور پُورا آرام کرے۔ یہ ضروری ہے۔"

"تین دن کے بعد کیا ہوتا ہے؟" میں نے پھر بڑھاوا دیا۔

"کنیا اشنان کرکے پوتر ہو جاتی ہے۔ اُس کی وہ پیلی دھوتی گھر کی دھوبن کو بطور تحفے کے دے دی جاتی ہے۔ اب وہ ماتا پتا کی حیثیت کے مطابق نئے وستر پہن کر بیٹھتی ہے۔ اور یہ چوتھی یعنی آخری آرتی اُتارتے وقت اُس کی پیشانی پر بوٹو لگایا جاتا ہے۔"

"بوٹو کے لئے کنکم نہ ہو تو آندھر دیش کا کام ہی نہ چل سکے۔ مسٹر راؤ!"

"کنکم! یہ تو ضروری ہے۔"

"بلکہ یہ کہئے کہ آندھر دیش اور کنکم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔"
"بس اب آپ نے ٹھیک سمجھ لی ہے بات۔"
"میرا رجحان شروع سے سبز رنگ کی طرف رہا ہے، مسٹر راؤ!"
"سبز رنگ کی طرف؛ لیکن سُرخ رنگ نرالی زبان میں بولتا ہے۔۔۔۔ کنکم کا پیغام آندھر دیش صدیوں سے سُنتا آیا ہے۔"
"رنگوں کا مطالعہ میں نے بھی کر رکھا ہے، مسٹر راؤ! سبز رنگ کی اپنی جگہ ہے۔ یہ شانتی کا رنگ ہے۔ ہر سبز چیز امن و سکون کا اشارہ کرتی ہے۔ قدرت کو شاید یہی رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ جب تک دھرتی بنجر نہیں ہو جاتی۔ اس کی کوکھ سے اس رنگ کے کارنامے ہمیشہ ہمارا دھیان کھینچتے رہیں گے۔ کانگرس نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جھنڈے پر اس رنگ کو اس کی جگہ دینے کی بات فراموش نہ کی۔ اور سفید رنگ؛ سفید رنگ میرے خیال میں پوترتا (پاکیزگی) کا رنگ ہے۔ ہمارے جھنڈے پر بھی یہ رنگ بھی موجود ہے اور سُرخ رنگ؛ میں سمجھتا ہوں یہ خون کا رنگ ہے۔۔۔۔ اچھے تندرست خون کا رنگ۔۔۔۔ تازہ مضبوط زندگی کا رنگ۔۔۔۔ سبز، سفید، سُرخ۔ خوب رنگ چُنے ہیں۔ کانگرس نے یہ جھنڈا بنانے کا کام آندھر دیش کے سپرد کیا جاتا تو سارے جھنڈے پر کنکم ہی کنکم پھیل جاتا۔"
"لیکن یاد رہے کہ سُرخ رنگ کا مفہوم سمجھنے میں آندھر دیش نے خوب قدم بڑھایا ہے۔۔۔۔ کانگرس کے بائیں ہاتھ نے ادھر جو زور پکڑا ہے وہ بھی ظاہر ہے پچھلے دنوں جب شری سبھاش چندر بوس کانگرس پردھان کے انتخاب میں دوبارہ کھڑے ہوئے تو آندھر دیش کے ووٹ بہت بھاری تعداد میں انہیں کو ملے تھے۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہونے والے ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا آندھر دیش کے اپنے آدمی ہیں مگر آپ جانتے ہیں ان باتوں میں لحاظ داری تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ سوشلزم اور ہندوستان کی آزادی

ہمارے دو بڑے آدرش ہیں۔ اور آندھر دیش کو الگ صوبے کا وقار حاصل ہو جائے۔
اس کے لیئے ہم اپنی جانیں لڑانے پر آمادہ ہیں۔"
"پنتلو گارو (پنڈت جی!)" باہر سے کسی نے آواز دی۔
بھیم راؤ باہر چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ
کسی کے غیر مرئی ہاتھ میری پیشانی پر کنکم کا بوٹا لگا رہے ہیں۔ میں جھٹ وہاں سے ہٹ
گیا اور کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بائیں کھڑکی کا پردہ ہولے ہولے ایک کونے
سے سرکایا۔ سامنے بڑی خوشنما مجلس نظر آرہی تھی۔ کرشنا وینی نے ہلکی نیلی انگیا کے ساتھ
گہری نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آویزوں کے نگینے سردئی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے
ذہن کے بچے کھچے سبز رنگ نے ان رنگینیوں میں پناہ پالی ہے۔
ان پورنا نے وینا پر ملہار کا الاپ شروع کیا۔ اُس کی اُنگلیاں بہت ٹھمک ٹھمک
کر چل رہی تھیں مگر اس راگ سے بھی کرشنا وینی کی آنکھیں اُوپر نہ اُٹھیں۔ ان پورنا آسمان
کی طرف دیکھ رہی تھی اور کرشنا وینی دھرتی کی طرف آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ کس
نے چھُو دیا تھا اپنے غیر مرئی...... ہاتھ سے اس کنیا کو؟.......... ہر رجسولا تو یوں
چھوئی موئی بن کر نہ رہ جاتی ہو گی...... ہلکی نیلی انگیا، گہری نیلی ساڑھی اور آویزوں
کے سردئی نگینے!...... باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آرہا تھا۔
"بہت ہو چکی یہ لاج دینی" ان پورنا بولی "میں بھی ہوئی تھی رجسولا تیری طرح میں
نے تو پہلے ہی روز کے بعد سے مسکرانا شروع کر دیا تھا، اوپر دائیں بائیں، سامنے دیکھنا
شروع کر دیا تھا۔"
"تم بھی ایک ہی ہو مجھے ستانے والی پورنا!"
"میں تو کبھی نہیں ستاتی کسی کو۔"
کرشنا وینی کے چہرے پر ہولے ہولے وہی پرانی شوخی آ گئی۔ اماں نے آگے

بڑھ کر کنکم اٹھایا اور اس کے بوٹو کو جلی کر دیا۔

کرشناوینی اب کوئی چھوٹی موئی نہ تھی۔ ہر چہرے کی طرف اس کی آنکھیں اٹھ جاتی تھیں۔ کالی جھیلوں میں نہ جانے کتنی لہریں تھرک رہی تھیں ..... کرشناوینی کے صندلی بازو، جنہیں دیکھ کر تازہ تازہ رندہ کئے جانے کا گمان ہوتا تھا، اوپر اُٹھے اور اس نے سب کو نمسکار کیا۔

سب عورتیں اور لڑکیاں مسکرائیں۔ سب کے سُرخ بوٹو تازے کنکم سے جلی کر دئے گئے۔ جانے کیا کہہ رہی تھیں کاجل کی لکیریں ہر آنکھ میں؟ ..... پان بٹے — سبز پان، جو اپنے سینوں میں سُرخ رنگ چھپائے پڑے تھے۔ کیلے بٹے۔ ناریل بٹے۔ سب اُٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ..... کیا لے کر رنگین تھیں یہ ساڑھیاں! کیا لے کر سُرخ تھی یہ زمین؟ — اس کے خط، اس کی قوسیں — ہونٹ، گال، آنکھیں، سینے؟ کون فنکار ان کی تخلیق کرتا تھا؟ کون تھا۔ جو زمین کی ہر بیٹی کو ٹھیک وقت پر رجسولا بنا دیتا تھا؟ .... یہ تو بہت ضروری تھا۔ ان گنت صدیوں سے، سبز سفید اور سُرخ صدیوں سے یہی ہوتا آیا تھا۔

سب عورتیں چلی گئیں۔ سب لڑکیاں بھی تتر بتر ہو کر اپنے اپنے گھر کو بھاگ گئیں۔ اب صرف کرشناوینی اور ان پورنا رہ گئیں۔ اماں رسوئی میں جا چکی تھی۔

"اچھا پورنا، ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھو پوچھو۔"

"رجسولا ہو کر بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی۔ بھلا کیسے؟"

"کیسے؟ یہی ہوتا آیا ہے، بہن، شروع دُنیا سے، میں کونسی کمزور ہو گئی تھی؟ بلکہ رنگ نکھر جاتا ہے۔ اس سے ..... پھر ..... ہر مہینے!"

ہر مہینے؟

"چپ ویبی کوئی سُن لے گا۔"

پھر دونوں بہنیں اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اپنے سُرخ قالین پر لیٹ گیا۔ میری روح کی گہرائیوں سے ایک خیال اُٹھا اور باہر سے آنیوالی ہوا کے جھونکے سے ٹکرا گیا۔

میرے ذہن میں کانگریس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سبز، سفید اور سُرخ — اس جھنڈے کی عمر بہت زیادہ تو نہ تھی مگر یہ رنگ تو پُرانے تھے — ہمالہ کے ہم عمر رنگ، گنگا، برہم پتر اور گوداوری کے ہم عمر رنگ! ہو گا ان رنگوں کا اپنا اپنا مفہوم۔ مگر میں تو اس مفہوم پر لٹو تھا جو خود ہندوستان نے ان رنگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا ...... اور میری آنکھوں میں وہی لاری پھرنے لگی جس پر سوار ہو کر میں بھیم راؤ کے مکان تک پہنچا تھا۔

دائیں بائیں آمنے سامنے، جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی، سُرخ زمین لیٹی ہوئی تھی — ایک رجسولا کنیا کی طرح وہ آرام کر رہی تھی — وہ وقت مجھے بہت قریب آتا دکھائی دیا۔ جب اس کی کوکھ ہری ہو گی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا جو یہ آواز بلند پکار کر کہہ اُٹھے گا — ہوں کی سجے — اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اُگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے ؛



راجندر سنگھ بیدی

میں راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور چھاؤنی میں پیدا ہوا۔ تنخواہ ملنے کا دن تھا۔ ظاہر ہے گھر میں سب لوگ خوش ہوں گے۔

بچپن کا پہلا حصہ دیہات میں اور بقیہ لاہور میں گذرا۔ کچھ دیر ایک ریاست میں بھی رہا۔ شمال میں درہ خیبر اور جنوب مشرق میں علی گڈھ سے پرے سفر نہیں کیا۔ ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ ریاضی میں ہمیشہ اتنا ہی کمزور رہا۔ جتنا ادبیات میں اچھا۔

والد کھشتری تھے۔ والدہ براہمن —— ذات پات کی پابندی کے دنوں میں ان کی شادی کیونکر ہوئی یہ آج تک صیغۂ راز میں ہے۔ اتنا جانتا ہوں کہ یہ اتصال قطعاً غیر رسمی تھا۔ والد صاحب خوبصورت انسان تھے اور والدہ بدصورت تھیں۔ قدرت کی ستم ظریفی سمجھئے کہ شکل کے اعتبار سے دونوں میں جو چیز بری تھی وہ ہم بہن بھائیوں کے حصے میں آئی۔

شکلوں کے اس تضاد کے باوجود میرے والدین میں بہت ہم آہنگی تھی۔ ہمارا وجود اس کا نتیجہ محض نہیں بلکہ اس اتصال سے جو کچھ ظاہر ہوا وہ میرے افسانے

ہیں ـــــ والد صاحب رات کو دیر تک والدہ کو دو پیسے روزانہ کرایہ کے ناول، شرلک ہومز کے کارنامے اور ٹاڈ راجستھان سنایا کرتے تھے اور ہم بچے بستروں پر دبکے ہوئے سُنا کرتے۔

والد صاحب کی ایک دو عادتیں مجھے بیک وقت اچھی اور بُری لگتی تھیں۔ بات بات پر فارسی کے اشعار پڑھنا اور پڑھتے پڑھتے رونے لگنا اور والدہ کی انکی سہیلیوں میں ہر دلعزیزی۔ ہمارے گھر میں بہت شور برپا ہوتا تھا۔ شور، شور، شور ـــــ اور اس کے بعد یک لخت رات کا سناٹا اور بھی بڑا شور سجھائی دیتا تھا۔

شروع میں انگریزی اور پنجابی میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنے کی غرض سے اُردو میں لکھنے لگا۔ پہلے مقبول عام افسانے "بھولا" "گرم کوٹ" "پان شاپ" "دس منٹ بارش میں" اور "ہمدوش" وغیرہ تھے۔ پھر وہ کتابی صورت میں "دانہ و دام" کے نام سے شائع ہوئے۔ کتاب اتنی پسند کی گئی کہ اُردو کی متعدد کتابوں کی طرح تین سال میں اس کا پہلا ایڈیشن بھی نہیں بک سکا۔ (میرے پبلشر بالکل ایماندار ہیں!)

طبیعت میں تلون زیادہ ہے۔ انقلاب کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتا ہوں۔ ایک جگہ اور ایک صورت میں دیر تک نہیں بیٹھ سکتا۔ اپنے کمرے میں بھی میز کو کبھی ایک کونے میں اور کبھی دوسرے کونے میں رکھ دیتا ہوں۔ چنانچہ پہلے پوسٹ آفس میں ملازم تھا۔ آٹھ سال کی ملازمت کے بعد پوسٹ آفس چھوڑ دیا۔ کچھ مہینے آوارہ گردی کی اور پھر ریڈیو میں ملازم ہو گیا۔ اور اب ....

مَیں محض افسانے نہیں لکھتا۔ میرے تین بچّے ہیں، ایک مر چکا ہے
ایک بیوی ہے۔ گو ادب میری پہلی محبّت ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی امیر بیوہ
مجھ سے شادی پر رضامند ہو جائے یا کوئی متموّل آدمی مجھے (بایں ہمہ بیوی
بچّے) متبنّےٰ بنالے تو مَیں آرام سے بیٹھا لکھا کروں ۔

پان شاپ

بیگم بازار کی منحوس دکان میں ایک دفعہ پھر بیلدار ڈسوتی کے بھاری پردے لٹکنے لگے، "موجد" دافع چنبل و داد" اور جاپانی کھلونوں کی دکان ——— اوساکا فیئر (جاپان سے متعلق) کے ملازم استعجاب سے تھارو لال فوٹو گرافر کو ادک پلاٹی کا ڈارک روم بناتے دیکھ کر اس کے "تاریک مستقبل پر آنسو بہانے لگے۔

"ایک ماہ سے زیادہ چوٹ نہ سہے گا ..... بیچارہ!"

"دکان کیا ہو گئی ...... بازار سے کچھ ہٹ کر ہے نا، نظر اسے سامنے نہیں پاتی اور بس ......"

——— ایک ماہ، دو اور چار .... تھارو دلال وہیں تھا۔ موجد دافع چنبل و داد اور اوکاسا فیئر کے ملازموں نے حیرت سے انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ جبکہ ۱۱ اگست کی صبح کو انہوں نے ایک جہازی سائز کا سائن بورڈ اس منحوس دکان پر آویزاں ہوتے ہوئے دیکھا۔ ۶ × ۱۲ سائز کے سائن بورڈ پر دلوصورت حروف خالص صنعتی انداز سے ناچتے ہوئے۔ انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کی شکل اختیار کر رہے تھے۔

اوسا کا فیئر کے منتظم صمیم (خانزادہ) نے سلولائیڈ کی ایک بڑی سی گڑیا کے اندرونی فیتے کو اس کے اندرونی قلابوں سے احتیاط کے ساتھ باندھ دیا، تاکہ گاہک کو شکایت کا موقعہ نہ ملے، اور پھر نھارو کی دُکان کے آویزاں سائین بورڈ کو دیکھ کر مُسکرانے لگا۔

"انٹر..... نیشنل فوٹو سٹوڈیو!"

نھارو کا کام بیگم بازار، اس کے تین محلوں، سامنے کے نشیبی چوک، یا چھاؤنی کے ہائی سکول تک محدود ہوگا۔ مگر وہ اپنی دکان کو ایک بین الاقوامی کاروبار سے کم نہیں دیکھنا چاہتا۔ کیا عجب جو اسے کسی دن پیٹروگراڈ۔ ٹمبکٹو یا ہونولولو سے فوٹو کا مال مہیا کرنے کے آرڈر ملنے لگیں..... بہرحال بین الاقوامی نام رکھنے میں حرج تو کوئی نہیں، اس نام سے دکاندار کی فطری رجائیت ٹپکتی ہے۔

مگر افسوس! سودے کی بدعت، ترقی پسند ہندوستانی دکاندار کو بیگم بازار کے نواحی تین محلوں سامنے کے نشیبی چوک، اور چھاؤنی کے ہائی سکول سے دور کیا جانے دے گی۔ وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے گاہک کو پھنسانے کی کوشش میں کسب کمال کی تو دھجیاں اُڑا دیتا ہے۔ گویا اپنے پاؤں پر آپ بیڑیاں ڈالتا ہے۔ اور یوں زیادہ آمدنی کی توقع میں طبعی آمدنی بھی معدوم!

—— نھارو کی دکان پر اس جہازی قد کے سائن بورڈ کے نیچے ایک اور ٹین کی پلیٹ پر "جدید عینک سازی" بھی لکھا تھا۔ ترقی پسند مگر بھولے نھارو نے جدید عینک سازی محض سودے کی بدعت یا نقل میں شروع کی تھی۔ کیونکہ اس کا پڑوسی دُکاندار جرابوں کے کارخانہ کے ساتھ "ٹیٹا گھر" کاغذ بھی فروخت کرتا تھا۔

"۱۱ اگست کی شام کو اوسا کا فیئر کا منتظم صمیم (خانزادہ) اور نھارو کچھ اُداس خاطر ہو کر ملے۔ دونوں کی آمدنی کا بیشتر حصہ تعطیلات گرما یا سرکاری دفاتر کے شملہ

کی طرف کوُچ کی نذر ہو چکا تھا۔ ان دنوں ہیں سٹوڈیوں کے سامنے پان شاپ پر
بہُت رونق رہتی تھی۔

پان شاپ کے پٹے دار تختوں میں کھریا مٹی سے صاف کئے ہوئے شیشے بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ ہلکی سبز جھلک رکھنے والے شیشے کے پیچھے ایک ہک کے ساتھ ایک نفیس طلائی سیکنڈس گھڑی لٹک رہی تھی۔ اس کے نیچے قانون وفقہ کی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی تھیں، شاید کوئی قانون کا بے قانون اور فضول خرچ طالب علم اتنی قیمتی کتابیں کوڑیوں کے مول گروی رکھ کر پیسے لے گیا تھا، کتابوں کے نیچے ایک پُرانی سنگر مشین پڑی تھی، اسے گروی رکھنے والے کو اتنی ضرورت یا اتنی جلدی تھی کہ اس نے مشین پر سے دھاگہ کی گولی بھی نہ اُٹھائی تھی۔

پان شاپ کے ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا گنیش بھی پڑا تھا۔ اور دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی صندوقچی پر اپنی کہنیاں رکھے ہوئے اپنے کسی گاہک سے باتیں کر رہا تھا۔

دو بلا وردی سپاہی پان شاپ کے مالک سے اجازت پا کر برآمدے میں پڑے ہوئے سائیکلوں کے نمبر دیکھ رہے تھے۔

اے ۱۱۷۸۵ —— نہیں۔

اے ۲۲۲۳۱۲ —— یہ بھی نہیں۔

ایچ ۱۰۸۱۰ ۹۷ —— یہ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں چلو۔

ایک عیسائی لڑکی دو دفعہ بیگم بازار میں پان شاپ سے نشیبی چوک اور نشیبی چوک سے پان شاپ کی طرف واپس آئی وہ بار بار غور سے پان شاپ کے اندر دیکھتی۔ اس وقت اس

کے ڈبے ہوئے شانے پھڑ کنے لگتے۔ شاید وہ چاہتی تھی۔ کہ پان شاپ کے اندر بیٹھے ہوئے دو آدمی چلے جائیں۔ اور سپاہی اپنا کام کر کے رخصت ہوں۔ تاکہ وہ تخلیہ میں آزادانہ اپنا کاروبار کر سکے۔ یا شاید وہ اپنا مال گروی رکھتے ہوئے جھجکتی تھی۔ اگرچہ اس کے پاس گروی رکھنے کے لئے کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے قدرے غمدگی سے تراشے ہوئے گسمی لب پھڑکتے دکھائی دیتے تھے۔ اور اس کی بے خواب اور بھاری آنکھیں بیقراری سے پپوٹوں میں حرکت کر رہی تھیں، پسینہ سے سفید ململ کا فراق اس کی پشت پر چمٹ گیا تھا۔ اور پشت کی جانب سے اس کی انگیا کے تناؤ کے ریشمی فیتے شانوں پر گول حکر کاٹتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

آج بہت گرمی ہے ـــ تو یہ اشام کو ضرور بارش ہوگی ـــ اوسا کافیئر کے منتظم نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"تھارو نے یہ بات نہ سُنی، وہ بہت انہماک سے پان شاپ کے اندر دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کانپتے ہوئے اُٹھا اور بولا۔ اس سے تو مَیں بھُو کا مر جانا پسند کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

صمیم نے غور سے پان شاپ کے اندر دیکھا اور بولا "ضرورت مجبور کرتی ہے میرے بھائی وگرنہ کوئی خوشی سے تھوڑا ہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لڑکی پان شاپ سے باہر آئی، اس کے بُشرہ سے صاف عیاں تھا۔ کہ گروی مال پر اس کے اندازے اور ضرورت سے اُسے بہت ہی کم روپیہ ملا تھا۔ نہیں تو اطمینان اور خوشی کی تحریر اس کے چہرے پر ضرور دکھائی دیتی۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اپنے بیمار خاوند پر اپنا سب کچھ لٹا چکی تھی۔ اب اس کے پاس سُنہری بالوں کے سوا گروی رکھنے کے لئے رہا ہی کیا تھا، کاش ان چھلے دار لمبی سُنہری زلفوں کی ہندوستان میں کچھ قیمت ہوتی۔

لڑکی نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھا کر ایک اُنگلی کو جڑھ سے مسلنا شروع کیا۔ اُنگلی پر ایک زرد سا حلقہ نظر آرہا تھا۔ آہ! نامعلوم کتنی ضرورت سے مجبور ہو کر اس نے اپنی عزیز ترین چیز، اپنی رومانوی حیات معاشقہ کی آخری نشانی پان شاپ میں گروی رکھ دی تھی۔ اس لئے اپنے "رنڈوے" ہاتھ سے اپنی سنہری زلفوں کو نفرت سے پیچھے ہٹا دیا۔ کیونکہ ان کی کوئی قیمت نہ تھی، اور پان شاپ کے پہیے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اس نے اپنے حسین چہرے کے دُھندلے عکس کو دیکھا اور رونے لگی۔ . . . کیونکہ وہ حُسن فروش نہ تھی۔

لوہے کی ایک خوردبین نما نال میں تھارو گرگس کے چند ہلکے سے محدب شیشے ڈال کر نصف گھنٹہ کے قریب ایک بوڑھے کی آنکھوں کا معائنہ کرتا رہا۔ بوڑھے کے سامنے کچھ دُور ایک طاق کے ساتھ اُردو حروف تہجی آویزاں تھے۔

تھارو بار بار اس نالی کی درز میں کسی نئے اور ہلکے سے محدب شیشے کو رکھ دیتا۔ بوڑھا کہتا۔

اب "م" تمہارے کوٹ سے بھی بڑی دکھائی دیتی ہے۔

اب "ظ" سے شعاعیں سی نکل رہی ہیں۔

اب "غ" دھندلی اور پرچھائیں دار نظر آتی ہے۔

اب سب حروف دکھائی تو ٹھیک دیتے ہیں —— مگر بہت ہی چھوٹے چھوٹے . . . . تمہارے کوٹ کے بٹن سے بھی چھوٹے۔

وہ بوڑھا کیا جانے کہ اگر کسی محدب شیشے میں سے تمام وہ حروف تہجی اپنے قد و قامت کے دکھائی دینے بھی لگیں تو بھی وہ تھارو لال —— جدید "عینک ساز" اور "نوٹوگرافر" سے ایک دیدہ زیب سیلولائیڈ کا فریم کیا ہوا چشمہ لگوا کر ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائے گا۔

ڈیڑھ گھنٹہ کی "سائنٹیفک" دیکھ بھال کے بعد تھارو نے شیشے کا نمبر ایک کاغذ پر لکھا۔ اور عینک بوڑھے کو دے دی۔

بوڑھا ان امیر گاہکوں میں سے نہیں تھا۔ جو تھوڑے سے پیسوں کی ادائیگی کے لئے بھی نکیم کا وعدہ کیا کرتے ہیں۔ پیسے اس کی مٹھی میں تھے۔ تھارو لال کے مانگنے پر اس نے چند پسینہ سے تر اور سکے کونٹر پر بکھیر دیئے۔ ان سکّوں کو دیکھنے سے گھن آتی تھی۔ تھارو نے ایک حریصانہ انداز سے سکّے اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لئے۔ اور اپنا ہاتھ پتلون سے پونچھنے لگا۔

تھارو نے ایک مغرورانہ انداز سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر کا شریف آدمی جس کا مُنہ کان تک تمتما رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پان شاپ کے سامنے کی تین سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ نیچے اُترتے ہوئے اس پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھڑیا مٹی کے صاف کئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں سے اپنے پُر شرافت چہرے کے دُھندلے عکس کو دیکھا اور بہت غمزدہ ہو گیا۔ کیونکہ وہ بدمعاش نہیں تھا۔

پان شاپ کا مالک چار دن میں بھی اتنا سود جمع نہیں کر سکتا۔ تھارو نے اپنی جیب میں سکّوں کی کھنکار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

پھر تھارو ایک بے سود، بے حاصل غرور کے جذبہ کے ساتھ آس پاس کے دکانداروں کی آمدنی کا اندازہ لگانے لگا۔

" اس لاحاصل جمع خرچ میں بیگم بازار کے بساطیوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ ان کی آمدنی لامحدود تھی۔ اور تھارو کے محدود تخیل سے بہت ہی پرے۔

ہاں! موجد "دافع چنبل و داد" کے نسخے کی قیمت زیادہ سے زیادہ دو آنے ہو گی۔ گندھک، رال، سہاگہ، پھٹکری ہر ایک ایک حصّہ اور نیلا تھوتھا ½ حصّہ اور ایک مخفی چیز جو اس نسخہ کی کامیابی کی کلید ہے، اور جس نے اس عطار کو موجد کا خطاب دیا ہے، وہ بھی

ایک آدھ پیسہ میں آجاتی ہوگی ــــ اس میں وہ کماتا کیا ہے؟ اوساکا فیئر کے منتظم کو کمیشن پٹہ کی بنا پر ملتا ہی کیا ہوگا؟ ...... ہیئر کٹنگ سیلون والے فی حجامت چار آنے ...... پانچ آنے کما لیتے ہوں گے ....

تھارو نے ایک دفعہ پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے پان شاپ کی طرف دیکھا۔

اس کی پتلون کی جیب میں پسینہ سے شرابور سکے اس کی رانوں کو گیلے گیلے لگنے لگے۔

اس وقت اوساکا فیئر کا منتظم آیا۔

ہفتہ بھر اس کی دکان پر سوائے پرچون کے چند گاہکوں کے اور کوئی نہ آیا تھا۔ دیپو۔ شب برات یا دیوالی میں ابھی اڑھائی تین ماہ باقی تھے۔ کیا اوساکا کا بڑا آفس اکتوبر تک انتظار کرے گا؟ صمیم (خانزادہ) کا چہرہ قدرے سیاہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے گذشتہ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں اتنے معمر دکھائی دینے کی کوئی خاص وجہ تھی۔

صمیم نے اپنے آپ کو آرام کرسی پر گرا دیا۔ تھارو بولا۔ "یہ پان شاپ کا کام ..... ہمارے کاموں سے بیک وقت اچھا بھی ہے اور برا بھی۔"

"اچھا کیسے۔"

آمدنی ــــ ہم کرکس کے شیشے اور فریم خریدتے ہیں۔ عکس لینے کے لئے منفی پلیٹیں اور مثبت کاغذ لاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا نقصان بھی ہو جاتا ہے، پان شاپ میں پلے سے کیا خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی میعاد کے بعد لی ہوئی رقم سے "تگنی" رقم کی چیز چھڑانے نہ آسکے تو سب کچھ اپنا ...... ایک بڑا اسٹاک کار۔"

"برا کیسے۔"

برا ...... برا؟ اس میں دھوکا کا خطرہ ہے، یہ لوگ دوسرے کا مال اپنے پاس گروی رکھتے ہوئے اور بغیر محسوس کئے ہوئے اپنا ضمیر اپنے گاہک کے سامنے گروی رکھ دیتے ہیں۔ اور یہاں سے کبھی کبھی کوئی حسین لڑکی اپنی رومانوی حیات معاشقہ کی عزیز ترین اور

آخری نشانی دے کر حسرت کے عالم میں اپنے رنڈوے ہاتھ کو مسلتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں سنہری زلفوں کی کوئی قیمت ہو۔ تو یہ حریص آدمی ان کو بھی گروی رکھ لیا کریں۔ اگر کسی شریف ادھیڑ عمر کے آدمی کی شرافت بکاؤ ہو ــــ تو یہ لوگ اسے بھی گروی رکھنے سے گریز نہ کریں۔

اور تھارو مسکرا کر غرور سے سکّے اپنی جیب میں اچھالنے لگا۔

دو گھنٹہ سے تھارو نے چند منفی پلیٹیں برفیلے پانی میں ڈال رکھی تھیں۔ اب وہ ان سے مثبت کاغذ پر عکس اتارنا چاہتا تھا۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی گرم ہو چکا تھا، اور منفی پلیٹوں پر مصالحہ پگھل کر لاوہ کی صورت اختیار کر گیا۔ تھارو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ کچھ نہ بولا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کچھ بول ہی نہ سکا۔

یہ اسے چھ روپے کا نقصان تھا۔ ایک عینک کی بچت سے تین گنا زیادہ نقصان، تھارو ایک انگڑائی لے کر ضمیم کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک لمحہ میں اس کی سکت اس کے جسم سے کھینچ لی گئی ہو۔ تھارو ٹکٹکی باندھ کر پان شاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ شیشے کے پیچھے طلائی سیکنڈس گھڑی۔ قانون و فقہ کی کتابوں پہ لٹک رہی تھی۔ ایک کونے میں کانسی اور پیتل کے فلسطینی پیالوں کی سی شکل کے گلدستے اور لمبی لمبی ٹانگوں والے کلنگ پڑے تھے۔ فرنیچر کی دو قطاروں میں اخروٹ کی لکڑی میں کشمیری تراش کا ایک بڑا سا گنیش بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اور ایک دیوار کے ساتھ پان شاپ کا مالک ایک آہنی سیف پر اپنی کہنیاں رکھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔



ادک پلائی کے ڈارک روم میں دم گھٹ جانے پر تھارو نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور پھر مثبت کاغذ پر نقش کو مستقل کرنے والے مرکب کو ہلاتا رہا۔ اس وقت پسینہ اس کی کمر

سے ہو کر گھٹنوں کی پُشت پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

شاید تھارو اوک پلائی کے ڈارک روم میں پگھل کر اپنی جان دے دیتا۔ اگر صمیم اوسا کافیبر کو بند کرتے ہوئے ادھر نہ آنکلتا۔ تھارو نے صمیم کی آواز پہ باہر آتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی قمیص اُتاری اس میں سے پسینہ نچوڑا اور قمیص کو پانی کے ایک ٹب میں چھوڑ دیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ "آج کل ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے؟ ۔۔۔"

اور بین الاقوامی کاروبار کے شائق تھارو نے ایک پھٹی ہوئی بنیان آہستہ آہستہ سر سے نیچے اُتاری۔

پانی کے ٹب میں تھارو کی قمیص کی جیب میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکل کر پانی پر تیرنے لگا۔ اس پر تحریر تھا۔ تین آنے کا مرکب، دو آنے یونین کا چندہ، ایک پیسے کی گنڈیریاں کل سوا پانچ آنے ——

تھارو بولا۔ "یہ میری تمام دن کی آمدنی اور خرچ ہے۔۔۔۔۔۔ تم مجھے کنوارا دیکھ کر مذاق کرتے ہو۔۔۔۔۔ بیاہ۔۔۔۔۔ محبت کتنی میٹھی چیز ہے۔ مگر خالی معدے میں تو پانی کی سی نعمت بھی جا کر تڑپا دیتی ہے۔"

اوسا کافیبر کا منتظم مبہوت بنا تھارو کے غمزدہ چہرے کے ٹیڑھے ٹیڑھے شکنوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اور بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو بھائی۔۔۔۔۔ ایمانداری کے کام میں پڑا ہی کیا ہے۔۔۔۔۔۔ اوسا کا سے چٹھی آئی ہے۔ اگر چھ ماہ کے اندر نقشہ کیفیت میں آمدنی کی مد بھاری یا کم از کم خاطر خواہ دکھائی نہ دی۔ تو یہ دکان دہلی کے دفتر سے ملحق کر دی جائے گی۔

چند لمحات کے لئے دونوں خاموش رہے پھر تھارو بولا۔ "پان شاپ کا مالک دس سے لے کر ۱۲½ فیصدی تک فرنیچر پر دیئے ہوئے روپوں میں سے کاٹ لیتا ہے۔ عام طور پر نیشنل بنک اور پانسے کے سونا پر ایک پیسہ فی روپیہ سود لیتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر ادھر دیکھو،

صمیم تصویر کی طرف مت دیکھو، تمہیں وہ لڑکی یاد ہے نا! جس نے مجبوری اور حسرت کے عالم میں اپنی عزیز ترین چیز پان شاپ کے مالک کو دے دی تھی...... اس کی انگشتری کی قیمت اسّی روپے تھی۔"

خانزادہ اچھل پڑا...... ٹھاکرو بولا۔ "پان شاپ کے مالک نے خود مجھے بتایا ہے...... اس کی قیمت اس نے تیس روپے ڈالی۔ صرف تیس..... میں سچ کہتا ہوں۔ تیس روپے اور ایک آنہ فی روپیہ سود لگایا۔ معیاد ۳۱ر اگست تک ہے۔ ایک دن بھی نہیں...... اس کے بعد وہ انگوٹھی اسی لٹیرے اور درندے کی ہوگی۔

ایک چیتھڑے سے کسی تصویر کی پشت کو کبوتروں کی بیٹ سے صاف کرتے ہوئے ٹھاکرو بولا۔ "میری جیب میں کچی کوڑی بھی نہیں...... دکان میں نہ منفی پلیٹیں ہیں نہ مثبت کاغذ، ۲۰۰ بتی کی طاقت کا ایک بلب فیوز ہو گیا ہے۔ میں کام کیسے کر سکتا ہوں۔

خانزادہ نے اوساکا سے آئی ہوئی چٹھی جیب سے نکالی اور شاید دسویں بار اسے پڑھنے لگا۔

کچھ دیر غور و فکر میں غرق رہنے کے بعد ٹھاکرو نے تصویر اور چیتھڑے کو میز پر رکھ دیا اور بولا۔ "بیگم بازار کی منحوس دکان پھر اپنی دکھ بھری کہانی کو دہرائے گی...... عنقریب ہی خالی ہو جائے گی۔ انٹرنیشنل فوٹو سٹوڈیو کا کام پیرا گراڈ، ٹمبکٹو یا ہونولولو تک وسیع ہونا تو ایک طرف رہا۔ وہ تو بیگم بازار سے نیشیبی چوک تک بھی پہنچنے سے قاصر رہا...... اور کیا بھائی...... آج کل، ایمانداری کے کام میں رکھا ہی کیا ہے؟........

صمیم نے سر اٹھا کر دیکھا سامنے ٹھاکرو کھڑا تھا۔ جس کا جسم و روح دونوں ارتقا پذیر ہو چکے تھے ✦

پان شاپ کا مالک اور تھارو مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کا مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ یکایک پان شاپ کے مالک نے تھارو کو اندر لے جا کر ایک چھوٹا سا کاغذ سامنے رکھ دیا۔

تھارو کا چہرہ کان تک تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے ہکلاتے ہوئے اس نے کہا۔

"دس فیصدی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ د ۔ ۔ ۔ د ۔ ۔ ۔ ۔ س فیصدی تو بہت ہے۔"

"تمہیں یہ خاص رعایت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ورنہ بارہ سے کم نہیں۔"

"تم کیمرہ کو فرنیچر میں کیوں گنتے ہو۔"

"اور وہ زیورات میں بھی تو شمار نہیں ہو سکتا۔"

تھارو لال نے پھر ایک دفعہ کاغذ پر نظر ڈالی، اور اپنی شعلہ فگن آنکھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"۳۱ اگست کو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ یکم کی شام تک بابو لوگ یکم کو ہی پیسے دیتے ہیں۔"

"بات صرف یہ ہے کہ ۳۱ اگست کی رات کو میں شملہ جا رہا ہوں —— ورنہ یکم ہو جاتی تو کیا پرواہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ عموماً اس معاملہ میں گاہکوں کی رضامندی ہمیں مطلوب ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔"

مقامی کاٹن مل کے ہڑتالی مزدوروں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے ایک شخص باہر نکلا۔ انگلی سے پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے پان ٹکٹ نکالی اور بیالیس روپے پان شاپ کے مالک کی میز پر رکھ دیئے اور سنگر مشین چھڑوا کر اس تیزی سے بھاگا کہ دھاگا کی گولی دوکان کے اندر گر کر اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی ہوئی دروازے کی ایک درز میں ٹوٹ گئی۔

تھارو نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ پان شاپ کے مالک نے ایک ڈبیہ کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا، ایک گواہی بھی ڈلوا دو نا . . . خی خی . . . . رسمیہ طور پہ ضرورت ہوتی ہی ہے نا . . . . خی خی . . . .

"گواہ کس کو لاؤں ؟"

"اوساکا فیئر کے منتظم کو لے آؤ۔"

تھارو کے ہاتھ زیادہ کانپنے لگے۔ وہ بھی صمیم کی طرح معمر نظر آنے لگا۔ تھارو کھنگارتے ہوئے بولا۔ "مگر صمیم کے سامنے میں روپیہ لینا نہیں چاہتا۔"

پان شاپ کا مالک ڈرامائی انداز سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس نے سامنے لٹکتے ہوئے جھومروں کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ " وہ صمیم کی بیوی کے ہیں۔"

اب تھارو نے جانا۔ کہ کیوں صمیم ایک ہفتہ میں ہی معمر دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے چپکے سے سند پہ بھی دستخط کر دئے۔ پان ٹکٹ ہاتھ میں لیا۔ اور کسی دوسرے دکاندار کی گواہی ڈلوا دی۔

پھر وہ پان شاپ کے پہیئے دار تختوں میں کھڑیا مٹی سے صاف کیئے ہوئے خوبصورت شیشوں میں اپنے معمر اور دیانتدار چہرے کے دھندلے عکس کو دیکھتے ہوئے پان شاپ کی سیڑھیوں پر سے اُترا۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں ——— کیونکہ وہ ایمان فروش اور بدقماش نہیں تھا۔

۳۱ اگست تک تھارو سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ وہ اس رسی کی مانند ہو گیا تھا جو جل جانے کے بعد بھی ویسی ہی صورت رکھتی ہے۔ اسے کسی طرف سے آمدنی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس پہ سکرات کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ جب کہ آدمی مایوس ہو کر آسمان کی طرف سر اُٹھا دیتا ہے . . . . ایماندار کی خدمت کرتا ہے . . . . ایمان کی کمائی . . . . ایمان کی کمائی میں برکت، ایمان . . . . لعنت ! . . . .

اوساکا فیئر کا منتظم ٹھارو کے پاس آیا۔ مایوسی کے انداز سے اس نے اپنے آپ کو ایک کرسی پر گرا دیا۔ اور بولا۔" پان شاپ۔۔۔۔ میں ایک کیمرہ دکھائی دیتا ہے۔"

ٹھارو لال نے شرمندہ ہو کر سر اٹھایا۔ اور ایک گہری نظر سے پان شاپ میں دیکھتے ہوئے بولا۔" ہاں ـــــ دکھائی دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ اور جھومروں کی ایک جوڑی بھی ـــــ"

خان زادے نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔" کتنی میعاد ہے؟"

" ۳۱ر اگست ۔۔۔۔۔۔ اور تمہاری۔"

" ۳۱ر اگست "

" کوئی سبیل "

" کوئی نہیں۔۔۔۔۔۔ اور تمہاری؟"

" اوں ہوں "

اور دونوں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے سر گرا دیا ◆

(سید) رفیق حسین جعفری

کشمیر پاکستان کا ایک حصہ

۱۸۹۵ء میں لکھنؤ میں پیدا ہُوا۔ سات برس کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بچپن عجیب طوفانی حالت میں گذرا کبھی بہن کے پاس رہا، کبھی پھوپھی کے پاس، کبھی کسی اور عزیز کے پاس۔ والد کے دوسری شادی کرنے پر ذرا قرینے کی زندگی شروع ہوئی۔ اِس عرصے میں تعلیم کا سلسلہ قطعی بگڑ چکا تھا جو کبھی سُدھر نہ سکا۔ اسکول میں کبھی اچھا طالب علم نہ سمجھا گیا۔

۱۹۱۵ء میں جب ہم سب والد کے ساتھ اٹاوے میں تھے اور میں نویں درجے میں پڑھتا تھا۔ گھر سے بغیر اطّلاع بھاگ کر بمبئی چلا گیا۔ چھ مہینے تک ڈھلائی کے ایک کارخانے میں مزدوری کی۔ دن بھر محنت کرتا اور رات کو پڑھتا۔ پھر انجینیری کے ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخلے کے امتحان میں بیٹھا۔ کامیاب ہُوا۔ گھر پر اطّلاع کی۔ وہاں سے خرچ آنے لگا اور باقاعدہ پڑھنے لگا۔ ۱۹۲۰ء میں انجینیری کا امتحان پاس کیا۔ جب سے اب تک ملازمت کا سلسلہ وقفے دے دے کر جاری ہے اٹھارویں ملازمت ہے۔ سترہ نوکریوں کو استعفے دے چکا ہوں کسی جگہ ایسا نہیں ہُوا کہ لوگ میرے کام سے خوش نہ ہوئے ہوں اور مجھے خوشی سے علیحدہ ہونے دیا ہو لیکن میری اُفتادِ طبع ہی کچھ ایسی ہے کہ مستقل ملازمت نہیں کر سکتا۔ اس وقت بھی یکے

بعد دیگرے تین نوٹس گورنمنٹ کو دے چکا ہوں۔ کہ میں اب یہاں کام نہیں کرنا چاہتا انتظام کر لیا جائے۔ مگر کوئی آدمی نہیں ملتا۔ اس لئے افسران چھوڑنے پر راضی نہیں ملازمت کے سلسلے میں ۱۱-۱۲ برس ترائی کے جنگلوں میں رہنا پڑا۔ بحرِ ہند میں بھی جہاز کی انجینئری کے سلسلے میں چکر لگائے ہیں اور اسی سلسلے میں حج کر چکا ہوں۔ لیکن مجھے دیکھ کر کوئی حشر تک حاجی نہیں کہہ سکتا۔ نکر اور آدھی آستین کی سفید قمیص شائد دس گیارہ برس کی عمر سے آج تک پہنتا ہوں۔

اُردو بالکل نہیں لکھ سکتا۔ املا قطعی دُرست نہیں۔ میری لکھت میں خود نہیں پڑھ سکتا نہ کوئی اور سوائے میری لڑکی کے۔ جس وقت طبیعت موزوں ہوتی ہے اور تصور کے نقشے قلم کے ذریعے سے کاغذ پر اُترنے کے لئے بیقرار ہوتے ہیں تو معمولی معمولی لفظوں کے ہجوں میں دو دو اور تین تین منٹ صرف ہو جاتے ہیں۔ اردو زبان کی گنتی کی چار پانچ کتابیں پڑھی ہوں گی۔ فارسی کبھی نہیں پڑھی۔ مگر بول سکتا ہوں اور چھوٹا موٹا مضمون تک لکھ لیتا ہوں۔ لکھی ہوئی فارسی کی ایک سطر نہیں پڑھ سکتا۔ انگریزی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ غالباً دو ہزار سے اوپر ناولیں اور قصے پڑھ چکا ہوں۔ حافظہ بہت خراب ہے نہ صرف لوگوں کے نام ہی بھول جاتا ہوں بلکہ سب سے زیادہ دقت صورتیں پہچاننے میں ہوتی ہے۔ برسوں کے ساتھ رہے آدمی چھ مہینے کے واسطے الگ ہو جائیں اور پھر ان میں سے کوئی سامنے آجائے تو پنجابی ممالوں کی سی حرکتیں کرنے لگتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں سے ملنے جلنے سے کتراتا ہوں۔ جانوروں سے انتہائی نفرت ہے کبھی کوئی جانور خوشی سے گھر میں پالنے نہ دیا۔

آپ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نے اُردو میں کیوں اور کب سے لکھنا

شروع کیا۔ میری لڑکی اور چھوٹی بہن کو اُردو ادبیات سے بہت ذوق ہے۔ چند سال اُدھر کی بات ہے۔ ان لوگوں نے کسی رسالے کی ایک کہانی کی بڑی تعریف کی اور بڑے شوق سے مجھے سُنانا شروع کی۔ میں درمیان میں اُٹھ کر چلا گیا جس پر دونوں بہت خفا ہوئیں۔ میں نے کہا کہ بھئی چرخے اور کاٹن مِل یا بیل گاڑی اور ریلوے ٹرین میں جو فرق ہے۔ وہی اُردو اور انگریزی ادب میں ہے۔ میں کیا سُنوں، مجھے تو کچھ انگریزی ہی میں مزا آتا ہے۔ انہوں نے اسے میری غلامانہ ذہنیت سے تعبیر کیا اور ملوری زبان سے اس بےرُخی پر بڑی شرم دلائی۔ یہ بھی کہا کہ اگر اُردو لٹریچر آپ کو اتنا ہی کم مایہ نظر آتا ہے تو کچھ آپ ہی لکھ کر اس لٹریچر میں اضافہ کیجئے۔ چنانچہ میں نے ان دونوں کے اصرار سے لکھنا شروع کیا اور جلد ہی میرے افسانے اور مضامین پسند کئے جانے لگے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری چیزیں فن کے اعتبار سے مکمل ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ فنونِ لطیفہ پر غائر نظر رکھتا ہوں۔ اِس لئے آپ ان میں فن کی جھلکیاں ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ زبان نہ جانتے ہوئے بھی لکھ لیتا ہوں۔ شاید یہ لکھنوی ہونے کا فیض ہے۔

انگریزی ناولوں اور افسانوں میں اگر ۷۵ فی صدی عشق و محبّت کا ذکر ہوتا ہے۔ تو کم از کم ۲۵ فی صدی اور مسائل پر بھی لکھا جاتا ہے۔ لیکن اردو میں دو سو فیصدی عشق و محبّت ہوتا ہے، گو اس طرف کچھ مستثنیات نظر آنے لگے ہیں۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ کبھی عشق و محبّت پر کچھ نہ لکھوں گا۔

میں افسانہ لکھنے سے قبل اُس کے پلاٹ اور تمام جزئیات کا اپنے تصور میں مکمل جائزہ لے لیتا ہوں۔ ”کلوا“ میرا پہلا افسانہ۔ اسی نام کے ایک کتے کی کہانی ہے۔ اسے لکھنے سے قبل میں لکھنؤ کی اُن تمام سڑکوں اور گلیوں میں گھوما تھا جہاں جہاں کلوا گیا۔ عیش باغ کراسنگ پر جس جگہ کلوا اُستاد بُوچا کی لاش سونگھتا

ہے۔ وہ جگہ اب تک میری نظروں کے سامنے ہے۔

مصنّفین میں ٹالسٹائی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ زندگی سے الگ آرٹ کا کوئی تصوّر کم از کم میرے ذہن میں نہیں۔

حضرت وُہ تو نکل گئے

میرا اور مسعود کا یہ خیال تھا کہ امتحان کے بعد ہم دونوں دو تین دن اور ٹھہریں گے اور اچھی طرح سے لکھنؤ کی سیر کریں گے لیکن امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی پیسے ختم ہو گئے جس دن آخری پرچہ کر کے ہم ہوٹل میں واپس آئے تو واپسی کے ٹکٹوں کے علاوہ تین چار روپے اور باقی تھے۔ ناچار یہ قرار پایا کہ سامان دُرست کر کے سب تیار کر لیا جائے اور ایک تیز سواری پر بیٹھ کر یہاں کا امام باڑہ گھنٹہ گھر اور چوک کو ایک نگاہ دیکھ ہی آنا چاہیئے۔ پھر آٹھ بجے رات کی گاڑی سے کوچ بول دیا جائے۔ جلدی جلدی سامان دُرست کر کے ہم دونوں امینا باد ہوٹل سے نیچے اُترے۔ پارک کے نکڑ پر یکّوں اور ٹانگوں کا ہجوم تھا۔ اُدھر چلے مسعود سر تھے کہ گھنٹوں کے حساب سے تانگہ ٹھہرالو۔ میں نے اُن کو مطلع کیا کہ وُہ بے دال کے بودم ہیں۔ اس میں زیادہ خرچ ہو جائے گا۔ اس لئے فی الحال یکہ پر ہی اکتفا کرنا چاہیئے۔ اب یکّوں میں تلاش شروع ہوئی مسعود صاحب نے ایک یکہ کی طرف اشارہ کیا۔ اُس میں مضبوط اور تندرست جانور جُتا ہوا تھا۔ میں نے اُن سے انگریزی میں کہا کہ تم میں شۂ لطیف کی کمی ہے۔ ورنہ تیز یکّہ نہ ڈھونڈھتے، اوّل تو یہ کرایہ زیادہ مانگے گا دوسرے آندھی پانی کی طرح گئے۔ اور آندھی پانی کی طرح آئے۔

——— اس طرح کہیں سیر ہوتی ہے۔ آخر ایک یکّہ مطلب کا مجھے نظر ہی آگیا۔ مٹیالہ چھوٹا سا ٹٹّو۔ مونڈی نیچے کئے تین ٹانگوں پر حالتِ مراقبے میں تھا۔ چھوٹے سے یکّے ہیں۔ ٹھیٹ لکھنوی یکّے والے۔ بیٹھے اس پر چار انچ کی دو پلی ٹوپی، چوڑی دام پائجامہ، انگرکھا پہنے، پیر سکیڑے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے عین بیٹھے تھے۔ میں نے مسعود کی طرف غرور کے طور سے ہنستے ہوئے کہا "دیکھو وہ ہے یکّہ جس پر ہم چلیں گے۔"

مسعود بولے۔ "مالک اور گھوڑا دونوں افیونی۔" مجھے بہت بُرا معلوم ہوا لیکن پھر بھی میں نے تمکنت سے ان کو سمجھا دیا "میاں ابھی صاحبزادے ہو، ناسمجھ ہو۔ ابھی فہم نہیں ہے۔ یادِ رفتگان میں غرق ہیں۔ اُجڑے ہوئے دربار اودھ کی نشانیاں ہیں۔ تم ان کی قدر و منزلت کیا جانو۔" یہ کہہ کر میں یکّے کی طرف بڑھا۔ اب سوچا کہ آواز دوں۔ جگاؤں تو کن لفظوں سے کہ تہذیب سے خالی نہ ہوں۔ محاورے کے خلاف نہ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ ڈرتے ڈرتے سوتی ہوئی سنبرک ٹھوڑی پر انگلی چھوائی تو یکّے والے صاحب اس زور سے اُچھل پڑے کہ میں بھی اُچھل پڑا۔ یکّہ بھی ہل گیا۔ ٹٹّو کو بھی کچھ ہوش آگیا۔ دُم کی چوری کو ایک دفعہ داہنے اور ایک دفعہ بائیں طرف ہلا کر پھر غوطہ میں پڑ گیا۔ یکّے والے صاحب نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر لاحول اس پیاری قرأت سے ادا کی کہ اُس میں چار عدد نون غنّے شامل کر دیئے۔ میں نے داد دی "سبحان اللہ آپ تو اچھے خاصے قاری ہیں۔ مگر اس وقت کی قرأت بے موقع ہے، میں تو انسان ہوں۔" بڑے میاں بہت بگڑے "واہ حضرت واہ، یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ اچھیں خاصیں بیٹھے ہٹھائیں مرد آدمی کو چوکاں دیاں اور پھر اب فرماتے ہیں کہ لاحول نہ پڑھیں۔ جی ولاں دیکھئے تو ہمیں ہم تو دو روپیوں کا آسراں لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ بڑے آئیں آکے چوکاں

دیاں" میں نے کہا "ارے بھائی اسی واسطے تو چونکا دیا کہ کچھ مزدوری بھی کرو گے کہ سوتے ہی رہو گے۔ اچھا بتاؤ کتنے گھنٹہ ہو گا" بڑے میاں نے سنبھل کر فرمایا "میاں گھنٹے کاں حساب تو فیشن والے تانگوں سے کیجئے۔ آپ کو چلناں کہاں ہے یہ تو فرمائیں" میں نے بتایا کہ ہم لوگ پردیسی ہیں۔ شہر کی سیر کرنا چاہتے ہیں، چوک سے ہوتے ہوئے حسین آباد اور آصف الدولہ کا امام باڑہ دیکھتے ہوئے واپس آجائیں گے۔ معلوم ہوا کہ چار کوس کا چکر ہے۔ لیکن پردیسی ہونے کی وجہ سے ایک ہی روپیہ لے لیا جائے گا۔ میں خوش ہو گیا۔ لیکن مسعود کا منہ کلکتہ سلیپر کی طرح کھنچا ہی رہا۔ خیر ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے یکے والے صاحب کا نام پوچھا معلوم ہوا کہ "ننّن صاحب" میں نے کہا تو پھر اب چلئے۔ جواب ملا "جیں تو چلتاں ہوں، آپ لوگ تنّیار ہیں۔ میں نے کہا۔ بسم اللہ۔ ننّن صاحب نے پینترا بدل کر فٹ بھر کی لکڑی میں بالشت بھر کا بندھا ہوا تاگا گھوڑی کے کولھوں پر چٹ سے لگایا۔ "ننّخ ننّخ چل ل چل ل" کا حکم گھوڑی کو دیا۔ اس نے چھ دفعہ سر کو اوپر نیچے کیا جیسے کوئی بڑھیا اکھلی میں موسل چلاتی ہو اور بس۔ میں نے کہا جانور تو چلتا ہی نہیں۔ فرمایا "چلتیں ہی چلتیں چلے گا۔ منہ کا نوا نلا تو نہیں ہے۔"

جب آخر گھوڑی چل ہی پڑی تو میں نے پھر ننّن صاحب سے گفتگو شروع کی۔ سب ہی طرح انہیں چھیڑا۔ مگر اللہ کے بندے نے ہاں اور نہیں کے دو جوابوں میں ٹال ٹال دیا۔ کچھ باتیں نہ کیں خاموش ہی رہے۔ چلتے چلتے ایک اجڑے سے بازار میں جا رہے تھے کہ ننّن صاحب بولے۔

(اب ننّن صاحب کی گفتگو بغیر نون غنوں کے لکھی جائے گی تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ ہاں شائقین اگر چاہیں تو خود منواتر غنے نون ملاتے جائیں۔)

ننّن صاحب:۔ میاں صاحب زادے اب دیکھتے ہیں تو آپ کو لئے ہی چلتا ہوں

مزدوری تو میری ہو ہی جائے گی۔ اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو مجھے چار آنے دے دیں۔

مسعود۔ واہ جی واہ ابھی سے۔ اور بڑھن کرو گے کیا۔

ننھن صاحب :۔ حضور ذری کے ذری آپ یہیں توقف کریں۔ بندہ دو چھینٹے لگا کر ابھی آتا ہے۔ طبیعت سُست ہو رہی ہے۔ چونچالی آجائے گی۔ پھر دیکھئے حضور کو کیسی سیر کراتا ہوں۔

مسعود تو نہیں نہیں کہتے ہی رہے۔ مگر مجھے ترس آیا پیسے میری ہی جیب میں تھے نکال کر دے دئے۔ بڑے میاں بولے " واللہ شرافت اسے کہتے ہیں۔ اے میاں سلامت رہیئے " یہ کہہ یکے کو ایک گلی کے پاس چھوڑ چل دئے۔ آدھ گھنٹہ ہم دونوں نے انتظار کیا۔ اس کے بعد آپ آئے۔ اور اب جو آئے تو نہائت شگفتہ۔ خوب باتیں کرنا شروع کر دیں۔

ننھن صاحب :۔ میاں کیا پوچھتے ہیں لکھنؤں کو۔ اب کیا اُجڑ گیا۔ نہ وہ زمانہ ہے نہ وہ باتیں ہیں۔ اسی قیصر باغ میں کیا کیا جشن ہوتے تھے۔ کیسے مہوشوں کے مجمع رہتے تھے۔ کیا کیا محفلیں ہوتی تھیں۔ اب کیا ہے۔ ان آنکھوں سے وہ زمانہ بھی دیکھا اور میاں یہ بھی دیکھ رہے ہیں۔

مسعود۔ بڑے میاں آپ بھی نوابوں میں سے ہیں۔

ننھن صاحب۔ اجی سرکار کوئی نوابوں ہی پر تھوڑے موقوف ہے۔ ہم نے سب کچھ دیکھ ڈالا۔ ہمارے نوابوں سے بڑھ کر وقت ہو گئے اور گذر گئے۔ جدھر سے ہم نکل جاتے تھے لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔ اب کیا رہا ہے۔ سالنسوں کا شمار ہے۔ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ سب چل دئے ہم رہ گئے۔ نواب مسعود قدر اور شکلی قدر ہمارے لنگوٹیا یار تھے۔ آج چھ سات برس کا عرصہ ہوا وہ بھی چل بسے

مسعود - ارے واہ رے بڈھے میں تو زندہ بیٹھا ہوں مجھے مارے ڈالتا ہے۔

میں - چُپ رہو جی بدتمیزی مت کرو - جی ننّن صاحب ۔ تو آپ کا وقت بگڑ گیا؟ پہلے آپ رئیس ہوں گے؟

ننّن صاحب - اے صاحب رئیس کیا چیز ہیں، دولت ہماری غلام تھی - ہم روپے پیسے کی فکر نہ کرتے تھے؟ جوانی کی اُمنگیں تھیں۔ اس وقت کا خیال نہ تھا - خدا طرح طرح سے دیتا تھا اور ہم لٹاتے تھے - ایک ہی جلسے میں رات بھر میں سو اشرفیاں اللہ رکھی پر سے نچھاور کر دیں۔ عیشی باغ میں ساون کا میلا - ہائے ہائے نہ پوچھئے - ہم دولھا بنے پھرتے تھے - لوگ اس کے متمنّی ہوتے تھے کہ ہم اُن سے بات کریں ؎

اے مصحفیؔ میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

پھر اللہ نے دیا اور پھر مٹا دیا - اور پھر دیا اور پھر مٹا دیا - اے صاحب ایک دفعہ آخری موقعہ پھر ہاتھ آیا - مگر لضیبوں کی خرابی سے کچھ نہ رہا - لیکن میاں اب کی دفعہ میرا قصور نہ تھا - حاشا و کلا میرا قصور اس میں نہیں تھا - جو کچھ کیا اغنّن صاحب نے کیا - مٹا دیا - اغنّن صاحب نے - اب وہ بھی روتے ہیں اور ہم بھی ہاتھ ملتے ہیں - میاں صاحبزادے مقدّر کی خرابی اسے کہتے ہیں - ذری سی چوک میں آدمی مارا جاتا ہے - کیا جو کچھ تو اغنّن صاحب نے ہی کیا (ماتھے پر ہاتھ مار کر) افسوس کاش مجھے معلوم ہوتا، میں کیا جانتا تھا - مگر صاحب چوک مجھ سے بھی ہو گئی۔

Not good book

مسعود - ارے بھائی کچھ بتاؤ تو سہی کہ کیا ہوا تھا۔

ننّن صاحب - جی بتاتا ہوں ..... لیکن ..... وہ ..... میاں ایک چوّنی اور دید یجئے، میری آدھی مزدوری تو دیکھئے اللہ آپ کا بھلا کرے ہو ہی گئی ہے اور تکلیف نہ ہو تو ذری دیر بیٹھے رہئے میں ابھی ابھی آیا۔

یہ کہہ چونی اور لے، بڑے میاں پھر یکّے سے اُتر کر ایک گلی میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد پھر تشریف لائے۔ گھوڑی کو بمشکل تمام جب رفتن مصدر کے گیئر میں ڈال دیا۔ تو پھر ہم دونوں نے اصرار کیا کہ ہاں صاحب وہ اغن صاحب نے کیا ستم ڈھایا تھا ہم کو بھی تو ... ہو۔

ننّن صاحب۔ اے حضرت نہ پوچھئے ستم ہی ڈھا دیا کہیں کا بھی نہ رکھا ورنہ آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی۔ صاحب قصّہ یہ ہے کہ خدا مغفرت کرے اُستاد فدّن صاحب مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے، اور میں بھی انہیں اسی نظر سے دیکھتا تھا۔ خدا غریق رحمت کرے بڑے خوبیوں کے آدمی تھے۔ مگر ذرا سنکی تھے۔ جس بات کی دُھن ہو گئی تو ہو گئی۔ ایک دفعہ جو مچھلی کے شکار کی دُھن لگی تو اب طرح طرح کی ڈوریں بندھ گئیں۔ بیسیوں چارے اور جلاب ڈھونڈہ ڈھونڈہ کر تیار کرلئے۔ اُنگل اُنگل بھر کی مچھلیوں سے لے کر دو دو گز کی مچھلیاں پکڑ ڈالیں۔ کیمیا کا شوق ہوا تو سینکڑوں طرح کی جڑی بوٹیاں ڈھونڈ لائے۔ غرضیکہ یہی رہنا تھا۔ کبھی رُمالی ہے کبھی جادو۔ کبھی عملیات ہیں۔ انہیں باتوں کی وجہ سے ہم لوگ انہیں اُستاد کہتے تھے۔ یکّہ و تنہا رہتے تھے۔ یہیں آپ کے حسینا باد میں دو کوٹھڑیاں ایک دالان تھا۔ اس میں پڑے رہتے تھے۔ عجیب صفتوں کے آدمی تھے۔ بہرکار ایک دن دوپہر کو برسات کا زمانہ تھا۔ میں ٹہلتا ہوا اُن کے پاس چلا گیا خاموش بیٹھے تھے۔ میں بھی جاکر پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کہا کہئے فدّن صاحب آج کل کیا سنک ہے، ذرا اُتنک مزاج بھی تھے بگڑ کر بولے۔ سنک ہے سنک تم سنک ہی سمجھتے ہو؟ سنو تم نے کبھی کشف نفس کا عمل بھی سُنا ہے۔ کبھی عمل تقلیدِ خیال بھی سُنا ہے۔ عمل پرواز بھی سُنا ہے؟ میں نے کہا نہیں حضرت میں نے تو ان میں سے کسی کا نام بھی نہیں سُنا۔ بولے۔ پھر کیا بک رہے ہو۔ میں نے کہا قبلہ کچھ تو بتائیے کہ یہ کیا ہوتے ہیں۔ ایک قلمی نسخہ پاس رکھا تھا۔ اس پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ یہ جو کچھ اس میں لکھا ہے

وُہ دو لفظوں میں تم کو بتادوں۔ میاں دن چاہئیں دن۔ ہفتوں لگ جائیں گے۔ مَیں نے کہا اچھا یہ بتائیے کہ ان عملیات سے کیا کیا فائدے پہنچتے ہیں۔ بولے فائدے۔ بڑے عجیب عجیب ہیں۔ مثلاً ایک فائدہ یہی ہے کہ انسان اس عمل سے اُڑ سکتا ہے تمام خیالات فاسق کو علیحدہ کر کے دل اور دماغ کو رُجوع کرنے سے اوّل تو انسان کا رفتہ رفتہ وزن کم ہوتا ہے اور پھر جس میں جیسی مقدرت اور قدرت ہو کافی مشق کے بعد اُڑنے بھی لگتا ہے، وزن تو میں اپنا زائل کر لیتا ہوں۔ ہاں اُڑنے میں ابھی دیر ہے۔ صبح کو ایک اُنگل کے قریب زمین سے اُونچا بھی ہوا تھا میاں آپ یقین کیجئے۔ کہ مجھے ہنسی آگئی۔ استاد قدن صاحب کو میرا ہنسنا بہت ناگوار ہوا کہنے لگے اچھا لے دیکھ، یہ کہہ میرے سامنے بالکل سیدھے ساکت کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وُہ تو خود بخود زمین سے اُونچے ہونے لگے۔ مَیں نے جلدی سے چھت کو دیکھا مگر وہاں رسّی نہ کچھ کوئی ایک بالشت اُٹھ گئے ہوں گے کہ دھم سے پھر نیچے آ گئے، مجھے سخت حیرت۔ بڑا پریشان۔ میں نے کہا۔ اُستاد یہ نہیں۔ اب کی پھر اُٹھو تو جانیں اُستاد تاؤ میں پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ کوئی دس منٹ کے بعد میاں یقین جانئے، اُن کے پیر تو زمین سے اُونچے ہونے لگے۔ قریب ڈیڑھ بالشت کے اُونچے ہو کر کوئی ایک سکنڈ وہیں رُکے رہے اور پھر دھم سے آ رہے۔ لیجئے میاں چوک تو آ گیا۔ گول دروازہ بھی ہے۔ اس کے اندر چوک ہے۔ آپ لوگ جاکر سیر کر آئیں۔ اور میاں اللہ سلامت رکھے ایک چوّنی اور دیدیجئے تو میں بھی دو چھینٹے لگا لوں۔

نبّن صاحب چھینٹے لگانے چل دئے۔ اور ہم دونوں اس گندے تنگ بازار میں پچاس ساٹھ قدم جاکر واپس آ گئے اور پھر یکّے میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد جو بڈھن آئے تو مسعود نے کہا بس اب واپس۔ آپ ہم کو امینا باد ہی پہنچا دیں۔ سیر تو ہو چکی چھ بج رہے ہیں آٹھ بجے کی گاڑی سے ہم کو جانا ہے۔ چنانچہ یکّہ پھر واپس ہو لیا اور نبّن صاحب

نے داستان شروع کر دی۔

نبّن صاحب۔ جی حضور تو مَیں کیا کہہ رہا تھا بھول گیا؟

مَیں۔ ایک بالشت زمین سے اُونچے ہو کر دھم سے پھر زمین پر آ گئے۔

نبّن صاحب۔ جی۔ جی۔ حضور دیکھیں بندے کو کس قدر حیرت اور پریشانی ہوئی ہو گی۔ واللہ مَیں تو سکتے کی سی حالت میں رہ گیا۔ آنکھیں ملیں۔ لاحول پڑھی۔ اپنے ہاتھ میں چٹکی لے کر دیکھی کہ کہیں سو تو نہیں رہا ہوں۔ دماغ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا اُستاد ذرا تسلّی کرو۔ مَیں اپنے ہوش حواس دُرست کر لوں۔ ذرا نگالی نکالو۔ چراغ جلاؤ۔ اُستاد فدّن صاحب اُٹھے۔ سامان دُرست کیا دو ایک دم لگا کر میں نے اُن سے بھی اصرار کیا کہ بھائی صاحب آپ بھی دم لگا لیں۔ خدا مغفرت کرے اُستاد بڑے خوبیوں کے آدمی تھے۔ دوستوں یاروں کی خاطر سامانِ دلچسپی رکھتے تھے۔ خود زیادہ شوق نہ تھا دوستوں کے اصرار پر ان کی دلشکنی بھی نہ کرتے تھے شریک ہو جاتے تھے، جب زمانہ بھی اور تھا ہر چیز سستی تھی۔ خدا کی مار اس زمانے پر۔ سرکار دو ہی چھینٹے لیتے ہیں اور چونی کھٹیا سی نکل جاتی ہے۔ بندہ پرور ایک وہ وقت تھے۔ ڈبل کے چار چُسکے اور چائے کی پیالی کھاتے ہیں۔ اے قبلہ یہیں گول دروازے میں ننھی بلاقن کی دکان پر ملتے تھے۔

مسعود (جھلّا کر) جہنم میں گئی ننھی بلاقن۔ تمہارے اُستاد کا کیا حشر ہوا۔

نبّن صاحب۔ اے ہاں میاں دیکھئے بات میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ تو قبلہ جب نشے پانی سے چونچال ہو لئے تو ہم نے پھر کہا اچھا اُستاد اب سہی۔ اُستاد کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ بولے۔ مَیں تو بھائی بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہوں۔ مشق پر موقوف ہے۔ دماغ کا کام ہے۔ جس قدر دھیان ادھر ہو اتنا ہی اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔ سب دماغی طاقت کا کام ہے۔ انسان کے ارادہ پر منحصر ہے۔ لو دیکھو اب کی دو فٹ تک

اُٹھنے کی کوشش کرتا ہُوں۔ اُستاد فدّن صاحب پھر جو سبد ھے تانت سے کھڑے ہوئے تو اب کی تو ایک ہی منٹ کے بعد اُٹھنے لگے۔ اور اُٹھتے اُٹھتے چھت میں جا لگے۔ سر دھنئی میں چھو گیا۔ سرکار اُس زمانے کے مکانوں کی چھتیں بھی یونہی سی اُونچی ہوتی تھیں۔ ایک منٹ تک فدّن صاحب کا سر دھنیوں کے جالوں میں گھسا رہا۔ اس کے بعد ایک دفعہ دھم سے گر ہی تو پڑے۔ اب کی سنبھل نہ سکے کہنیوں کے بل گرے میں نے لپک کر اُٹھایا۔ سر کا جالا چھڑایا۔ کہا بھائی دم لے لو اطمینان سے کام کرو۔ واللہ یہ تو بڑی بات ہاتھ آ گئی ہے۔ دیکھو خدا کو کیا منظور ہے۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ کوٹھڑی کا دروازہ چوں سے بولا دیکھتا کیا ہُوں کہ اغن صاحب سر ڈالے ہیں۔ بولے "اُستاد کیا ہو رہا ہے۔ میں آؤں؟" اتنا کہا اور ہنستے ہوئے آ گئے۔ اب کیا کہہ سکتا تھا۔ دراصل مجھ سے ہی غلطی ہو گئی۔ مجھے پہلے ہی سے کنڈی لگا لینی چاہئے تھی۔ میں نے اغن صاحب سے کہا۔ اچھا اب کنڈی لگائے آؤ۔ حضرت کو جو سب حال معلوم ہُوا بولے "تو بھائی باندھو سوپ اُستاد کے شانوں پر ہم بھی دیکھیں کیسے اُڑتے ہیں۔" میں نے کہا۔ پھر وہی سفلوں کی سی باتیں شروع کیں واللہ اچھا نہ ہوگا۔ یہ موقعہ دل لگی کا ہے۔ صبر سے بیٹھو اُستاد دم لے لیں۔" اغن صاحب بولے "دم تو یاروں میں بھی لگاؤں گا۔ تم لوگ تو رچے ہوئے ہو۔ کوٹھڑی مہک رہی ہے" خیر میاں دو دو چھینٹے لے لئے۔ ہائے واللہ۔ اُستاد کا بھی کیا دم تھا۔ پھر اصرار کرنے سے شریک ہو گئے۔ تو میاں اُستاد پھر کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا۔ ٹھیرو تسلّی کر لو۔ جلدی سے ان کے پیروں کے نیچے اُن کا لحاف تو شک لا کر بچھا دیا اور کہا لیجئے اُستاد اب غم نہیں چاہے سر کے بل بھی غوطہ کیوں نہ مار دیجئے۔ اُستاد کو بھی اطمینان ہو گیا۔ پھر چھت میں سر لگا کر تین چار منٹ معلّق رہے۔ اور آ گرے۔ میں نے کہا۔ اُستاد۔ اُستادی تو جب ہے کہ آہستہ آہستہ نیچے آئیے۔ یہ بھی کیا کہ ڈھیلے کی طرح بھد سے نیچے آ گرے۔ اے جب دماغی قوت اور ارادے ہی پر موقوف

ہے تو لگاؤ کدّو کا زور، اُستاد نے کہا اچھا۔ پھر کھڑے ہو گئے۔ اب کی گرے تو نہیں۔ مگر ایسے بھی نیچے نہیں ہوئے جیسے کسی کی شرماتی ہوئی نظریں۔ کٹی کنکیا کی طرح اٹّاتے پٹّاتے نیچے آ گئے۔ میں نے کہا "خیر بسم اللہ بری نہیں ہے۔ پھر کوشش کرو۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔" حضور تین چار دفعہ کے بعد اب تو بالکل سہولت سے اُترنے لگے۔ اغن صاحب اور میں دونوں دم دلاسہ دیتے رہے۔ لیکن صاحب اغن کی وہی نادانی کی باتیں۔ اب سر ہیں اُستاد کے۔ میں نے کہا "نہیں اب زیادہ پریشان نہ کرو۔ تھک گئے ہوں گے آرام کرنے دو۔ چلو اب چلیں" میاں میں اُن کو اپنے ہی ساتھ گھسیٹ لایا۔ راستے میں لگے اغن صاحب زمین آسمان ملانے کبھی کہیں "اُستاد کو کلکتہ لے چلیں گے"۔ کبھی کہیں "ٹکٹ لگائیں گے بڑے لاٹ کو تماشہ دیکھائیں گے"۔ میں نے کہا "ابھی رسانیت سے کام لو رسانیت سے۔ روپیہ کمانے کے تو اب لاکھوں طریقے ہیں۔ روپیہ تو اب بہا بہا پھرے گا۔ لیکن پہلے استاد کی مشق پوری ہو جانے دو۔ ابھی تو کھڑے ہی اُٹھتے ہیں۔ لیٹ کر اُٹھنا آ جانا چاہیئے اور سہولت سے اُترنا چاہیئے۔ بلکہ اور بھی اچھا یہ ہو۔ کہ پینگ لیتے ہوئے نیچے آئیں۔ اور پھر اُٹھتے چلے جائیں۔ ایک ہاتھ پھیلا ہوا اور دوسرا سینے پر یہ معلوم ہو کہ خود تو سو رہے ہیں۔ اور کوئی پینگ دے رہا ہے۔ لیکن دیکھو یار اغن یہ سب خاک میں مِل جائے گا۔ جو ابھی کسی کو بھی اس کی رتّی بھر بھی خبر ہو گئی۔ ابھی تو یہ سب راز ہی رہنا چاہیئے اور بھائی آمدنی میں بھی اُستاد کا حصّہ اوّل رکھنا ہو گا۔ دیکھو تم جلدی نہ کرو۔ سہولت سے کام لو۔ میں اُستاد کو راضی کر لوں گا۔ روپے میں چھ آنے اُن کے اور پانچ پانچ آنے ہم دونوں کے" اغن صاحب کی عقل میں بات ذرا دیر میں آتی ہے۔ مگر میاں میرے سمجھانے سے وُہ سمجھ گئے۔ دوسرے دن اُستاد کو میں نے سب اونچ نیچ سمجھائی۔ ہائے کیا معقول آدمی تھے۔ میاں میری سب باتوں پر راضی ہو گئے۔ اب ہم دونوں نے پھر انہیں مشق کرانی شروع کرا دی۔ اے حضرت شام تک اُستاد لیٹ کر

بھی اُٹھنے لگے۔ اللہ نہایت سہولت سے۔ جیسے وہ لیٹے لیٹے آہستہ آہستہ زمین سے چھت تک جاتے تھے۔ ویسے ہی
آہستہ آہستہ پھر نیچے آجاتے تھے۔ شام تک چھت میں جالوں کا نام نہ رہا جب اندھیرا ہو گیا تو میں
نے کہا لو دن بھر ہو گیا ہے۔ آؤ ٹہل آؤ! بھائی تمہاری صحت بھی تو مقدم ہے۔ میوہ
والی گلی تک ہو آئیں۔ میاں یہ میرا بھی ایک خاص اڈا تھا۔ ہاہا! سب مٹ گیا۔
ہاں میاں ہم تینوں چلے۔ مگر میں نے دیکھا کہ اُستاد کی چال میں کچھ فرق ہے۔ کچھ ایسے
چل رہے تھے جیسے .... اجی یہ بچوں کے کھیلنے کے .... ربڑ کے پھکنے ہوتے
ہیں نا۔ ان میں ہوا بھر کر اگر لڑکایا جائے تو وہ اچھلتا اچھلتا لڑھکتا ہے۔ بالکل اسی
طرح سے اُستاد چل رہے تھے۔ میں نے کہا واہ اُستاد کیا بات ہے، اب جو صورت
دیکھتا ہوں تو پریشان، میں نے کہا کچھ بتاؤ تو بولے نہ معلوم کیا ہے مجھے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ میں روئی کا گالا ہو گیا ہوں۔ میں نے ان کا ہاتھ ٹٹولا۔ اماں جاؤ بھی
نہ کہیں۔ اُستاد بولے۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ مجھے پکڑ کر اٹھاؤ تو۔ اغن نے دونوں
ہاتھ اُن کی کمر پر رکھ جو ذری یونہی سا زور لگایا تو کندھوں سے اونچا اٹھا لیا۔
ہیں یہ کیا میں تو دیکھوں۔ حضرت اُن کا تو وزن ہی غائب تھا۔ اُستاد بولے میں سمجھتا
ہوں اگر اُچکوں تو حسینا باد کا امام باڑہ اُچک جاؤں۔ میں نے کہا۔ خدا کا واسطہ
یہ نہ کرنا۔ اوّل تو گناہِ عظیم اور پھر تمام راز افشا ہو جائے گا۔ میں جادوگر کیسے بنوں گا۔
خیر میاں چوک قریب آگیا تھا آتے جاتے لوگوں کی نگاہیں پڑتیں۔ اس لئے ایک
طرف سے میں دوسری طرف سے اغن صاحب اُن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
اُن کو دبائے ہوئے لے کر چلے۔ وہاں پہونچ کر دو ایک چھینٹے اُستاد کو بھی لگوا
دئے اور اسی طرح اُن کو واپس لائے۔ اب میں نے ہزار اغن کو منع کیا مگر نہ مانیں
اُستاد کو پھر کچھ دیر مشق کرائی۔ اب اُستاد لیٹے ہی اونچے ہوں۔ چھت کے ایک کونے
سے پلنگ لیٹے ہوئے زمین تک آئیں۔ اور ویسے ہی اُٹھتے ہوئے دوسرے کونے

میں چلے جائیں۔ خیر میاں اُستاد کو لُٹا کر ہم لوگ چلے آئے۔ صبح کو مجھے جانے میں دیر ہو گئی۔ چھمی کی
کے ہاتھ میں دنبل نکلا ہُوا تھا اس میں نشتر لگوانے انہیں شاہ مینا کے اسپتال لے گیا جب
یہاں سے فارغ ہو کر اُستاد کے مکان پر پہنچا تو اعن صاحب دروازے پر کھڑے تھے۔
منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے کہا خیر تو ہے۔ کہا۔ غضب ہو گیا۔ میں نے کہا۔
آماں کچھ تو کہو۔ بولے۔ کچھ نہ پوچھو۔ اے بھائی بتاؤ تو سہی اماں استاد کیسے ہیں، میاں یقین
مانیے کہ اعن کے آنسو نکل پڑے۔ بولے اندر چل کر دیکھ لو۔ میرا دل دھک سے ہو
گیا۔ اندر گیا۔ اُستاد اچھے خاصے چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ ہاں صورت متفکر تھی۔
اور ان کی گود میں سل رکھی تھی۔ میاں میں اعن کی طرح تو ہوں نہیں۔ میں جا کر اطمینان سے
اُن کے پاس مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اور پوچھا کہئے اُستاد کیا حال ہے۔ اُستاد کچھ دیر تو بولے
نہیں، پھر کہا بات یہ ہے کہ ارادے کی قوت ضرورت سے زیادہ صرف کر دی۔ میرا
وزن گھٹتے گھٹتے بالکل ہی غائب ہو کر اب نفی کی طرف رجوع ہے۔ رات بھر پلنگ پر
بیٹھ نہیں لگی۔ وہ تو کہو لحاف میرا بھاری ہے۔ ساری رات اسی سے چپکا رہا۔ صبح رفع
حاجت کے واسطے اُٹھا تو چھت میں جا لگا۔ جب یہ آئے اور انھوں نے پیر پکڑ کر کھینچے
تو نیچے آیا۔ بیچارے نے پیشاب پیخانہ کرایا۔ منہ دھلایا۔ اب اس سل سے دبا بیٹھا ہوں۔
حضور یہ سب سُن کر فکر تو مجھے بھی ہو گئی۔ مگر میں اپنے کو تھامے رہا۔ کچھ غور اور فکر
کے بعد میں نے اعن کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں میاں ہو نہ صاحبزادے تم اُستاد کو
ہولا ہولا کر مار ہی ڈالتے۔ اللہ نے خیر کر لی جو میں جلدی آ گیا۔ میں نے اُستاد کو دلاسا دیا۔
آپ پریشان نہ ہوں حضور میں اُن کے جوتے لے کر چوک گیا۔ ایک موچی کو دوّنی
تھمائی اور موٹے موٹے سیسے کے سول چڑھوا کر لے آیا۔ جُوتے اُستاد کو دئے۔ کہا
لو پہنو۔ چلو پھرو۔ پریشانی کی کیا بات ہے — ہاں اب الٹی مشق کرنا پڑے گی۔ اُستاد
جوتے پہن کر خوش تو ہو گئے۔ لیکن ان کے دل پر جیسے وحشت سی چھا گئی۔ دماغ کا کام

تھا۔ ارادے کی قوت لگاتا تھی۔ وہاں اُن کی طبیعت اچاٹ۔ کمر میں رسی بندھی ہے۔ چھت میں
چمٹے ہیں۔ ہم دونوں اُن کو نیچے سے ڈھارس دے رہے ہیں۔ ہاں بھائی فدن صاحب
لگاؤ اپنے ارادے کا زور۔ اور اتر دیجیے۔ وہ ایک دو انچ نیچے آتے ہیں۔ اور پھر چھت میں
جا چپکتے ہیں۔ آخر میں نے اغن کو اشارہ کیا کہ تم چپ رہو۔ اُستاد کو ڈوری پکڑ کر نیچے گھسیٹا
کہا بیٹھو جوتے پہن لو۔ دو ایک چھینٹے لے لو۔ گھبراتے کیوں ہو۔ کون سا غضب ہو گیا۔
ہاں پہلے اُوپر کو زور لگاتے تھے اب نیچے کو لگانا ہے۔ بات تو وہی ہے۔ قوتِ ارادہ
ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اُستاد نے کہا مجھے نیند آرہی ہے سوؤں گا۔ میں نے کہا کیا حرج
ہے۔ اُن کے پلنگ کے بیچ بستر کو سلیبوں سے تان دیا اور استاد کو لٹا دیا۔ اُستاد اُس کے
نیچے چپک گئے۔ اب میں نے پھر اغن صاحب کو سمجھایا کہ دیکھو بھائی اُستاد پریشان ہیں
اُن کا دل بہلاؤ۔ تفریح کراؤ۔ جلدی نہ کرو۔ اب اُلٹی مشق کروانا ہے۔ اُن کا دل و دماغ
حاضر ہونے دو۔ سہ پہر کو اُستاد کو جگایا منہ ہاتھ دھلائے۔ چار چھ چھینٹے ہم دونوں نے
لگائے۔ اُستاد کو بھی دو تین چھینٹے لگوا دئے۔ پھر اُن کو لے کر گول دروازے ہوتے ہوئے
میوے والی سرائے گئے۔ پرانے دوست احباب کا مجمع تھا۔ بات چیت میں دل بہلا
استاد گو عادی نہ تھے۔ یہاں افیون نہائت اعلےٰ قسم کی ہوتی تھی۔ خوب گولیاں اڑائیں
سرشار ہو گئے۔ اُن کا غم غلط ہوتا دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہوئی اب ہم تینوں پھر چلے اندھیرا
ہو گیا تھا۔ دوسری تاریخ کا چاند تھا (ہلکی ہلکی چاندنی تھی) یہ ٹھیری کہ گومتی کے کنارے سیر
کی جائے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی اُستاد کی طبیعت تو سنکی ہی تھی سنک آگئی۔ کہیں تو
سوؤں گا۔ نشے کے ایسے زیادہ عادی بھی نہ تھے۔ اُن کا کہنا بھی بیجا نہ تھا۔ مگر وہاں ہم اِن
کو کہاں سلاتے۔ ہزار سمجھایا گیا۔ مگر نہ مانے۔ وہاں شاہی کے پرانے گرے پڑے خالی مکان
تھے اُستاد ایک کو دیکھ کر بولے میں تو یہیں سوؤں گا۔ نہ مانے۔ خیر میں نے جیب سے
رسی نکالی اُستاد کی کمر میں باندھی جوتے اُتارے ان کو ڈیڑھ دو گز اُونچا کر کے رسی اغن صاحب

کودی کہ پیر کے نیچے دبالیں۔ ہم دونوں اکڑوں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں اُستاد سو گئے ہیں نے اغن سے کہا دیکھو اُستاد کی ضد ہے۔ خیر یونہی سہی لیکن بس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ سونے دیں گے۔ میں بیٹھا یہی سوچ رہا تھا۔ کہ کس طرح کا شامیانہ ہونا چاہئے۔ کرسیاں بنچیں کیسی ہوں۔ ٹکٹ درجہ اوّل دس روپے کا ہو کہ زیادہ کا اور ادھر اغن صاحب خود پینک میں آکر مجھ پر لڑھک پڑے میں بھی چونک پڑا۔ بولے اے ہے رسّی چھوٹ گئی میں نے کہا واللہ تم بھی عجیب انسان ہو۔ فدّن صاحب اگر جاگ پڑے اور برسوں کی پرانی چھت اور جالوں میں اپنے کو چمٹا ہؤا پایا تو بہت بگڑیں گے۔ یہ کیا کیا میاں امین آباد آ گیا۔

ہم دونوں چونک پڑے واقعی امین آباد آگیا تھا۔ ہوٹل سامنے تھا مسعود نے گھڑی جو دیکھی بوکھلا گئے "یار پونے آٹھ ہو گئے۔ بڑے میاں یہاں سے اسٹیشن کا راستہ کتنی دیر کا ہے"

"اے حضور دس منٹ کا راستہ ہے بات کرتے ہیں تو اسٹیشن آتا ہے"

مسعود۔ "اچھا تو ہم کو اسٹیشن تک اور چھوڑ دو۔ وہ سامنے ہوٹل میں سامان ہے ہم ابھی رکھے لیتے ہیں" "اے حضور مجھے کب انکار ہے میں خدمت کے واسطے حاضر ہوا۔ پر میاں بُرا نہ مانئے گا۔ یہاں تک کی مزدوری میں وہ چونی اور باقی ہے وہ بھی دیدیجئے۔ اللہ حضور کو سلامت رکھے آپ اسباب رکھیں اور میں ابھی آیا" مسعود صاحب بولے "دے دو بھائی" دو سوٹ کیس دو بستر رکھنے کے بعد چھ چھ انچ جگہ ہم دونوں کو بھی مل گئی۔ اسی پہ بیٹھ کر آدھ گھنٹہ انتظار کیا۔ اب پھر چلے تھوڑی دیر صبر کے بعد مسعود نے کہا "ہاں بڑے میاں صاحب پھر کیا ہؤا" بڑے میاں پھر خاموشی کے ساتھ بولے "پھر کیا ہوتا"

مسعود۔ "آخر"

بڈھا۔ بس اب اپنے نصیبوں کو روتے ہیں۔

مسعود۔ ارے ظالم تو ہؤا کیا۔

بڈھا۔ (بڑی لمبی سانس لے کر) ہوتا کیا اُس کوٹھڑی میں چھت ہی نہ تھی اندھیرے میں لٹکی ہوئی رسّی ٹٹولی نہ ملی تو دیا سلائی جلائی استاد فدّن صاحب کہاں۔ "لے حضت وہ تو نکل گئے۔"

گیارہ بجے رات کو تیسرے درجہ کے مسافر خانہ میں سوٹ کیسوں پر بستر رکھے دونوں اپنے اپنے اڈّوں پر چڑھے ہوئے صبح کے اِنتظار میں بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں نے مَسعُود سے کہا "یار اب تو صبح اِسی طرح کرنی ہے۔ پھر سوچ کِس بات کا ہے۔" مَسعُود پہلے تو خاموش رہے پھر میری طرف غور سے دیکھ کر بولے۔

"کیوں جی اُستاد فدّن صاحب اب بھی چلے جا رہے ہوں گے۔ نہ معلُوم کہاں تک چلے گئے ہوں گے۔ نہ معلُوم کب تک چلے جائیں گے۔"

سعادت حسن منٹو

...... میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ میری پیدائش تھی۔ میں پنجاب کے ایک غیر معروف گاؤں "سمرالہ" میں پیدا ہوا۔ اگر کسی شخص کو میری تاریخ پیدائش سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تو وہ میری ماں تھی۔ جو اب زندہ نہیں ——— دوسرا حادثہ مجھے سن اکتیس میں پیش آیا۔ جب میں نے پنجاب یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان تین سال متواتر فیل ہونے کے بعد پاس کیا۔ تیسرا حادثہ وہ تھا۔ جب میں نے سن انتالیس میں شادی کی۔ مگر یہ حادثہ خوشگوار تھا اور اب تک ہے اور بہت سے حادثے ہیں۔ مگر وہ میری طرف سے دوسروں کو پیش آتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میرا قلم اٹھانا ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ جو چند برس پیچھے ہندوستان کے رجعت پسند ادیبوں کو پہنچا۔

نیا قانون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیّت صِفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا مُنہ بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دُنیا بھر کی چیزوں کا عِلم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی۔ کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی۔ تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر بڑے مدبرانہ انداز میں پیشگوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا چودھری تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

. . . . . اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا۔ کہ اسپین کہاں واقع ہے۔ تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے یہ جواب دیا تھا۔ "ولایت میں اور کہاں!" اسپین میں جنگ چھڑی، اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا۔ تو اسٹیشن کے اڈّے

میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا۔ تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی۔ تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو۔ چھریاں چلتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا۔ اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی' جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہوتے رہیں گے"۔ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں' اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں۔ تو کچھ نہ ہو سکے گا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا' اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے۔ کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا۔ کہ پیر نے یہ بددعا بھی دی تھی۔ کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی ہی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی۔ اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا۔ کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی۔ کسی گورے کے

سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا۔ تو اسے متلی سی آجاتی تھی۔ نہ معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا۔ کہ ان کے لال جھریاں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے۔ جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا۔ تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی تھی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتے یا حقے کا کش لگاتے ہوئے اس "گورے" کو جی بھر کر سنایا کرتا تھا۔

"......" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔ آگ۔ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان بندروں نے، یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں...."

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی...... جیسے کوڑھ ہو رہا ہو...... بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا، جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ اس کی کھوپری کے پرزے اڑا دوں، لیکن اس خیال سے ٹل گیا۔ کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

"قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے میں تنگ آگیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں۔ رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون والون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں۔ اور ان کی گفتگو سے پتا چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اس

کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سِلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سُنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا — کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی مِل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دِل میں ناقابل بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا رہتا تھا، اور اسے چابک سے بہت پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مُڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا۔ "چل بیٹا۔ چل بیٹا۔ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر۔ یہ بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو مُنہ میں دبا کر ان کو چُوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مِل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینہ میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بہت بڑی خبر اپنے دوستوں کو سُنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو

اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹہ تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دُنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پیش ہو گا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی...... غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل —— نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہو گا۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا۔ کہ گوروں —— سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں، نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گے۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے۔ اڈے میں داخل ہوا۔ تو اُستاد منگو بڑھ کر اس سے ملا۔ اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر...... ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے —— تیری اس گنجی کھوپری پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کی بابت اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر اپنا

ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے۔ یہ رُوس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سُن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لیئے اس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" جدید آئین کے ساتھ ملا دیا، اور پہلی اپریل کو پُرانے نظام میں جو تبدیلیاں ہونے والی تھیں، وہ انہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصہ سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخپوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اِس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے۔ تو وہ ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دِل ہی دِل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بہت زور سے تنقید کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"جدید آئین کا دوسرا حصّہ فیڈریشن ہے۔ جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا فیڈریشن دُنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنا نہ دیکھا گیا ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہی نہیں۔"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی۔ چونکہ ان میں بیشتر لفظ انگریزی کے تھے۔

اس لئے استاد منگو صرف اُوپر کے جُملے ہی کو کسی قدر سمجھا، اور اس نے خیال کیا۔ کہ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو ــــ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نظر سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے"۔

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں ٹوڈی بچہ کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا۔ کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعہ کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگہ میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا۔ کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا۔

"نئے آئین نے میری اُمیدیں بڑھا دی ہیں۔ اگر ــــ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے۔ تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی، شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی وقعت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی چیز سمجھنے لگا، جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون ۔ ۔ ۔ ۔!" وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ یعنی کوئی نئی چیز! اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا، جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں۔ اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے "نئے قانون"

کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا۔ بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا۔ کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی۔ ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخرکار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے۔ اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا۔ اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا۔ اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا۔ مگر اسے ہر چیز پُرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پُرانی، اس کی نگاہیں آج خاص طور پر ہر چیز میں نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں، مگر اسے سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پُرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ـــــ کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگرو کی جھنجھناہٹ بازار میں چلتے پھرتے آدمی ...... ان میں کون چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

ابھی بہت سویرا ہے، دکانیں تو سب کی بند ہیں - اس خیال سے اسے تسکین تھی، اِس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔

"ہائی کورٹ میں ۹ بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے، اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے - جو طلبا کالج کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے لباس مَیلے مَیلے سے کیوں نظر آئے، شاید اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں -

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھُل چکی تھیں - اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی - حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی اور منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے - استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ——— وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا - ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا - تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے - اس کو یقین تھا - کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہو گا - مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے - اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے - چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اُوپر کان

رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا، مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس پڑا تھا۔

"تو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر۔ تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا، کیا تو سمجھتی ہے۔ کہ اسی طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند تھا۔ بلکہ متجسّس بھی۔ اس کی بیوی گنگاوتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر کہا کرتی تھی۔ "ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بیقرار نہیں تھا۔ جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا پھندا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا، اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں یا ہو جائیں، تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کی اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے

اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا، اور دِل میں یہ خیال کیا۔

چلو یہ بھی اچھا ہُوا —— شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزل مقصود پر اُتار دیا، اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو اُنگلیوں میں دبا کر سُلگایا۔ اور اگلی نشست سے اُٹھ کر پچھلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعہ یا آنے والی بات پر غور کرنا ہوتا تھا۔ تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سُست تھی۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ اور اس قابل غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ کہ اسے یوں معلوم ہُوا، گویا کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر اسے سڑک کے اس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا، جو اسے ہاتھ سے بُلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی اور جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے، پہلے تو اس کے جی میں آئی۔ کہ اس کی طرف کوئی توجہ نہ دے، اور اس

کو چھوڑ کر چلا جائے۔ مگر بعد میں اس کو یہ خیال آیا۔" ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔" کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چو دآنہ خرچ کر دیئے ہیں، وہ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں —— چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگے کو موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا، اور آنکھ جھپکنے کی دیر تھی، وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا، گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھینچ گیا تھا۔ اور اس ہی گال کے اس طرف جو مدہم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا، اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب گورے نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگرٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں، اور ایسا معلوم ہوا۔ کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے، اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ

حصّے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگرٹ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا "جانا مانگٹا ہے یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ لفظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگ گئے۔

"وہی ہے" اس نے یہ لفظ اپنے منہ کے اندر دُہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سُننا پڑی تھیں، استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا۔ بلکہ اس کے پُرزے اُڑا دئیے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا۔ کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں پر گرا کرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگٹا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں اس کے چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا "ہیرا منڈی"!

کرایہ پانچ روپے ہو گا۔ استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلّایا "پانچ روپے —— کیا تم —— ؟"

"ہاں ہاں پانچ روپے"۔ یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ کیوں، جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظرانداز کر چکا تھا، وہ خیال کر رہا تھا۔ "اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔" اور اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا۔ اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسا کمان میں سے تیر کی طرح اوپر کو اٹھا۔ اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا۔ اور نیچے اتر کر دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا۔ کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی باہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا۔ اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جا رہا تھا۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ——— پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ——— اب ہمارا راج ہے بچہ۔"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی مار سے بچایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

وہ دِن گذر گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں، نیا قانون، اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی طرح کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون" "نیا قانون" چلّاتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون۔ نیا قانون کیا بک رہے ہو۔ قانون وہی پُرانا ہے۔"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

h h

Not good book = book

شبیر محمد اختر

عمر ۴۴ سال۔ وطن گجرات (پنجاب) ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہُوا۔ میٹرک کے امتحان کے چوتھے روز قتل کے مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا۔ زندگی کا یہ تجربہ تھا۔ جو پندرہ برس کی عمر میں ہُوا۔ اس کے بعد قدُرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ گزر اوقات کے لئے پولیس کا محکمہ ملا۔ ساڑھے تین سال صدر دفتر پولیس پشاور کے شعبۂ جرائم میں کام کرتا رہا۔ اس کے بعد بعض حالات کے ماتحت اس ملازمت کو ترک کر کے مجھے لاہور آ کر ایک دینی ادارے سے وابستہ ہونا پڑا جہاں اب تک ہوں۔ مذہب سے جذباتی طور پر عقیدت اور چیز ہے۔ لیکن مذہب کو بطور پیشہ اختیار کرنا اور شے۔

جرائم کی تاریخ کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ مَیں نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہے۔ جیل کی چالیس دن کی زندگی۔ شعبہ جرائم کا ساڑھے تین سالہ تجربہ اور اب مذہب کے نام پر Exploitation یہ ہَیں میرے افسانوں کے پس منظر *

احساس

سکینہ اُستانی سارے مدرسے میں حقارت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا سادہ لباس سنجیدہ چہرہ جھکی جھکی آنکھیں، اس کے ساتھ والی استانیوں کو نہ بھاتی تھیں۔ اسکول میں لباس کی نمائش ہوتی تھی۔ مگر اس کا لباس معمولی دیسی کپڑے کا تھا۔ ہنستی کودتی لڑکیاں جب اپنی اس نئی استانی کو دیکھتیں تو ناک بھوں چڑھا کر گزر جاتیں۔

"ذرا لباس دیکھو" ایک کہتی "مائی چیڑاسن ایسا بھی نہیں۔"

"استانی ہے یا کڑوی دوا۔ جب دیکھو منہ بسورے نظر آتی ہے۔"

سکینہ بہت کوشش کرتی مگر اس کا چہرہ کبھی نہ کھلتا۔ وہ لباس پہننا چاہتی مگر اس کا دل نہ مانتا۔ ریشمین لباس اسے کانٹے بن کر چبھتا۔ اس کے خیال ہی سے وہ کانپ اُٹھتی۔ لیکن اسکول کا ماحول اور تھا۔ نئی پود تہذیب کے دوراہے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ سماجی بندشیں ڈھیلی ہوگئیں تھیں۔ مدتوں کے قیدی آزاد ہوا میں اڑنے کے نشے میں سرشار اپنے آپ کو بھول چکے تھے۔ عورت آزاد ہو کر مرد کے شانہ بشانہ کھڑی

ہونے کے جوش میں آگے بڑھ رہی تھی۔ بوڑھی مائیں خود اپنی بیٹیوں کو بندھنوں سے آزاد کرنے میں ممدہ ہو رہی تھیں۔ باقی کمی کو پورا کرنے کے لئے اسکول کی چار دیواری ساری آزادیوں کو اپنے اندر چھپائے کھڑی تھی۔

ہیڈ مسٹرس کے نزدیک تعلیم کا آدرش یہی تھا۔ کہ اس کے اسکول کی اُستانیاں لباس میں ایک نمونہ ہوں۔ تہذیب کا مجسمہ، وہ لڑکیوں کے لئے ایسی فضا پیدا کرنا چاہتی تھی۔ جس میں پنپ کر وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکیں۔

ہنستی ہوئی جوانی اور مسکراتا ہوا لڑکپن بھلا کب برداشت کر سکتا تھا کہ ان میں کوئی مُنہ بسورتا ہوا داخل ہو سکے۔

سکینہ کو عارضی طور پر اس اسکول میں جگہ مل گئی۔ اس کے پاس ڈگری تھی۔ وہ اپنی ڈگری کے بل بوتے پر یہاں لے لی گئی۔ ہیڈ مسٹرس کو کیا معلوم کہ اس ڈگری کی مالکہ سوز کی ایک تصویر ہوگی۔

اسٹاف روم میں بیٹھ کر جب دوسری استانیاں ہنسی مذاق میں مشغول ہوتیں۔ تو سکینہ بے چاری خاموش ان کا مُنہ تکا کرتی۔ وہ چاہتی کہ وہ بھی ان میں شامل ہو کر محفل کی رونق کو بڑھائے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکتی۔ قہقہہ اس کے حلق تک آتا مگر پھر — نہ جانے کیوں سکینہ کے لبوں سے ہلکی سی آہ نکل جاتی۔ ساری محفل پر ایک پژمردگی چھا جاتی۔ وہ شرمندہ ہو کر وہاں سے کھسکنے لگتی۔ وہ مجبور تھی۔ ..... دنیا والے ہنسنے کو چاہتے ہیں۔ جب کوئی رونے لگے تو وہ بھاگ جاتے ہیں۔

کلاس روم میں شوخ لڑکیاں اپنی اس نئی اُستانی سے بے تکلف ہونا چاہتی تھیں مگر انہیں مایوسی ہوتی۔ وہ ہمیشہ کھوئی کھوئی سی رہتی۔ نگاہیں جھکی جھکی سی۔ اس کے سامنے کتاب ہوتی۔ وہ مشین کی طرح کام کرتی۔ سوالوں کا جواب دیتی۔ لیکن دوسری استانیوں کی طرح اس نے کبھی کلاس کو ہنسایا نہیں۔ لڑکیاں بھلا کب تک برداشت کر سکتی

تھیں کہ کلاس روم ماتم کدہ بنا رہے۔ اس کے پیریڈ ساری جماعتوں کے لئے دن کا بدترین حصے تھے۔

سوز و ساز مل کر نغمہ پیدا کرتے ہیں۔ صرف سوز ـــــ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ اسٹاف روم۔ جماعتیں جہاں وہ داخل ہوتی اسے ان کمروں کے ذرّے ذرّے میں نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس کی رفتار، کار آنکھوں کے اشاروں ہی اشاروں میں اس کی ہنسی اُڑاتیں۔ اس پر چوٹیں ہوتیں۔ یہ باتیں ہوا میں پھیل گئیں۔ بات کی لاکھوں زبانیں ہوتی ہیں۔ سارا اسکول اس سے نفرت کرنے لگا۔

یہ ساری نفرت محض اس لئے تھی کہ وہ ناخوش کیوں رہتی ہے۔

اس کے لب مسکراہٹ سے کیوں بے بہرہ ہیں۔ وہ کیوں اپنے آپ میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ سماج کی بندشوں کو توڑنے کی درسگاہ میں ایک معلمہ یوں قید ہو۔ وہ جسے اپنی طالبات کو آزادی کے ڈگر پر چلانا تھا ـــــ صدیوں کی غلامی کی زنجیروں کو کمزور کرنا تھا۔ اسے ایسی حالت میں کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

یہ سب کچھ صحیح مگر سکینہ مجبور تھی۔ وہ اپنے ماحول سے متاثر نہ ہو سکی۔ اس کے ذہن کے بوجھ کا پہاڑ اتنا بوجھل تھا کہ اسے اسکول کی ہنستی ہوئی فضا اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکی۔ وہ ڈگری جس کی بنا پر اسے ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے سکینہ نے اپنا شباب ہنسی مسکراہٹ بہت کچھ دے دیا۔ اس کا خیال خام نکلا۔ یہی ڈگری اس کے لئے نئی مصیبتوں کا ایک باب ثابت ہوئی۔

سکینہ کی آزمائشی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نفرت کا بے پناہ طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لڑکیاں چاہتی تھیں کہ وہ سکینہ کو "استانی آپا" کہیں۔ کوئی سوال پوچھیں پھر وہ جواب دے مسکرائے اور کسی لڑکی کی تعریف کر دے کسی کے لباس کو سراہے۔ پھر ان میں سے کوئی اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے۔

لیکن سب آرزوئیں دل ہی دل میں رہتیں۔
اسکول ہو یا باہر کی ملاقاتیں، ہر جگہ اسکول کی استانیاں اور طالبات سکینہ کے قصّے لے بیٹھتیں۔ اب یہ قصّہ اسکول کی چار دیواری سے نکل کر گھروں میں جا پہنچا۔
"توج! وہ نصیبوں پیٹی" بوڑھیاں زندہ دل بن کر کہنے لگیں۔" استانی ہے یا کوئی رانڈ جس نے ہنسنے کی قسم کھائی ہے۔"
" ایسی استانیاں نفسیاتی طور پر بچیوں کو پریشان رکھتی ہیں" نوجوان بھابیوں کی رائے تھی۔ کیونکہ ان میں سے کسی نے آج تک سکینہ کو نہیں دیکھا تھا۔
ہیڈ مسٹرس سے جب بھی کبھی کوئی ماں ملنے گئی تو اس نے سکینہ کا قصّہ ضرور جا چھیڑا۔
" ذکیہ کہتی تھی" بات سے بات چل نکلتی۔" نئی استانی کچھ سٹریل سی ہے۔"
"ہاں سنتی ہوں۔" ہیڈ مسٹرس چشمہ درست کرتے ہوئے کہتی۔" میں نے ترس کھا کر اس کی مدد کرنا چاہی۔ مگر ـــــ"
" وہ رانڈ ہے؟" بیٹیوں کو سہاگن دیکھنے والی مائیں پوچھ لیتیں۔
" میں اس کے حالات نہیں جانتی ـــــ عجیب مصیبت ہے۔"
" بڑی آپا" ہیڈ مسٹرس سب سے بڑی آپا تھی۔" اسے نکال کیوں نہیں دیتیں۔"
" سوچ ۔ رہی ہوں۔"
" بڑی آپا! آپ نے کسی کا ٹھیکہ تھوڑا لے رکھا ہے۔"
جس اسکول کا یہ حال ہو۔ وہاں سکینہ کیسے خوش ہو سکتی تھی؟ بیچاری کے لئے اپنے حال میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ بلیک بورڈ پر اس کی عجیب و غریب تصویریں تیار کی جاتیں۔ کارٹون بنا کر مذاق اڑایا جاتا۔ وہ سب کچھ دیکھتی مگر اُف نہ کر سکتی۔ ایک بار

اس نے ہیڈ مسٹرس سے شکایت کی مگر الٹا اسے ڈانٹ دیا گیا۔

اسٹاف روم میں اس نے ذکر کیا۔ لیکن ہمدردی کرنے کے بجائے اس کی ہنسی اُڑائی گئی۔ سارا اسٹاف خوش تھا۔ کہ اسے یوں تنگ کیا جا رہا ہے۔ اس کے دل میں زخم تھے۔ ناسور تھے۔ وہ اس لئے نہ ہنستی کہ شاید زخم زیادہ کھل جائیں۔ اس کے دل میں درد ہوتا۔ وہ اسے دبائے رکھتی۔ لیکن اس کی خاموشی کو تکبر پر محمول کیا گیا۔ کلیجے میں ٹیس اُٹھتی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو جاتا۔ یہ تغیر استانیوں کے نزدیک نخوت تھا۔

ان میں سے بعض کو اس سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ مگر یہ ہمدردی بالآخر نفرت سے بدل گئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ سکینہ نے کیوں انہیں اعتماد میں نہ لیا۔ مگر وہ ڈرتی تھی۔ کسی سے دل کا حال نہ کہہ سکتی۔ وہ کہنا چاہتی مگر زبان رُک جاتی۔ دل کا بوجھ اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔

وہ درد کا مداوا لینے کے لئے مدرسہ میں آئی۔ اس کو یقین تھا۔ کہ وہ اپنی زندگی، اپنی قوم کی بچیوں کے لئے وقف کر دے گی۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہوگا۔ جو دکھ اس نے سماج کے ہاتھوں اٹھائے تھے۔ وہ ان بچیوں کو ان دُکھوں سے بچانے کی کوشش کرے گی۔ لیکن ہوا کیا وہ جن کے لئے اس نے زندگی وقف کرنی چاہی تھی۔ اس کے درپے آزار ہو گئیں۔ وہ ان میں درد کا علاج ڈھونڈھنے آئی تھی، ان بچیوں نے مریض کو ایک تماشا جانا۔ وہ ہنسنا چاہتی تھی۔ لیکن تماشا المیہ منظر بن گیا۔ سکینہ کا یہ انجام، اس کی اپنی مصیبتوں میں اضافہ کر رہا تھا۔ ماضی سے زیادہ مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔

اس کی بے چارگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی ملازمت کے دن ختم ہو رہے تھے۔ ہولناک مستقبل قریب آ رہا تھا۔ لڑکیوں کی شرارتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ سکینہ کی زبان

بالکل بند ہوگئی۔ وہ کلاس روم میں یوں داخل ہوتی جیسے کوئی مجرم ایسی جیوری کے سامنے پیش ہو رہا ہو۔ جن میں سے ہر ایک اشارے کر کے کہے "یہ ہے مجرم"۔ لڑکیاں اس کی نقلیں اُتارتیں، مُنہ بناتیں۔ مگر وہ کُرسی پر بیٹھی برابر ان کو سبق پڑھائے جاتی۔ شور کا یہ عالم ہوتا کہ کئی بار ہیڈ مسٹرس کو خود آکر چُپ کرانا پڑا۔ لڑکیوں کو کبھی کچھ نہ کہا تھا۔ بلکہ اُلٹی سکینہ پر ڈانٹ پڑ جاتی۔

اسکول میں اس کا آخری دن تھا۔ وہ اکیلی اپنے کمرے میں بیٹھی باہر میدان میں لڑکیوں کو کھیلتے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ایک غریب لڑکی کو دوسری لڑکیاں تنگ کر رہی ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر بے کل ہوگئی۔ اس نے چاہا کہ وہ بھاگتی ہوئی جائے اور سب لڑکیوں کے بال نوچ لے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکی۔ لڑکیوں نے اس لڑکی کو اتنا تنگ کیا۔ کہ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ اس کا رونا دوسری طالبات کے لئے اور زیادہ دلچسپی کا موجب بنا۔ وہ جتنی زیادہ روتی وہ اتنا زیادہ تنگ کرتیں۔ قہقہے لگاتیں۔

یکایک اس لڑکی کی نگاہ سکینہ استانی پر پڑی۔ وہ وہیں سے چلّائی۔

"آپا! آپا!!"

یہ پکار لڑکیوں کو اور چمکا گئی۔ وہ سکینہ کی نقلیں اُتارنے لگیں۔ غریب لڑکی ہرنی کی طرح بل کھاتی دوڑتی ہوئی کمرے کے اندر آگئی۔ اس کے پیچھے لڑکیاں بھاگ رہی تھیں جونہی وہ اندر داخل ہوئی سکینہ نے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

باہر لڑکیاں رُک گئیں۔ وہ شیشوں میں سے دونوں کو اندر بند دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ ان کے نزدیک دو چڑیاں پنجرے میں پھنس گئی تھیں۔ وہ ان کو پھڑپھڑاتا دیکھنا چاہتی تھیں۔ مگر ہوا کیا۔ سکینہ نے بڑھ کر ڈسک سے بید نکالا اور غریب لڑکی کو مارنا شروع کر دیا۔

لڑکی سراسیمہ ہو گئی۔ وہ داد کے لئے آئی تھی وہ مظلوم تھی۔ غریب سکینہ کی امان میں آئی تھی۔ لیکن استانی آپا نے اسے ہی مارنا شروع کر دیا۔ وہ حیران تھی۔ باہر کی لڑکیاں بھی خاموش ہو گئیں انہیں بھی غریب لڑکی سے ہمدردی ہونے لگی۔ اس کو الٹی سزا دی جا رہی تھی۔

سکینہ استانی سے انہیں نفرت تو تھی ہی۔ اس سے اور زیادہ ہو گئی۔ وہ اب سکینہ کے خلاف آوازے کسنے لگیں۔

غریب لڑکی مار کھائے جا رہی تھی۔ کچھ تو حیرانی اور کچھ ہمدردی کی جگہ سزا کی مصیبت نے اسے گھبرا دیا۔ وہ مجسمہ استعجاب بنی مار کھاتی رہی۔ سکینہ تھی کہ سزا دیے گئی۔ لڑکی درد سے بے حال لیکن استانی کا ہاتھ رکتا ہی نہ تھا۔ باہر لڑکیاں شور مچا رہی تھیں۔

عجب سماں تھا۔ ایک دو استانیاں بھی آگئیں۔ یہ تماشا بڑا ہی عجیب تھا۔ یکایک لڑکی نے سکینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کاٹ کھایا۔ یہ ایک فوری جذبہ تھا۔ اس کے بعد لڑکی ڈر کر بھاگی۔ سکینہ نے بید پھینک دیا اور دوڑ کر لڑکی کو پکڑ کر گلے سے لگا لیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ دیوانہ وار۔

سارا مجمع ساکن۔

ڈرامے میں ایک suspense پیدا ہو گیا۔ نقطۂ عروج پر پہنچ کر پلاٹ بالکل بدل گیا۔

سکینہ نے دروازہ کھول دیا۔ لڑکی اس کے پہلو میں تھی۔ وہ ایک یونانی مجسمہ کی طرح کھڑی تھی۔ لڑکیوں نے خود بخود راستہ چھوڑ دیا۔ وہ جا رہی تھی۔ اپنی سلطنت کو چھوڑ کر۔ جب وہ استانیوں کے پاس پہنچی وہ رکی۔

"بہن ——" اس نے ایک کو مخاطب کیا۔ "میں کامیاب ہو کر جا رہی ہوں ——

میں اس غریب بچی کی طرح مار کھا کر چپ رہتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آج بھی میں زندگی میں ناکام ہوں ـــــ تم مجھے حقارت سے دیکھتی ہو۔ یہ میری چھوٹی بہنیں ـــــ میری بچیاں ـــــ میری امیدوں اور تمناؤں کے مرکز ـــــ مجھے حقیر سمجھتی ہیں ـــــ بڑی آپا مجھے لڑکیوں کے لئے مضر خیال کرتی ہیں۔ کیوں ـــــ کیوں؟ صرف اس لئے کہ میں نے زندگی بھر دکھ سہا۔ منہ سے اُف نہ کی۔ یہ میری عادت بن گئی ہے۔

آج میں نے ایک اور لڑکی کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ـــــ وہی راستہ، وہی ہلاکت کا راستہ ـــــ موت کا راستہ۔ حقارت کا راستہ ـــــ میں کانپ گئی ـــــ ایک زندگی ـــــ ایک اور زندگی ـــــ تباہ و برباد ہونے والی تھی ـــــ

وہ میری طرف آئی، مجھ سے مدد مانگنے۔ میں اس کی مدد کر سکتی تھی؟ یہ میری بچیاں مجھے تنگ کرنے سے باز آئیں ـــــ میں اس کی امداد نہ کر سکی ـــــ علاج کر دیا ـــــ میں نے اس کے جسم کو سزا دی ـــــ جسم کو ایذا پہنچائی ـــــ وہ سہتی رہتی ـــــ آخر آخر میں کامیاب ہو گئی ـــــ جسم کی تکلیف سے روح بیدار ہوئی ـــــ روح کا جوہر غیرت ہے۔ ردّ عمل ہوا ـــــ اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ میں خوش تھی۔ اس نے میرے ہاتھ میں کاٹ کھایا ـــــ میں خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ میری بہن موت کے منہ سے بچ گئی ـــــ اسے زندہ رہنا تھا ـــــ غیرت زندگی ہے اور ـــــ

آج وہ پہلی بار دل کا زخم دکھانے پر مجبور ہو گئی تھی ـــــ آنکھوں نے غمازی کی ـــــ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ✧

شیلا سمیر

مجھے اپنے سوانح حیات لکھنے کا شوق نہیں ہے۔ آخر ایک ہندوستانی عورت کی زندگی میں ہوتا ہی کیا ہے۔ کہ اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ بہرحال آپ۔ کے ارشاد پر چند سطریں لکھ دیتی ہوں۔

اکیس ستمبر ۱۹۱۶ء میں میں نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ ابتدائی تعلیم جموں اور کشمیر میں ہوئی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ شروع شروع میں چند نظمیں ہندی اور انگریزی میں کہی تھیں۔ افسانے بہت کم لکھے ہیں۔ لیکن یہ چند بھی مجھے خاص پسند نہیں۔ حیرت ہے لوگوں نے انہیں پسند کیا۔

میری زندگی کا سب سے زیادہ دردناک حادثہ میرے بچے کی موت ہے۔ ساڑھے چار سال ہی کی عمر میں اس بچے نے حیرت انگیز حد تک شخصیت پیدا کر لی تھی۔ اس کی ذہانت پر مجھے صحیح معنوں میں ناز تھا۔ اس صدمے نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ مجھے ایکٹ کے کھیل لکھنے کا خاص شوق ہے۔

برکت

اس نے پلو سے منہ لپیٹ لیا جیسے اپنی لمبی سانس کو اُوپر اٹھنے سے روک رہی ہے۔ اور اُبلتے ہوئے آنسو روک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

لیٹے لیٹے میں نے اپنے جھکے ہوئے پاؤں سمیٹ لئے اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے گھٹنے پر تھا۔ جیسے دبانا وہ بھول گئی تھی۔ ایک منٹ کے بعد زور سے سانس چھوڑ کر اس نے کہنا شروع کیا۔ وہ کبھی کسی کو بھولا نہیں۔ اُسے سب کا خیال ہے۔

میں نے ایک گناہ گار کی طرح نظر نیچی کر لی، اور کہا "تو اب تمہارا ارادہ کیا ہے"؟

اس نے پیر پکڑ کر دبانا شروع کیا اور بولی "آپ نہ رکھ سکے گی تو اور نوکری ڈھونڈھنے کی کوشش کروں گی۔ آپ کے پاس دس دن ہی رہی کچھ کرایہ بنا لیا ہے۔ نہ ہوا تو دس پانچ دن ادھر ٹھہر کر گھر چلی جاؤں گی۔ بچے اُداس ہو رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ رہنے کا شوق تھا لیکن اب یہ بھی نہ ہو سکے گا۔

"لیکن میرا انتظار تو ٹوٹ گیا۔ اب میں تمہیں اپنے پاس رکھ کر کیا کروں" میں نے بناوٹی مسکراہٹ لاکر کہا۔ تمہارے اتنے بچے ہیں۔ وُہ کام نہیں کرتے کیا؟ تمہارا خاوند بھی تو کچھ چھوڑ گیا ہوگا۔

میرے بچے اس نے رُک کر کہا "میرے آٹھ بچے ہیں۔ پانچ میرے اور تین میری سوت کے لیکن وہ سب الٰھڑ ہیں۔ تین لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ پر اتنے غریب گھروں میں کہ کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔ پانچ لڑکے ہیں۔ سب سے بڑا دوکان کرتا ہے پان سگرٹ کی۔ باقی چار چھوٹے ابھی کوئی کام نہیں کرتے" "اور تمہاری سوت بھی ہے" میں نے پوچھا جی نہیں وہ تو دو سال پہلے مر گئی تھی۔ اس کے بچے بھی میرے پاس ہیں۔ میری شادی دس بارہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی۔ خاوند مرشد اور خدا کا کلام پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی لوگ کھانا کپڑا روپے سب دے جاتے۔ گھر میں گائے بھینس موجود تھی۔ جب کبھی وہ دورے سے لوٹتا میرے لئے زیور اور کئی کئی جوڑے کپڑوں کے لاتا۔ بچوں کے لئے ٹوپیاں، لکھنوی جوتوں کے جوڑے اور مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے بھر بھر کر لاتا۔ کیا کہوں۔ جب آتا گاؤں بھر کے لوگ اسے دیکھنے آتے۔ ایک تو وہ خوب صورت تھا۔ گٹھا ہوا بدن۔ منہ پر صحت اور جوانی کا رنگ لمبا۔ اونچا۔ دیکھنے میں انگریز سا لگتا تھا۔ ہفتہ بھر تو ہمارے گھر میں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا تھا میں بھی خوشی میں ڈوبی کرنوں کی طرح کبھی یہاں کبھی وہاں پھرتی رہتی تھی۔ کسی بات کا ڈر نہ تھا۔ نہ کوئی چاہ رہ گئی تھی۔ گہنوں سے لدی رہتی تھی۔ اب میری طرف دیکھ کر یہ کون مان سکتا ہے؟ اس نے اپنی ننگی باہوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہاری سوت کب آئی" میں نے لاپروائی سے پوچھا۔

تو سب سنوگی۔ اس نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ گویا کسی نے اس کی چہرہ زلیخا کی موہنی میں سیاہی کے کئی دھبے چھینک دئے ہوں۔ پر اس کا اعتقاد اٹل تھا۔ پھڑکتے ہوئے ہونٹ کو دانت سے دباتے ہوئے اس نے کہا "یہ بات تب کی ہے۔ جب لال دین میرا بڑا لڑکا دس برس کا تھا۔ میں کس طرح بچوں کی طرف دیکھ کر برہ کے کٹھور دن گزار رہی تھی۔ پر میں سچ سچ کہتی ہوں۔ میرے دل میں ایک عجیب جذبہ تھا۔

میں رات کو کام ختم کر کے چارپائی پر لیٹ جاتی۔ اور سوچتی، امنگیں میرے دل میں اُٹھ

اٹھ آتیں اور مجھے بیہوش کر دیتیں۔ اسی دھارے میں بہتی ہوئی میں سپنے دیکھتی۔ سورج چڑھتا تو
اٹھتی۔ نئے ارمانوں کے ابال کی طرح گائے دوہتی تو گانے گاتی۔ اور ہمیشہ ایسا محسوس کرتی
گویا ان کی مضبوط باہیں مجھے اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اداسی کیسی؟ اور کیا رونا؟ جب
چھ مہینے ہو گئے تو انہوں نے بنوں سے ہرکارہ بھیجا۔ بڑے لڑکے کو بھیج دو۔ دل اداس ہو رہا
ہے۔ میں تین مہینے کے بعد آؤں گا۔ ساتھ ہی میرے لئے ناک کا ہیرا اور کانوں کے پھول بھیجے
لڑکے کا بستر وستر باندھ کر تیار کر دیا گیا۔ بار بار اس کا منہ چومتی اور گلے سے لگاتی۔ ایسا
معلوم ہوتا گویا میں بھی ان سے ملنے جا رہی ہوں۔ پھر کچھ رک کر کہنے لگی "آپ شاید نہ مانیں۔
لیکن انہیں ان دنوں مجھ سے محبت تھی۔ کئی بار مجھے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر کہتا تھا "برکت
تمہیں خدا نے روپ تو نہیں دیا۔ پر میرے دل میں تو تم سما گئی ہو۔ لیکن اگر میں کبھی جوانی میں
اندھا ہو کر کسی خوبصورت سی ایک اور عورت کو گھر لے آؤں تو تمہیں کیا لگے؟" یہ سن کر
میرے دل میں کسک سی اٹھتی اور میں، روٹھ جاتی۔ پر جب یہ ہنس کر مجھے پکڑ لیتے اور لٹو
کی طرح گھمانے لگتے۔ تو میں سوچتی مجھے یونہی بنا رہے تھے۔ دیکھنے میں تو میں معمولی تھی۔ اس
شرم کے مارے میں ان کے ساتھ کبھی باہر نہ جاتی سوچتی کوئی کچھ نہ کہہ دے۔ اور اگر
کوئی کبھی ہم دونوں کی طرف حیرانی سے دیکھ لیتا۔ تو میں زمین میں گڑ جاتی۔ پھر مجھے احساس
ہوتا۔ انہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں بہت خوش قسمت ہوں۔ یہ بھی جانتی تھی۔ کہ محبت ہونے
پر بھی انہیں میری شکل پر غرور نہ تھا۔ میرے ساتھ ہونے پر یہ کسی سے بات کرتے کرتے
رک جاتے۔ انہیں یہ ڈر ہوتا کہ میں کہیں کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھوں جس سے انہیں
شرمندہ ہونا پڑے۔

بڑے لڑکے کے گھر سے نکلتے ہی انگن سونا ہو گیا۔ وہ تین مہینے گن گن کر کس طرح گزرے
پھر ایک دن چٹھی آئی۔ "ہم دونوں کل پہنچ جائیں گے۔" نو دس مہینے کے بعد اس دن میں نے گھر
باہر سب دھویا۔ صفائی کی۔ ان کے لئے نیا بستر لگایا۔ پھول لگائے۔ زیور اور کپڑے پہنے

وہ آتے۔ پہلے ہی کی طرح۔ میں ان کے بکس کھولتی اور جھومتی تھی۔ وہ میرے پاس کھڑے مسکراتے تھے۔ اسی طرح دو ہفتے گزر گئے۔ ایک رات وہ اچانک سنجیدہ ہو کر بولے "برکت میں ایک عورت بیاہ لایا ہوں۔"

میں نے سوچا ہنس رہے ہیں پر مجھے ان کی دل لگی اچھی نہ لگی۔ سوچا ان کی کیسی عادت ہے۔ خوشی کے وقت بُری بُری باتیں کہہ کر میرا دل ہلا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی لرزتی ہوئی شکایت آمیز نگاہیں ان کی طرف ڈالیں۔ ان کا منہ اترا ہوا تھا۔ میرا کلیجہ تھم گیا پھر بھی یقین نہیں آیا۔ میں اٹھ کر ان سے علیحدہ ہو بیٹھی اور کہا۔ "یہ میں نہیں مان سکتی کبھی نہیں۔" انہوں نے اداسی سے کہا "برکت میں گناہگار ہوں۔ مجھ سے جیسا چاہے سلوک کرو تمہیں اختیار ہے۔" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بیٹھی تھی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اندھیرا کالا اور بھیانک۔ میں چیخ اٹھی "تم جھوٹے ہو۔ مجھے پریشان کرنے سے تمہیں خوشی کیوں ہوتی ہے تم جھوٹے ہو......"

انہوں نے اٹھ کر میرا ہاتھ نہیں پکڑا۔ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ میں نے ان کی آنکھوں کی طرف تڑپ کر دیکھا۔ میرے دل میں وسوسہ بڑھنے لگا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ زمین کے نیچے سے ایک بادل کا ٹکڑا اٹھ کر میری طرف ہاتھ پھیلا رہا ہو۔ میں نے ان سے لپٹنے کی کوشش کی۔ اور دھم سے گر کر بیہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا۔ تو رات کے بارہ بج چکے ہوں گے میں چارپائی پر پڑی تھی۔ اچانک کسی نے میرے کانوں کے پاس آ کر دھیرے سے کہا۔ "بھیجی وہ آ گئی" میں اُٹھ بیٹھی۔ سہم کر پوچھا۔ کون آ گئی اس نے لرزتی ہوئی اور بھیانک آواز میں دہرایا۔ "بھیجی بھیجی وہ آ گئی ہے۔ اُٹھو"

میں چونک کر اٹھی اور اس کا کندھا پکڑ کر بے تاب طور سے بولی۔ کہاں اس نے انگلی سے دالان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دوپٹہ سنبھالا۔ اور دھیرے دھیرے اس کی طرف چلی۔ پر میرے پاؤں بھاری ہونے پر بھی اپنے آپ اُٹھ رہے تھے۔ معلوم

ہوتا تھا۔ کہ میرے گالوں پر سیاہی چھاگئی ہوگی۔ اور ہونٹ تانبے کی طرح ٹھنڈے اور خشک ہوں گے۔ میرا چہرہ دوپٹہ کی دو تین تہ میں لپٹا تھا۔ اور نس نس دکھ رہی تھی۔ والدن میں پہنچی تو دیکھا ایک خوبصورت سی عورت ان کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھی تھی۔ اس کا دوپٹہ لال رنگ کا تھا جس پر سفید گوٹا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر رنگ اور آنکھوں میں کاجل تھا۔ میرے وہاں پہنچنے پر انہوں نے مجھ سے کہا "برکت تھوڑا سا گرم پانی کر دو" میں جاکر برسوں کے مریضوں کی طرح چولہے کے پاس جا بیٹھی اور گرم پانی کی ہانڈی چڑھا دی۔ میرا دم نکل رہا تھا۔ سر اپنے آپ دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اور بیہوشی کی حالت میں آنکھیں بند کر کے جانے کتنی دیر وہیں پڑی رہی۔

منہ ہاتھ دھو کر اور ناشتہ کر کے وہ ان کے پلنگ پر جا بیٹھی۔ اور میں چپکے سے اپنی چارپائی پر۔ گاؤں میں تم جانتی ہو کمرے ومرے تو کچھ نہیں ہوتے۔ وہیں ایک کونے میں میری چارپائی تھی۔ میں چاہتی تو یہ تھی۔ کہ میں زمین میں دھنس جاؤں کہیں دونوں کو میری ہستی کی بو بھی نہ آئے۔ سکڑ کر بستر میں جا پڑی۔ ان کی کھلی ہوئی باتوں کی آواز رہ رہ کر میرے کانوں میں گھس آتی۔ اور میں اپنی قبر میں اپنے کو دفنا کر ایک طرح سے لاپروا ہو کر اپنے اوپر چلنے والوں کے سلوک کا اندازہ لگا رہی تھی۔ جو آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ دماغ کے پار نہ جا سکتی تھی۔ میرے دماغ پر بیہوشی کی گہری نیند چھا رہی تھی۔ رات کے دو بجے ہوں گے۔ آہستہ سے یہ آکر میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ اور دھیرے سے پکارا "برکت" میں نے چہرہ پر سے لحاف ہٹا لیا اور بولی "جی" "برکت" انہوں نے اور پاس آکر کہا۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے ہی میری قسمت تمہارے ہاتھ ہے۔ تم ہی اس کا فیصلہ کرو گی بولو کل گاؤں والوں سے کیا کہو گی"

میرا گلا بھر آیا۔ یہ آدمی جو میرے جی جان کا مالک تھا۔ آج مجھ سے کیا مانگ رہا ہے۔ کیا میں اسے نا امید کر سکوں گی۔ میں نے بغیر سوچے کہا۔ آپ فکر مت کریں۔ میں سب کچھ دیکھ لوں گی دبے منہ سے کچھ لفظ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ان کی دنیا میں اس وقت میری بیچارگی پر دھیان کرنے

کا وقت نہ تھا۔ یہ سب میں سمجھتی تھی۔

صبح اُٹھ کر میں نے جلدی جلدی چائے چڑھائی اور برتن لگائے۔ ان کے اٹھنے تک سب کچھ تیار تھا۔ عائشہ اٹھی اور آئینے سے میری کنگھی اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیرنے لگی۔ وہیں شیشہ بھی پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر اس میں اپنا عکس برپا کر دیا۔ میں مٹ چکی تھی۔ اس شیشے میں سے اب مجھے وہی بڑی بڑی آنکھیں نظر آئیں گی۔ ہمیشہ "

اس نے نگاہ اُوپر اُٹھائی اور روک لی۔ میرے ہونٹ کھلے اور پھر بند ہو گئے "ہمدردی" نہیں میں نہ کہوں گی۔ اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ چائے پی کر عائشہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی "بجو مجھے ایک جوڑا کپڑے نکال دو۔ یہ کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔"

مَیں نے صندوق کھولا۔ اور بوسکی کا سوٹ اور ململ کا پیلا دوپٹہ نکال کر اسے پہنایا اور ہونٹوں پر اپنے ہاتھ سے سُرخی لگائی۔ اس نے اپنے انگارے کی طرح جلتے ہوئے چہرے کو شیشے میں سے دیکھا اور مسکرائی۔ پھر اپنی گداز اور نرم باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور خوبصورتی اور محبّت سے کھلی ہوئی بہار کی نشیلی آواز میں کہا "تم میری بہن ہو"

مَیں بھول گئی سب کچھ، سوائے اس کے آخری لفظوں کے۔ میرے دل میں اس وقت سوائے خوشی کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ میری بہن بنے گی۔ جبکہ میں سب کچھ کھو بیٹھی ہوں شائد اس کے دل میں درد اور محبّت کا جذبہ ہے۔ مَیں کتنی بدقسمت ہوں۔ جو کہ اپنے درد میں اس کی تکلیف کا اندازہ لگانا بھول گئی۔ اسے ان سے محبت ہے۔ جن پر میرے ارادے اور ارمان ختم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی عورت ہے میری طرح۔

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا یہ اور عائشہ دو معصوم بچّوں کی طرح ہیں۔ جن کی دیکھ بھال کرنا میرے لئے لازمی ہے۔ میں اپنے درد کو دل میں چھپا کر ان کی غلامی کرنے پر تیار ہو گئی۔

اسی طرح دو مہینے گزرے۔ اس کے بعد میرا بھتیجا ایک دن بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

پولیس پولیس "میرا دم سا نکل گیا۔ بھاگ کر پوچھا" کیا کہہ رہے ہو۔ پولیس یہاں کیوں آئے گی ہم نے کیا گناہ کیا ہے" اتنے میں یہ اندر سے لپک کر آئے اور لڑکے سے جھپٹ کر پوچھا۔ "کہاں ہے پولیس"

لڑکے نے اِدھر اُدھر گھبرا کر دیکھا اس کی سانس پھول رہی تھی۔ بڑی مشکل سے بولا "میں آ رہا تھا تو راستے میں دو پولیس کے آدمی مجھ سے کسی کے ساتھ آتے ہوئے پوچھنے لگے۔ تمہارے گاؤں میں کوئی عورت اپنے خاوند کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ نکل کر آئی ہے؟"

تو تم نے کیا کہا" ان کا چہرہ اُتر گیا تھا "میں نے کچھ نہیں کہا۔ لپکا چلا آ رہا ہوں"

"لیکن یہاں بھاگ کر تو کوئی عورت نہیں آئی" میں نے تڑپ کر عائشہ کی طرف دیکھا جو کھڑکی میں کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔

میرے بھتیجے نے چپ چاپ اپنی انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا" اتنے میں انہوں نے عائشہ کو اندر لے جا کر اپنے کپڑے پہنائے۔ سر پر پگڑی اور لٹھے کا پاجامہ ایک ہاتھ میں کچھ کپڑے لئے اور چلنے لگے۔ جانے سے پہلے انہوں نے آکر میرے کندھے پر ایک ہاتھ رکھ کر کہا "میں اسے وزیر آباد اسٹیشن سے گاڑی پر چڑھانے جا رہا ہوں"

اس کی آواز لرز رہی تھی۔ لیکن نگاہ قائم تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ان کو زور سے پکڑ لیا "تم نہیں جا سکتے۔ وہ تمہیں قید کر لیں گے۔ سمجھ رہے ہو" میں جلدی جلدی بولنے لگی "یہاں سے دس کوس پرے میری بہن کے داماد کا گھر ہے۔ تم عائشہ کو لے کر وہاں چلے جاؤ۔ وہ پولیس میں افسر ہے تمہیں بچا لے گا۔"

پتہ نہیں کس طاقت نے میرے منہ سے یہ سب کچھ نکلوایا۔ آج جبکہ وہ عائشہ کو رخصت کرنے جا رہے ہیں۔ میں اسے رکھنے کی صلاح دے رہی تھی۔ ان کے منہ پر رونق آگئی پر اب اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ بولے تم رپورٹ نہ کرو گی۔ "رپورٹ" میں نے دردناک لہجہ میں کہا۔ تمہارے برخلاف میں رپورٹ کر سکتی ہوں۔ جاؤ میں تمہیں ضرورت کی سب

چیزیں بھیج دوں گی۔

یہ چلے گئے اور عائشہ کو وہاں چھوڑ آئے۔ تین سال نہ انہوں نے میری پروا کی نہ بچوں کی۔ گھر میں چار بچے کھیلتے تھے اور پانچواں میری گود میں تھا۔ گھر میں میرے پاس جو پونجی تھی۔ زیور اور کپڑے تھے۔ انہوں نے دھیرے دھیرے سب عائشہ کے پاس پہنچا دئے۔ دن دیکھتے نہ رات گھوڑے کی لگامیں کستے اور عائشہ کے پاس جا پہنچتے۔ تین سال گذر گئے تو اسے واپس گھر لے آئے۔ میں چپ تھی۔ ادھر انہوں نے میری قدر کرنی شروع کر دی تھی اور میں انہی کے بھروسے سے سانس لے رہی تھی۔

جب عائشہ گھر آئی۔ تو کچھ دن ٹھیک رہی۔ پھر اس کے تیور بدلنے لگے۔ میری گود میں چھ مہینے کا بچہ تھا۔ وہ اسے دیکھ نہ سکتی۔ دھیرے دھیرے اس نے ان کے کان بھرنے شروع کئے۔ میرے بھتیجے نے مجھے بتایا۔ کہ وہ ان سے مجھے گھر سے نکالنے کو کہہ رہی تھی۔ یہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ان بچوں کی ماں تھی۔ مجھے گھر سے یونہی کیوں نکال دیں گے۔ میں سمجھ نہ سکی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا۔ رات کے دس بجے تھے۔ میں آنگن میں بچوں کو کھانا کھلا کر برتن اکٹھے کر رہی تھی۔ عائشہ پاس ہی بیٹھی اپنے بالوں میں پھول ٹانک رہی تھی۔ یہ سیدھے آنگن میں آئے۔ اور میرے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں ایک کاغذ تھا۔ لمبا سا جس پر ٹکٹ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے یہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ یہ ہمارے طلاق کا خط ہے۔ اب تم میری بیاہتا نہیں رہی۔ کہیں اور جاؤ۔ اب میں عائشہ سے شادی کروں گا۔

میرے ہوش اُڑ گئے۔ گویا بھنور میں غوطے آ رہے ہوں۔ میں کہاں جا سکوں گی۔ بیاہتا نہیں رہی۔ کیسے نہیں رہی۔ سولہ سال سے تو بیاہتا تھی اور اب یہ مجھے چلے جانے کو کہتے ہیں۔

کہاں چلے جانے کو؟ میرے بچے میں میں کانپ اٹھی جسم لرز رہا تھا۔ ماتھے میں درد ابھر آیا تھا۔ ملتجی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ کر بولی "میں تمہاری غلام بن کر یہیں رہوں گی۔ مجھے کہیں مت بھیجو۔ میں نے تمہارے ساتھ نکاح پڑھا تھا۔ آج تمہاری ماں زندہ ہوتی۔ تو مجھے باندھ کر رکھ لیتی۔ خدا کے لئے مجھے اپنے قدموں ہی میں مرنے دو۔

میں لپٹ کر ان کے قدموں کو اپنے ہاتھوں سے باندھ لیا۔ انہوں نے بے رحمی سے پاؤں کو جھٹک کر کہا "ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر تم سامان لے کر چلی جانا سمجھیں؟ میں باہر جا رہا ہوں۔ واپس آنے تک تمہارے لئے یہاں ٹھہرنا ممکن نہ ہوگا۔

میں نے منتیں کیں، عائشہ کے پاؤں پکڑے لیکن وہ چپ چاپ بت بنی بیٹھی رہی، بولی ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ میں کیا کروں۔ تم سے جو بن پڑے کر لو"

میں نے گڑگڑانا شروع کیا۔ اپنے بال اکھاڑ ڈالے سر کئی بار دیوار سے پٹکا میں کہیں نہیں جاؤنگی۔ نہیں جاؤنگی۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، چھاتی پر لگاتار ہاتھ مارنے لگی جب سنبھلی تو دیکھا میں اکیلی زمین پر پڑی ہوں۔ آنکھوں کے آنسو سوکھ چکے تھے۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا ہاتھ خون میں بھر گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ اندر بچے سو رہے تھے، اٹھی اور دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی آواز نہیں۔ عائشہ اور ان کا کوئی پتہ نہیں تھا سچ مچ میں ان کی بیاہتا نہ تھی۔ وہ تو عائشہ تھی۔ جو ان کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ میں تو خزاں کا ایک سوکھا ہوا پتا تھی جو کہ برفیلی ہواؤں کی سردی سے کٹ کر گر پڑا تھا میں جاڑے کی شدت میں ڈھل کر ختم ہو جاؤنگی بہار میں میرا کیا کام۔

ایک دوپٹے میں دو کپڑے جو کہ غلیظ ہو چکے تھے۔ باندھ کر رات کے وقت میں گھر سے نکل پڑی۔ چھوٹا لڑکا گود میں اٹھائے تین کوس پر ایک سہیلی کے گھر ٹھہر گئی۔ دو دن وہاں ٹھہری تھی۔ کہ گاؤں کے زمیندار نے میرا پیچھا کیا "تم میرے ساتھ نکاح پڑھوا لو۔ تمہیں کیا غرض ہے کہ تم یوں پڑی رہو

تیسری رات میں نے سہیلی سے کہا "میرے بڑے لڑکے کو کسی طرح یہاں بلوا دو۔ میں اکیلی ہوں، اور جہاں جاؤں گی گاؤں کے شہدے میرے پیچھے ہو لیں گے۔ اس کے آ جانے سے مجھے اطمینان ہو جائے گا۔

اس نے رات کے دو بجے اپنے خاوند کو بھیج کر میرے بڑے لڑکے کو بلوا لیا وہ اپنا بستر اٹھا لایا تھا۔ رات کی تاریکی میں بھی اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں میرے دل کو روشنی دے رہی تھیں۔ میں اسے راستے ہی میں ملی۔ بنا کچھ کہے اس کو چھاتی سے چمٹا لیا۔ اور پھر آنسو بکھیرتے ہوئے دبے گلے سے کہا۔ "چلو"

یوں تو میں بڑی ڈرپوک واقع ہوئی ہوں۔ پر غم میں اپنے لئے ڈر کا وقت کہاں تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر کے بعد کچی پکی زمین پر پیر رکھتے ہوئے چلے گئے۔ اور صبح ہونے تک جموں ریاست میں پہنچ گئے۔ وہاں ایک رشتہ دار کے گھر ایک ہفتہ بھر رہے اتنے میں مجھے پتا لگا کہ گاؤں والوں نے مل کر ان کے گھر میں ڈاکہ ڈالا۔ اور سب کچھ اٹھا لے گئے۔ اب وہ اور عائشہ غریب تھے۔ اس میں شک نہیں کہ گاؤں والے میرے ہی ڈر کے مارے انہیں تنگ کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ لیکن میں یہ کیونکر کہہ سکتی تھی۔ جھٹ گاؤں پہنچی۔ صرف ان سے یہ کہنے کے لئے کہ میں تمہارے دکھ میں دکھی ہوں۔ مجھے یہاں سے نہ بھیجو۔ مگر ان دونوں نے طعنے دئے۔ کہا اب یہاں ہمیں تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھنے آ گئی۔ مجھے لوٹنا پڑا۔

اس کے بعد ہم دونوں سرگودھا پہنچے، وہاں میرا لڑکا پندرہ روپے پر اور میں بارہ روپے پر فیکٹری میں نوکر ہو گئی۔ دو تین مہینے وہاں رہے۔ اس عرصے میں میرا دماغ پھر گیا۔ گھنٹوں قبرستان میں جا کر پڑی رہتی۔ کبھی قبر کھود کر چھوٹے لڑکے کو اس میں ڈال دیتی اور آپ چھاتی پیٹنے لگی۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس لڑکے سے مجھے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ یہ بیمار ہوتا۔ تو میں علاج نہ کرتی۔ کہتی نگوڑا مر جائے۔ تو میں آزاد

ہو جاؤں۔ دن رات جب نماز پڑھتی یہی دُعا مانگتی۔ کہ یا اللہ یہ بوجھ مجھ سے چھین لے
اسے اپنے پاس بلا لے۔ اور اب یہ موا اتنا پیارا لگتا ہے۔" وہ اپنے بیٹے کی طرف
دیکھ کر ہنس پڑی۔

ادھر میرے نکلتے ہی گھر میں اناج تک نہ رہا۔ میں نے سُنا۔ گاؤں والے ان سے
بگڑ گئے تھے۔ کوئی انہیں کام پر نہ لگاتا تھا۔ ان کی بہن نے پہلے تو ان کو خوب بھلی
بُری سنائی۔ پھر بچّوں کے کھانے کو کچھ روپے ادھار دے دیئے۔

چند سال بیت گئے۔ ایک دن ان کی چٹھی ملی۔ ہم دونوں پر مقدمہ ہو گیا ہے۔ ان
عائشہ ڈیرہ اسمٰعیل خان چلی گئی ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ گھر اکیلا ہے اور بچیاں
بھوکی ہیں۔ تم سے ہو سکے۔ تو ان کی مدد کرو۔"

میں نے سب کچھ سنبھالا اور گھر پہنچی، گاؤں والے بڑے بوڑھے سب سے ملی اور
روئی۔ گھر اُجڑ گیا تھا۔ لڑکیوں کی آنکھوں میں پھوڑے پڑ گئے تھے۔ جوان تو ہو گئیں
تھیں۔ پر مُنہ کملائے ہوئے۔ سچ جاننا انہیں پہچان نہ سکتی تھی۔ چھوٹی لڑکی نے مجھے
بتایا" ہیں رات دن سڑکوں پر بیٹھی روتی تھی۔ تم کہاں چلی گئی تھی۔

کچھ دن بعد مجھے خبر ملی۔ عائشہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں ہیں میرے ایک پھوپھی کے
لڑکے کے گھر ٹھہری تھی۔ وہ بیمار تھی۔ اور میرا یہ بھائی ان کا حکیم۔ اس نے دوائی میں اسے
کچھ دے دیا اور عائشہ کا دل پھٹ گیا۔ بھائی نے مجھے چٹھی بھیجی۔ مقدمہ خارج ہو گیا۔
اب ان کی چٹھی آئی" عائشہ تین بچے چھوڑ گئی ہے۔ ہو سکے تو انہیں گاؤں میں
اپنے پاس بلا لو۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ تم کہو گی تو گھر آ جاؤں گا نہیں تو میں کہیں پڑا
رہوں گا۔

میں نے خط لکھوایا۔ اور بچے منگوا لئے۔ یہ بھی تو اس کے ہی بچے تھے۔ ایک کے
ہی خون کے ٹکڑے پر ان کے اس اصرار کو کہ مجھے گھر آنے دو میں نہ مان سکی۔ انہوں نے

کہا۔"میں بچوں کو دیکھنے کے لئے دو دن کے لئے آؤں گا۔"

وہ آئے پر میں ان کے پاس کھڑی نہ ہوتی تھی۔ انہوں نے بہتری التجا کی کہ برکت تم میرے بچے کی ماں ہو۔ مجھے ایک بار پھر موقع دو۔ کہ میں اپنے گناہ کا بار ہلکا کر سکوں۔ پر میں نہ پگھلی۔ میں نے کہا۔" وہ وقت کچھ اور تھا۔ اب میں وہ نہیں رہی" اسی سمے انہیں بخار ہو آیا۔ چھوٹی لڑکی نے مجھے آکر بتایا۔ کہ چچا بخار میں پڑے ہیں۔" تو کھانا دے آؤ۔" پر اس دن انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔ نہ کمرے سے باہر ہی نکلے۔ میں بھی حال پوچھنے تک نہ گئی۔ آخر تیسرے دن بڑے لڑکے نے آکر کہا۔" چچا بستر باندھ کر جانے کو تیار ہیں۔ پر جسم بخار سے جل رہا ہے۔" میں نے کہا۔ ان کا جو جی چاہے کریں۔ میں کیوں من چھوٹا کروں۔ پر میرا دل دھڑک اٹھا۔ ان کا کون خیال کرے گا۔ اب تو عائشہ بھی نہیں رہی۔ اور پھر کہاں جائیں گے۔ انہیں کچھ ہو جائے تو۔ منہ پر دکھائی لا کر انگن میں دُور کھڑے ہو کر میں نے کہا۔" بخار اُتر جائے پھر چلے جانا۔"

انہوں نے اپنی بڑی بڑی لال آنکھیں جو پتھر کے کوئلے کی طرح روشن تھیں اٹھا کر کہا "کون کہہ سکتا ہے۔ پھر اُٹھ سکوں گا یا نہیں۔ تم سے کافی خدمت کروا چکا۔ اب اجازت دو۔"

ان کے جانے کے کچھ دن بعد بڑے لڑکے نے ایک دن کہا۔" اماں آج حلوا چڑھا دو۔ بہت جی چاہتا ہے۔" میں نے دیگچہ بھر کر حلوا چڑھایا۔ ابھی حلوا چولھے پر ہی تھا۔ کہ چھوٹا لڑکا ہنستا ہنستا آیا۔ اور چمچے سے اسے نکال کر کھانے لگا۔ میں نے ڈپٹا" پک تو جانے دو۔ ابھی سے بکرے کی طرح منہ مارنے لگے۔"

اس نے کہا۔ لاؤ کسی کا مرثیہ تو پڑھ دوں" میں نے کہا۔ اگر پڑھنا ہے۔ تو اپنے باپ کا پڑھو اور کسی کا کیوں پڑھو گے" یہ الفاظ میرے منہ پر تو آ گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ میرا جسم لرزنے لگا۔ وہ بیماری کی حالت میں گھر سے گئے تھے۔ کون جانے میں ایسے بُرے لفظ کیوں بک گئی۔

پل بھر بھی نہ گزرا ہو گا۔ کہ گاؤں کے بچے دوڑتے ہوئے آئے۔" ڈاک والا۔ ڈاک والا۔"

گاؤں میں ڈاک والے کا آنا ایک عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ میں سمٹ کر پلو پنجا کر کے دیوار سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ خط لال دین کے نام تھا۔ میرے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ لال دین نے چیخ ماری "چاچا جی" میں نے دوڑ کر اسے سنبھالا اور پوچھا۔ کیا ہوا۔ اس نے خط دے کر کہا "یہ پڑھ لو۔ کل شام کو وہ فوت ہو گئے" گھر میں کہرام مچ گیا۔ اس کے بعد میں بیمار پڑ گئی۔ دو ہفتے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ کہ اب یہ شائد بچ جائے۔ میرا جیٹھ کا جی توڑ کر میری خدمت کرتا رہا۔ اور اس خدمت کے صلے میں تین مہینے کے بعد اچھی ہوئی پر اٹھتے ہی مجھے پتہ لگا۔ کہ ہمارے مکان کی قرقی ہونے کو تیار ہے۔ انہوں نے لوگوں سے قرضہ لے کر ہضم کر لیا تھا۔ اور روپیہ واپس نہ دے سکے تھے۔ قرضخواہوں نے رپورٹ کر دی۔ گاؤں والوں نے کہہ سن کر کسی طرح مہلت لے دی۔ اب چھ مہینے کے اندر مجھے پچاس روپے چکانا ہوگا۔ نہیں تو گھر بار سب بک جائے گا۔

اس نے ایک لمبی سانس لی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نرمی اور ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ میں اسے سمجھ نہ سکی۔ وہ کہتی گئی۔ کل رات کو میں نے انہیں سپنے میں دیکھا۔ میں روتی ہوئی ان سے جا لپٹی۔ اور کہا مجھے کیوں پھنسا گئے ہو میں تو مر بھی نہیں سکتی۔ انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ تم میرا کام سنبھالنے ہی کے لئے زندہ ہو۔ مجھے دھوکہ نہ دینا۔

میں نے کہا۔ تم تو آسانی سے نکل گئے۔ میں اب کس کا دروازہ دیکھوں۔ انہوں نے کہا۔ میرے کام کا بیڑا تم نے اٹھا لیا۔ تم میری عورت ہو۔ یہ کبھی نہ بھولنا میں نے کہا۔ تم تو مجھے طلاق دے گئے تھے۔

انہوں نے اس کا جواب بھی دیا۔ تم میری بیاہتا ہو۔ اور میرے بچوں کی رکھوالی۔ کچھ عرصے کے بعد میں تم سے ملوں گا۔ اور پھر ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔ اس لئے آج میرے جی میں امنگ سی اٹھ رہی ہے ملن کی امنگ" میں نے اس سے پوچھا "تمہیں اپنے خاوند سے

محبت تھی - اور اب بھی ہے"۔ "کیوں نہیں وہ جھنجھلا اُٹھی ! "میرے بالوں کی طرف دیکھو اور میری پژمردہ آنکھوں کی طرف - اب میری محبّت کرنے کی عمر بیت گیا !" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی، "تمہاری آنکھوں میں محبّت کے شرارے ہیں - اور تمہارے منہ پر ایک نئی دلہن کی سی اُمنگ - اس نے اپنا منہ شرم سے چھپا لیا اور آہستہ سے بولی "یہ اس لئے کہ ہمارا سنجوگ اتنی دیر کے بعد پھر ہوا ہے - میں سنجوگ کی خوشی کو تقریباً بھول ہی گئی تھی -

میرے کلیجہ میں ایک ٹیس سی اُٹھی اور اچانک نا امیدی کے غبار نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا - اس نے حیران ہو کر میرے پنجرٹے ہوئے منہ کی طرف دیکھا اسے میرے دل کی حالت کا شائد اب اندازہ ہؤا - دھیرے دھیرے اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا - اور میں تکیہ میں منہ چھپائے اپنے آنسوؤں میں تیرتے ہوئے سپنوں کو دیکھنے لگی -

قیسی رامپوری

نام حامد الدین خلیل الزمان - والد بزرگوار کا اسم مبارک محمد زمان خان تھا۔ سلسلۂ نسب چونتیس پشت میں حضرت قیس جن کا اسلامی نام عبد الرشید تھا جا کر ملتا ہے۔ ان بزرگ کا مزار کابل میں ہے پردادا صاحب کابل سے نوشہرہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں سے رامپور میں منتقل ہو گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ لیکن والد صاحب جوانی کے عالم میں وہاں سے چلے گئے اور ریاست کوٹہ میں آکر پولیس کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ تمام آباد اجداد کی عمر فوجی ملازمت میں بسر ہوئی مگر نانا صاحب تجارت پیشہ تھے اور غدر کے بعد کے متمول ترین تاجروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے جامع کمالات انسان تھے۔ عربی و فارسی کے دریا، حافظ قرآن، شب زندہ دار، اعلیٰ درجے کے انجینئر، حاذق طبیب، موسیقی کے ماہر اور جانوروں کو تربیت دینے میں ان کو خاص ملکہ تھا۔ چھ فٹ سے اونچا قد، کسرتی جسم بینائی کا یہ عالم تھا کہ ستر سال کی عمر میں بغیر عینک کے ابتدائی چاندنی راتوں میں باریک خط پڑھ لیا کرتے تھے۔ ایسے ہی دانت مضبوط تھے۔ بڑے نفیس

خطاط بھی تھے۔ میر پنجہ کش کے شاگردوں میں سے تھے افسوس طاعون کے
زمانے میں دوسروں کا علاج کرتے کرتے خود بھی اس کا لقمہ بن گئے۔

میری پیدائش ۲۰ جون ۱۹۰۵ء کی ہے۔ فارسی و اُردو نانا صاحب
ہی سے پڑھی اور پندرہ پارہ تک انہی سے قرآن حفظ کیا لیکن بعد کو طبیعت
اُچاٹ ہو گئی اور اس نعمت سے محروم رہ گیا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد طبیعت کا رجحان ملازمت کی جانب
مطلق نہ تھا۔ اُسی زمانے میں ماموں صاحب لاولد مر گئے۔ وُہ بھی تجارت
کرتے تھے اور نانا مرحوم کی تمام دولت کو ختم کر کے صرف ایک دکان پر
قناعت کئے بیٹھے تھے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا تمام نقد
سرمایہ اور دکان وغیرہ میرے قبضہ میں آگئی۔ میری فطرت اور صلاحیتوں کو
سوائے والد صاحب کے کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔
کہ کشمکش حیات میں میری صحیح جگہ کیا ہے۔ اپنے تخیّلات میں گم، خاموش
اور ناکارہ سا انسان تھا۔ بہرنوع بیس ہزار کی مالیّت میرے قبضے میں تھی
اور قبلہ والد کی نیم رضامندی کے بعد میں نے تجارت کے سلسلے کو آگے
دھکا دینا چاہا۔ مگر ڈھائی سال کے اندر اندر نہ صرف دکان ہی ختم کر دی
بلکہ تمام سرمایہ بھی لٹا دیا۔

یہ تباہی عیّاشی یا بے اعتدالی کا نتیجہ نہ تھی۔ اِن دونوں نعمتوں سے
میں شروع ہی سے محروم ہوں۔ جس کا ذکر اپنے کیریکٹر کے ساتھ کروں گا۔ اس
بربادی کی تنہا باعث بے پرواہی تھی۔ میری دکان بیشتر رفاہِ عام کی سوسائٹی
یا خوش وقتی کا ایک کلب بنی ہوئی تھی۔ جتنا مال بکتا نہ تھا اس سے زیادہ
مفت تقسیم ہو جاتا تھا۔ مگر وہ تھا اس قدر زیادہ کہ مجھے اس کو اس طرح ختم

کرنے میں ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ لگ گیا۔ آخری جھٹکا یہ تھا کہ ایک
دن دکان بند کرنے کے بعد تمام چابیوں کا گچھا قفل ہی کے اندر لگا چھوڑ
گیا جس کا ہوش بارہ گھنٹہ تک نہ آیا۔ صبح اس کو بڑے قفل میں لٹکا
دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ یہ یہاں کیسے آ گیا۔ اب بھی دل میں کوئی خطرہ
نہ آیا۔ اطمینان سے قفل کھولا تو عجیب تماشا نظر آیا۔ تمام چیزیں تتر بتر
(اوّل تو چیزیں ہی کیا رہ گئی تھیں) پڑی ہوئی تھیں اور تجوری (جس
کے اندر سات ہزار کے نوٹ، کچھ سونے کی انگوٹھیاں اور نا نا مرحوم
کے زمانے کے چند قیمتی پتھر پڑے ہوئے تھے) بالکل صاف تھی۔
نقصان برداشت کرنے میں مجھے قدرت نے بڑا سنگ دل بنایا
ہے۔ صدمہ کا ایک سسکتا ہوا سا حملہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد کسی قدر
بد مزہ سی راحت محسوس ہونے لگتی ہے۔ غرض ہماری تجارت ختم ہوئی
اس کے بعد سال بھر تک بیکار بیٹھے رہے۔ اس وقت میری عمر ستر
سال کی ہوگی۔ ریفارم اور اصلاح کے خیالات شروع ہی سے طبیعت میں
تھے۔ چنانچہ بہت سی انجمنیں بنائیں۔ کسی کے سیکرٹری رہے کسی کے
صدر۔ مگر گوٹہ کی سرزمین ایسی سنگلاخ ہے کہ وہاں ہماری مساعی کچھ بروئے
کار نہ آئیں۔ آخر مزید خدمات کے لئے بلا معاوضہ انجمن حمایت الاسلام
دہلی میں (اس کا دفتر محلہ بلیماراں میں تھا) آ گیا اور وہاں آ کر کام کرنے لگا۔
یہ شدھی کا زمانہ تھا۔ نواح دہلی میں مجھے جاٹوں کے ایک گاؤں
میں روانہ کیا گیا۔ میرے ساتھ ایک والنٹیر بھی تھا۔ گاؤں میں پہنچتے ہی ہماری
معمولی سی مرمت ہوئی اور ہم پٹ پٹا کر بھوکے پیاسے گاؤں کے باہر
ایک کھیت میں آ پڑے۔

رات ہو چکی تھی۔ کھلا ہوا آسمان۔ ہوا کے تند جھونکے، کانٹے اور کھیت کے موٹے موٹے ڈھیلے ہماری تواضع کر رہے تھے۔ اور ہم مزے سے اُن پر دراز تھے۔ یہاں تک کہ ہم کو نیند آگئی۔ یہ شب میری زندگی کی مبارک ترین شب تھی۔ اس رات کو مجھے رسولِ خدا (صلعم) کی زیارت کا عالم رویا میں شرف حاصل ہوا تھا۔

دلّی سے میں سیدھا اجمیر چلا آیا۔ یہ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے۔ یہاں آکر میں نے ایک یتیم خانہ کی سفارت (بلا معاوضہ) اپنے ذمّہ لے لی اور اس کے لئے کئی شہروں میں جاکر چندہ کی معقول رقم جمع کی۔ مگر یتیم خانے کے مہتمم صاحب رقم کے باب میں مجھے دیانتدار نظر نہیں آئے۔ اس لئے اس خدمت سے بھی مجھے سبکدوش ہونا پڑا۔

بستر باندھ کر میں یتیم خانے کے پھاٹک پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جاؤں کہ اتفاق سے ادھر سے رامپور کے ایک صاحب نکلے۔ جن کو میں نہیں جانتا تھا۔ مگر وہ خدا جانے کس طرح مجھے جانتے تھے۔ وہ مجھے ایک قومی ادارہ کے دفتر میں لے گئے۔ جہاں آفس سپرنٹنڈنٹ کی جگہ خالی تھی۔ چنانچہ میں پینتیس روپے ماہوار پر وہاں چپک گیا اس طرح میرے قدم اجمیر میں جم گئے۔

اس کے بعد میں کوشش کر کے ریلوے آڈٹ میں آگیا۔ جہاں اب تک پھنسا ہوا ہوں۔ فکر کفاف سے آزاد ہو کر میں نے ادیب فاضل کا امتحان دیا۔ اس کے بعد منشی فاضل کا اور آخر میں انٹر کا۔ یہ ہے میری آج تک کی سوانح جس کی دھجیوں میں بہت سے آلام بھی لپٹے ہوئے ہیں اور مسرتیں بھی۔

میں بچپن ہی سے اپنی علیحدہ دنیا رکھتا تھا۔ سونی سونی سی اور تنگ و تاریک سی۔ مگر میں اس میں ہمیشہ مگن رہا۔ اوّل تو والدین کی تادیب و شدید نگرانی ہی دوسرے بچوں میں کھیلنے کا موقع کم دیتی تھی۔ اگر کبھی اور لڑکوں میں کھیلنے نکل جاتا تو وہ سب بہت جلد مجھ سے بیزار ہو جاتے تھے۔ خدا جانے میں ان سے کیا چاہتا تھا۔ اور اپنے کو کیا بنا کر ان کے ساتھ پیش آتا تھا۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ میں بد دماغ، مغرور اور لڑاکا نہ تھا۔ کیونکہ والدِ مرحوم کو ان چیزوں سے سخت چڑ تھی۔ میری تربیت میں شروع سے اس شفیق و مبارک بزرگ کا ہاتھ رہا ہے۔ جو ذرا سی لغزش پر سیدھا کر دیا کرتا تھا۔ ابا کے ہاتھوں میرا اجیال ہے۔ میں بمشکل ایک یا دو بار پٹا ہوں گا۔ مگر ان کے رُعب کا یہ عالم تھا کہ جوان ہو کر بھی میری ہمّت ان سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی نہیں ہوتی تھی۔ طبیعت شروع ہی سے بیحد (SUSCEPTIBLE) قبولیت مآب ہے لیکن توہم سے دور۔ چار پانچ سال کی عمر ہو گی میں کانٹے، سانپ اور بچھو وغیرہ کے وجود پر غور کرتا تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ سب اس لئے پیدا ہوئے ہیں۔ کہ میں آزادی سے باغوں اور کھیتوں کا چکر نہ لگا سکوں۔ معمولی سے معمولی واقعہ جو میری آنکھوں کے سامنے سے گزرتا تھا۔ مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔

گیارہ سال کی جب عمر ہو گئی تو میں مردم بیزار بن گیا ہمیشہ تنہائی میں پڑا ہوا اپنے خیالات کا لُطف لیتا تھا۔ ہمارے تھانے میں بہت فراخ باغیچہ لگا ہوا تھا۔ صبح آٹھ بجے سے جو ناشتہ کر کے

وہاں ایک آرام کرسی پر دراز ہوتا تو رات کے گیارہ گیارہ اور بارہ بارہ بجے تک بے حس وحرکت، ساکت وصامت پڑا ہوا خدا جانے کہاں گم رہتا۔ نہ جانے کیا سوچتا رہتا۔ والدہ حیران تھیں۔ عزیز واقارب پریشان تھے۔ مگر میں اپنے حال میں خوش تھا۔ ابا بسلسلۂ مہمات کے دورے پر رہا کرتے تھے۔ جب سپاہیوں نے میرے اس جنوں کی رپورٹ ان سے کی۔ تو وہ بھی پریشان سے ہو گئے۔ مگر انہوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔

تین سال تک میرے اوپر یہ عالم طاری رہا۔ یا تو میں دیوانہ بن جانے والا تھا یا قدرت میرے تخیّل کی نشو ونما کر رہی تھی۔ اس دوران میں مجھے بیکار سے شعر موزوں کرنا آ گئے تھے اور نثر بھی لکھنے لگا تھا۔ چودہ سال کی عمر ہو چکی تھی۔ لکہ ہائے شباب زندگی کے مطلع پر آ کر چھانا شروع ہو گئے تھے۔ طبیعت نشاطِ گناہ کے لئے پھیلنا چاہتی تھی۔ مگر کچھ بزرگوں کا تصرف، کچھ والد کے پیر صاحب کی باطنی عنایات کچھ گھر کی تربیت اور سب سے زیادہ خوفِ خدا۔ اس نے کبھی شباب کی رنگینی محسوس نہیں کرنے دی دل حسین لڑکیوں کے تصوّر سے لذّت گیر ہونے سے کانپ اُٹھتا۔ میرے طفلانہ تقوے کا یہ عالم تھا کہ آنکھ کافرِ حُسن سے مجبور ہو کر اگر کسی حسین لڑکی کو ایک دفعہ دیکھ لیتی تو میں کفارہ کے طور پر ایک دن روزہ کرتا، دن بھر درود پڑھتا اور رات بھر استغفار۔ ایک ہی سال میں اس قدر تقشف پیدا ہو گیا کہ توشک اور پلنگ پر سونا ترک کر دیا۔ تکیہ سرہانے سے ہٹا دیا۔ ننگی زمین پر سوتا اور سر کے نیچے ایک بڑا سا پتھر رکھتا۔ مبالغہ نہ سمجھئے میرا تمام بیان حقیقت پر مبنی ہے۔

مَیں پندرہ سال کا ہو گیا۔ جیسے جیسے جوانی اُمنڈ اُمنڈ کر آتی گئی تقوی

جھنجھلاتا گیا۔ بڑی کشمکش کا زمانہ تھا خدا کی پناہ!

اسی زمانہ میں مینے ایک ناول لکھا تھا اور اب میری شاعری زیادہ بے تکی نہ رہی تھی۔ میری حقیر ادبی زندگی کی ابتداء شاعری سے ہوئی ہے اور میں اب تک نہ شاعر بن سکا ہوں نہ ادیب۔

جوانی کے پے در پے دباؤ سے اب تقویٰ لچک پڑا تھا۔ اسی زمانے میں میری ایک بزرگ خاتون نے آکر گھر میں ایک لڑکی کے حسن وجمال کی تعریف کرنی شروع کی۔ میں بھی اپنے گوشۂ تنہائی میں پڑا سُن رہا تھا۔ بس نادیدہ عاشق ہو گیا۔

مَیں نے اس لڑکی کو آج تک نہیں دیکھا ہے۔ مگر میری دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میرا تمام کا تمام تخیل، میرے جذبات کی قلعی میرے اندر حسِ افسانہ نگاری کی بیداری، میری شاعری سب کچھ اسی نادیدہ لڑکی کی رہین منت ہے۔ اگر میں اسے دیکھ لیتا یا وُہ مجھے مل جاتی تو شاید میں وہی اپنے سنگ زیر سر اور کھُردی زمین پر پڑے پڑے عمر گذار دیتا۔ اس لڑکی سے ملاقات حاصل کرنے کی حسرت و توقع میں میرا کیریکٹر بننے لگا۔ میرا زاویۂ نگاہ وسیع ہُوا، میرے اندر ایثار و قربانی کا مادہ پیدا ہونے لگا۔ حس کارکردگی و عزم نے میرے جسم میں کروٹ لی اور تعطّل و تخیّل کے سنگِ گراں سے میں نکل گیا۔

وُہ جہاں کہیں ہو، خدا اُسے خوش رکھے۔ وُہ مجھے انسان بنا گئی اور میرے تقوے میں بے نفسی و قربانی کا اضافہ کر گئی۔

دلوں کے معاملات مجھے بہت کم راس آئے ہیں۔ اور مَیں حتےالوسع ان سے بچتا رہا ہوں۔ مَیں کیا بچتا رہا ہوں۔ میرے کیریکٹر کی ابتدائی بنیاد مجھے

بچاتی رہی ہے۔ حسن کے بازار میں میں کوئی خرید و فروخت نہ کرسکا۔ صاف کیوں نہ کہوں جن انی گنی لڑکیوں کو مجھ سے یا مجھے ان سے محبّت ہوئی۔ میں نے ہمیشہ خُدا کو سامنے رکھ کر محبّت کی۔ ڈر ڈر کر اور خوف کھاتے کھاتے اس کو ختم کر دیا۔ یہ میری بے کیف (مگر میں اس بے کیفی کو پسند کرتا ہوں) جوانی کی ڈُھلی ہوئی داستان ہے۔ جس میں آئندہ اب کسی سطر کے اضافہ کی کوشش کہوں یا توقع؟ بہر نوع کچھ ہی سمجھئے۔ کچھ ہی کہئے۔ اب کچھ نہ ہوگا۔ اب کچھ نہ کروں گا یا کر سکوں گا۔

ابھی صرف کتابی لیاقت تھی، استنباط کا مادہ کم تھا۔ والد انتقال فرما چکے تھے، معیشت جم چکی تھی، بے فکری حاصل ہو چکی تھی۔ چنانچہ اپنے زعمِ فکر پردازی اور نبوتِ مفکری میں خدا و مذہب سے منحرف ہو گیا۔ وہ شخص منحرف ہو گیا۔ جس کی جسم ظاہر و باطن بچپن سے خدائی کرشمے اور بزرگوں کی کرامانیں دیکھتی آئی تھیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک یعنی تین سال تک میں ملحد رہا۔ لیکن الحاد بھی میرے طفلی کے تربیت یافتہ اخلاق کو بگاڑنے میں کامیاب نہ ہوا۔ آخر ایک شب کو میں نے ایسا عجیب و غریب اتنا طول و طویل، اس قدر مربوط اور اس درجہ زندہ و وزنی خواب دیکھا کہ میں اب بھی اس کے تصور سے کانپ اٹھتا ہوں صبح اُٹھتے ہی توبہ کی، تجدید ایمان کی اور جو شے مجھے کسی قیمت پر بھی راس نہ آسکتی تھی اس سے ہٹ کر پھر صحیح فضا میں آ گیا۔ میں خدا سے منحرف نہیں ہو سکتا، مجھے منحرف نہیں ہونے دیا جاتا ہے۔

۱۹۲۴ء ۱۹۲۵ء میں میں نے ایک ناول "طلسمی فوارہ" لکھا۔ جس کو میں باقاعدہ ناول کہہ سکتا ہوں۔ یہ تمام تر میری صحرا نوردیوں اور بچپن

سے لے کر ریحان جوانی کے تخیلات کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء
میں جب اجمیر سے رسالہ کیف نکلنے لگا تو اس کے لئے پہلا افسانہ "ایثارِ
مجسم" لکھا۔ اس کے بعد اور لکھتا رہا۔ ۱۹۲۹ء میری "قلمکاری" کا سب
سے بڑا دور ہے۔ تنہا اس سال میں میں نے شاید پچاس سے زیادہ
افسانے لکھے ہوں گے۔ جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ اسی
سال میں دو انگریزی ناولوں کا بھی ترجمہ کیا تھا۔

میری تصانیف۔ ہر چند ملازمت نے میرے بہترین اوقات
پر قبضہ کر رکھا ہے۔ مگر میں نے کسبِ معاش سے آگے اس کو کبھی نہیں
بڑھنے دیا۔ ملازمت میرے رجحانِ طبع اور ذوقِ فطری پر مطلق اثر انداز
نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ معیشت کے ابلتے ہوئے لمحات میں سے میں
کیفیات۔ آخری فیصلہ۔ دل کی آواز۔ نگہت۔ دو شیشے، آفتاب اور
چوراہا کھسیٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کے علاوہ تراجم میں ہارڈی کی دو کتابیں
ولیم لی کیو کا ایک ناول، شیریڈن اور البسن کے دو ڈرامے اور ہالکن
کے دو ناول شامل ہیں۔ اور یہ سلسلہ ابھی شاید زندہ رہے گا (جاری نہیں
کہہ سکتا) اتنا ہی کافی ہے ؎

ما نقدِ عمر صرفِ رہِ یار کردہ ایم
کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

وہ اُس کی ماں تھی

نفسِ بہیمہ کی تسکین کے اگر آسان ترین ذرائع فراہم کرنے ہوں تو پیر بن جائے یا فلم ڈائریکٹر۔ عطر، پھول، پان، خوشبودار رنگین قبا، ابراہیمی مانگ، طلسمِ تقوے کی فریب زا فضا، تعویذات کے اثر میں اتفاقات کی مساعدت، یہ وہ سامان ہیں۔ جو بہت بڑی حد تک پیر نمائشی میں کششِ جنسی پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ مرد کہتے ہیں، پیر صاحب کے چہرے پر کیسا نور ہے، عورتیں کہتی ہیں پیر صاحب کی طرف خود بخود دل کھنچا جاتا ہے۔ اِن "ربانی" قوتوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے عورتوں کے دل اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اور پھر اُن کو خود کو خلوت میں کھینچ لیتے ہیں۔ شیطان پیٹھ ٹھونکتا ہے کہ حقِ مریدی تو نے ادا کر دیا۔ تورع کے فرشتے ایک دوسرے کی طرف منہ بسور کر کہتے ہیں "یہ کیا؟"

نو دس برس کی بچی کیسی پیاری پیاری صورت تھی اُس کی، انوارِ محبت کی دیوی، معصومیت کی حور، یہ جو اس گھناؤنی دُنیا میں تھوڑا بہت طہارت کا اُجالا سا نظر آتا ہے۔ وہ بچوں کی معصوم پیشانیوں کی جوت ہے۔ پیر صاحب اس بچی سے بہت خوش تھے۔ اور وہ بھی اُن سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔

مرشد کے پاس ویسے تو شب و روز ہی جوان عورتوں کا اجتماع رہا کرتا تھا۔ لیکن جمعرات کو حاجتمندوں کی اس صنف میں زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ سائیں مستانہ وارسہ زانو بیٹھے ہوئے خدا کی مسترد کی ہوئیں اور شیطان کی ایجاد کردہ کرامات دکھایا کرتے تھے۔ اِنسان کے بیقرار دل کی ہمہ طلبی اُمید کی ایک پست آواز پر اُس کو ہر غیر اللہ کے حضور میں پہنچا دیتی ہے۔ اور مسلمان کی شان میں علامہ اقبال کا فرمودہ یہ مصرع باطل ہو کر رہ جاتا ہے:۔

خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

ایک روز بچی کے والدین کہیں پڑوس میں مدعو تھے۔ سائیں کی غیرت لنگ نے تقاضا نہیں کیا کہ وہ طفولیوں میں شریک ہو کر وہاں پہنچ جائیں۔ مولوی اور پیر ارشاداتِ نبوی میں سے قیلولہ، قیام اور قورمہ (دعوت) پر شدّت سے عمل پیرا ہے۔ تبلیغ، حقوق العباد اور قربانی، ان کے متعلق اس کو اچھی طرح یاد نہیں کہ کوئی حکم ہے خیر تو گھر اکیلا تھا اور مُرشد کو اس روز کھانا کھلانا۔ بچی ہی کے سپرد تھا۔ حسب دُستور اُنہوں نے بارہ بجے کھانا نوش فرمایا اور تین گھنٹے کا قیلولہ بھی کیا۔ فقیر کا سونا بھی عبادت میں داخل ہے۔ آج وہ لڑکی کو بھی اپنے ساتھ حجرے میں قیلولہ کے لئے لے گئے تھے۔

شام کو لڑکی کے والدین مکان پر آئے تو سناٹا پایا۔ مُنّی کو آواز دی۔ جواب ندارد۔ شیخ کے حجرے کو دیکھا تو اُس کا دروازہ بند پایا۔ باہر صحن میں حسب معمول مخلوق مشکل کشا کا انتظار کر رہی تھی۔ حجرے کے اندر داخل ہونا تو کجا اس کا دروازہ تک کھٹکھٹانا خلاف ادب تھا۔ چنانچہ باپ کو تو ہمّت نہیں ہوئی لیکن ماں کی مامتا نہیں مانی۔ اُس نے دروازہ کے پاس جا کر آہستہ سے ڈرتے ڈرتے شاہ صاحب کو آواز دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ آخر چند منٹ کے توقف کے بعد کنڈی کھٹکھٹانے کو ہاتھ بڑھایا۔ دروازے پر ہاتھ لگا اور کواڑ کھل گئے۔ اُس نے جھجکتے ہوئے اندر

جھانکا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ پلنگ پر منّی پڑی ہوئی تھی مگر توبہ، بہت بُرے عالم میں بیہوش۔ اُس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے نازک ہاتھ پیر بندھے تھے اور اُس کی سفید شلوار خون آلود۔

کہتے ہیں کہ اس قصبے میں مُرشد کی بیشمار کراماتوں میں سے یہ آخری کرامت تھی کہ ایک نو دس سال کی لڑکی کے پیٹ میں وہ "نورِ قدرت" اُتار گئے یعنی اس کو معصومیّت کے طارمِ اعلےٰ سے اُتار گئے۔ ماں نے فرطِ غیرت سے زہر کھا لیا۔ باپ دیوانہ ہو گیا۔ اور مُنّی نو ماہ کی انسان ساز مدّت میں ایک بچّے کی ماں بن گئی۔

جب دوشیزگی ایک بار غیر آئینی طور پر ملوّث کر دی جاتی ہے۔ تو وہ عفت سے انتقام لینے کے لئے فواحش کی ماں بن جاتی ہے۔ کانچ کے نازک برتن کو توڑو گے تو اُس کے منتشر ذرّے تمہارے ہاتھوں کا خون چوسیں گے۔

منّی نے بچّے کا گلا گھونٹ کر اپنی دانست میں مار ڈالا اور گھورے پر ڈال آئی۔ اس کے بعد وُہ عصمت کی دُنیا کو تاریک کرنے نکل کھڑی ہوئی۔ وُہ اب جوان ہو گئی تھی۔ اس نے کئی جگہ پاکبازی کو ہزیمت پر ہزیمت دی۔ تقویٰ تھرا کر اُس کے قدموں پر گرنے لگا اور فواحش کی لپٹوں نے عفت کی بستیاں کی بستیاں جلا کر خاک کر دیں۔ بیس سال میں اُس نے قلوپطرہ کے مشن کو اس قدر فروغ دے لیا۔ کہ شہروں کی حسین آبادیاں تمثیلِ مریم کو فراموش کر گئیں۔

پیش پا اُفتادہ لوگوں کی آخری جائے پناہ موت ہی ہے۔ نوجوان رشید گو پڑھا لکھا زیادہ نہ تھا لیکن جاہلِ مطلق بھی نہ تھا کہ کسی کو اُس کی پوری ذات چند روپے ماہوار میں خرید نے میں بھی عار ہو۔ اُس نے نوکری کے لئے بیشمار جتن کئے۔ مزدوری تلاش کرنے میں بہت سر مارا۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ دنیا تہیہ کر چکی تھی کہ اس جیسے بیکار انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ آخر بہ مجبوری قسمت بازی کے تماشہ میں داخل ہو گیا۔ اسفل خواہشوں

کی تکمیل جب ضابطہ کے ساتھ بعض محتاط لوگ کرتے ہیں۔ تو اُن کو بڑا آدمی سمجھا جانے لگتا ہے۔ لیکن شاہراہِ عام پر بیٹھ کر حُسن کو لوٹنے والے انسان کو لوفر کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔ منی بائی کا حسن جہاں فرشتوں کی آنکھیں بچا کر لوٹا جا رہا تھا۔ وہاں شیطان کی نگاہوں کے سامنے بھی اس پر تاخت کا سلسلہ جاری تھا۔

رشید اس کمپنی میں داخل ہوتے ہی ہیرو بن گیا۔ ایک معمولی سے معمولی ایکٹرلیس سے لے کر بڑی سے بڑی حرافہ ایکٹرلیس اُس کا دم بھرنے لگی۔ اُس گھناؤنے ماحول میں اس کو ترغیبیں دی جانے لگیں کہ جوانی کے ولولوں کی بغاوت کے آگے وہ جلد سپر ڈال دے۔

"آپ کو بائی جی یاد فرما رہی ہیں" ایک چھوکرے نے آکر رشید کو منی کا پیام دیا۔

"مجھے؟ اس وقت؟ بھئی میں اس وقت تو نہیں چل سکتا۔ مغرب کی نماز کا وقت قریب ہے" اس نے کہا۔

"مگر وہ تو نیچے موٹر میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں"

"تم جا کر کہہ دو کہ رات کو تھیٹر ہی میں حاضر ہوں گا"

"بہت اچھا" لڑکے نے کہا اور چلا گیا۔

رشید وضو کے ارادے سے اٹھا ہی تھا کہ منی اُس کے افلاس زدہ کمرے میں خود آدھمکی۔ رشید کبھی اس کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہوئے بولا "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو یہاں آنے کی زحمت کرنی پڑی۔ میرا پیام آپ کے لڑکے نے پہنچا دیا ہوگا"

وہ لڑکا میرا نہیں ہے صاحبزادے۔ میرا کوئی لڑکا نہیں ہے" یہ فقرہ اُس نے شاید مدت سے کسی کے سامنے ادا نہیں کیا ہوگا۔ اپنے لڑکے کے وجود کی نفی کرنے کے ساتھ ہی چند منٹ کے لئے اس کی آنکھوں میں وہ اپنی عصمت دری کا سین، وضع حمل کی تکلیف

اور اس سے بھی زیادہ اپنے ہاتھ سے اپنے بچے کا گلا گھونٹنے کا پُر درد واقعہ یاد آگیا۔ وُہ رشید کے کمرے میں اس وقت اپنی جوانی اور حسن کا امتحان لینے آئی تھی، اُس حسن کا جو بغیر زحمتِ امتحان ہمیشہ کامیاب ثابت ہوتا رہا تھا۔ اِس حسن کا امتحان لینے آئی تھی جس نے تقدس کے پائے چوبیں کو ایک دھکے میں ہٹا کر معصیت گاہ تک پہنچنے میں کبھی ناکامی حاصل نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت اس کو اپنی پچھلی روداد حیات یاد آتے ہی ایک سناٹا سا آگیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ و شباب باختہ عورت کی طرح تکان سے چٹائی پر لڑکھڑا کر بیٹھ گئی۔

"کیوں خیریت؟ آپ کا مزاج کیسا ہے؟" رشید نے گھبرا کر پوچھا۔
گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ گرمی کی وجہ سے ذرا چکر آگیا
میں برف لاتا ہوں ذرا ٹھہریئے۔"

نہیں نہیں۔ میری طبیعت اب درست ہے۔" اس نے سکون پذیر ہوتے ہوئے کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم نماز پڑھنے والے تھے۔ پڑھو اپنی نماز۔ کیا مدعا ہے تمہاری اس نماز کا؟"

کوئی خاص مدعا نہیں۔ ایک بے طلب دل کا شکستہ فرض ہے جس کو دنیوی پابندیاں اچھی طرح ادا نہیں کرنے دیتیں۔"

"کیا رشید تم کو خدا نے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ کیا اس نے کبھی تمہاری معصوم زندگی میں غیر متوقع گناہوں کے اسباب فراہم نہیں کئے۔ کیا اُس نے تمہاری پاکدامانی کو خود اپنے ہاتھوں آلودہ کرنے کو اپنے گماشتے نہیں بھیجے۔"

"نہیں کبھی نہیں۔ اس نے اس کے برعکس افلاس میں مجھے ایک صابر دل اور جوانی کی تاریکیوں میں ایک روشن و عفیف روح بخش کر مجھ سے کہہ دیا کہ جا ہماری وسیع زمین پر آسائش ڈھونڈ ــــــ"

"پھر کبھی تمہارے ہاتھ میں آسائش کی دُم بھی آئی؟"
"میں حقیقی آسائش سکون روحانی میں سمجھتا ہوں۔ اگر پُر آشوب ماحول کے ایک لمحہ کو بھی آپ جیسا اپنی مرضی کے مطابق بنانے میں کامیاب ہوجائیں۔ تو میں سمجھتا ہوں۔ کہ زندگی کے دوسرے مچلتے ہوئے لمحات رعب میں آکر خود بخود آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔"

"بیوقوف نوجوان تم ناممکنات پر قابو نہ پاکر ان طفلانہ خیالات سے اپنے کو دھوکا دے رہے ہو۔ کیا تم ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ یہ تمہارے گندی دل کی کبھی تمنا نہیں کرتی کہ رات کی گذری ہوئی ساعتوں میں کوئی حسینہ تمہارے قوی ہاتھوں سے مغلوب ہو کر اس پھول پر پڑی ہو؟"

"اس کے برعکس میری یہ تمنا ہے۔ کہ ہر میلے سے میلے مقام اور ہر گندی سے گندی جگہ کو بھی ایک سجدہ طہارت کے قابل بنا سکوں۔ آپ غلطی پر ہیں۔ جوانوں کا مسلک محض عیش کوشی و شہوت آزمائی نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا مشن کبید گیوں کی تطہیر ہے۔"
"تم پاگل ہو۔ آج رات کو میں تم کو اسٹیج پر بتادونگی کہ فطری خواہشوں کو غصہ دلانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اس وقت تم خود محسوس کرلوگے کہ یہ جو تم نے گندگی پیدا کرنے والے جذبات میں چند خانہ ساز اصولوں کے بھاری بھاری قفل ڈال رکھے ہیں۔ کس طرح میری ابرو کی ایک جنبش پر خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں امید ہے کہ تم وقت پر تماشہ گاہ پہنچ جاؤ گے۔"
یہ کہہ کر مِسّی ایک تمکنت کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اُس کی چند لمحہ پیشتر کی حسیاتی کمزوری رفع ہوچکی تھی اور وہ اب پھر ایک بار داعیہ معصیت کی پوری شان سے دنیا کو گناہوں کی حسین بستی کی طرف کھینچنے والی ہستی نظر آرہی تھی۔
آج کے تماشے کا ہیرو رشید تھا۔ اور ہیروئن خود مِسّی بنی تھی۔ اس کو اپنے اداکارانہ

کمالات پر پورا بھروسہ تھا کہ ہیروئن کا پارٹ نہایت کامیابی سے ادا کر سکے گی پھر چونکہ ہیرو کی جانب اس کا دل خود کھنچ چکا تھا۔ اس لئے ایکٹنگ کے نیچرل ثابت ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس نے نہایت اہتمام سے لباس تبدیل کیا اور بکمال احتیاط آرائش و تزئین میں وقت صرف کیا۔ آئینہ جس قدر حسن نمائی کی قدرت رکھتا تھا صرف کئے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اب اظہار عجز کرنے لگا۔ اس کے بعد وہ ناقدین جمال کے سامنے آئی۔ جن کا متفقہ فیصلہ تھا کہ حسن اس کے پیکر جمیل سے اُبلا پڑا جا رہا تھا۔

رشید نے جونہی نگار خانے میں قدم رکھا اس کے پیر ڈگمگا اُٹھے۔

"کہئیے مولوی صاحب مزاج اچھا ہے؟" منی کی ایک حسین شاگرد نے پوچھا۔

بالکل اچھا ہے۔ آج تو آپ کی اُستانی قیامت بنی ہوئی ہیں۔ شمو یہ تم لوگ آرائش میں اس قدر اہتمام کیوں کیا کرتی ہو؟"

"تاکہ تم لوگوں کو بآسانی لبھایا جا سکے"

"اس کے یہ معنی کہ یہ تمام تکلف ہم غریبوں کی جانِ ناتواں کی خاطر کیا جاتا ہے۔ مگر تم لوگ تو اس طرح خود اپنے ہاتھوں بیوقوف بنتی ہو۔ ایک مرد کی رغبتوں کو جیتنے کے لئے تم کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ غریب عورتو! کیسی عجیب بات ہے کہ تم اپنے حسن سے خود محظوظ نہیں ہوتیں بلکہ یہ سب کچھ ہماری ضیافتِ نظر کے لئے کیا جاتا ہے۔ تمہاری زیادہ سے زیادہ خوشی صرف اس تسکین میں سمٹ کر رہ جاتی ہے کہ دس کے بجائے آج پچاس آنکھوں نے تم کو زیادہ اشتیاق سے دیکھا۔

اس اثنا میں گھنٹی بجی اور تماشا شروع ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خاص پارٹ بھی آ گیا جس میں رشید اور منی کو شریک ہونا تھا۔ منی شعلۂ جوالہ بنی ہوئی اسٹیج پر آئی۔ اس کا بے شمار تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد میاں

رشید نے قدم رکھا۔

منّی آج اپنی اداکاری میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے آج اسٹیج پر اپنی رُوح بچھا دی تھی۔ رشید بھی اپنے پورے کمالات دکھا رہا تھا۔ آخر وُہ موقع آیا جب ہیروئن کو بکمال محبت ہیرو کے آغوش میں گرنا تھا۔ منّی ہاتھ پھیلا کر رشید کی طرف دوڑی اور اپنی روح کو رشید کی روح میں اس وقت اُس نے مدغم کر دینا چاہا۔ محبوب کو چاہنے کی پوری سرگرمی اس کے عضو عضو سے ٹپک رہی تھی۔ رشید کے مردانہ سینے کے اندر اُس نے اپنے آرزومند دل کو دھکیل دینا چاہا۔ اس نے اپنی باہیں اُس کی گردن میں حائل کرنی چاہیں اور سر اس کے آغوش کے سپرد کر دینا چاہا ———— دفعتاً لاتعداد تالیاں بلند ہوئیں اور بے شمار قہقہے سنائی دئے۔ منّی کو ہوش آیا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نامعلوم کب۔ نجانے کس طرح۔ رشید اس کی گود میں تھا۔ اور وہ ماں کی پوری ممتا کے ساتھ اس کو چوم رہی تھی۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور رشید "میرے بچے میرے بچے" کی صدا ان میں سے سُن رہا تھا!

کرشن چندر

میری زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں جس کا میں خاص طور پر ذکر کر سکوں، رسماً چند تفاصیل عرض کئے دیتا ہوں۔

دسمبر ۱۹۱۲ئہ میں پیدا ہوا، عمر کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذار دیا۔ کشمیر کی خوبصورتی اور غریبی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اور اجتماعی طور پر خوبصورتی کو پالینے اور غریبی کو کھو دینے ہی کو میں انسانیت کے بنیادی مسائل سمجھتا ہوں، اور اکثر انہی کے متعلق لکھنا پسند کرتا ہوں۔

کہانیوں کے تین مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں "طلسم خیال" "نظارے" "ٹوٹے ہوئے تارے" اور طویل مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ "زندگی کے موڑ پر" اور مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ "ہوائی قلعے" اور ایک ناول "شکست" کے نام سے شائع ہوا ہے، "نئے زاویے" میں میں نے ہندوستان بھر کے ترقی پسند ادیبوں کے افکار عالیہ جمع کئے ہیں۔ اسے میں نئے افکار، نئے مسائل اور نئے تجربوں کا ادبی مرکز بنانا چاہتا ہوں، اور مجھے خوشی ہے کہ میرے سب رفقاء ہندوستان کے تمام صوبوں سے اس میں شریک ہو رہے ہیں۔ "نئے زاویے" کی پہلی جلد ماہ اگست ۱۹۴۰ئہ میں شائع ہوئی ہے۔

ناول "جنت اور جہنم" ناتمام پڑا ہے پتہ نہیں کب مکمل ہو۔

تعلیم :۔ ۱۹۳۴ء میں فارمین کرسچین کالج سے ایم اے میں انگریزی ادبیات کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ایک سال تک بعارضہ یرقان اور اختلاج قلب بیمار رہا۔ اس کے بعد لا کالج لاہور میں داخل ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا لیکن وکالت کی پریکٹس کبھی نہیں کی۔

۱۹۳۵ء کے اواخر میں یا ۱۹۳۶ء کے شروع میں اردو میں لکھنا شروع کیا۔ پہلا مضمون "ہمایوں" میں دوسرا "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد "ناردرن ریویو" کے نام سے ایک انگریزی ہفت نامہ پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں کے ساتھ مل کر نکالا، پرچہ ادبی تھا، تخیل انارکسٹانہ، پالیسی غیر متعین، اس لئے ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا، گو سمندر پار کے انگریزی اور امریکی ادیبوں نے بھی اس میں شرکت کی۔

عادات۔ بہت اچھی نہیں، تھوکتا بہت ہوں، باتیں کم کرتا ہوں۔ بہزار کوشش بدن کے کپڑے ناصاف رہتے ہیں۔ لگا ہے گاہے منشیات کا استعمال بھی کر لیتا ہوں۔ اس میں بھنگ اور چرس شامل نہیں) اکثر بیمار رہتا ہوں۔ اور رنج اس امر کا ہے۔ کہ اخباروں میں میرے متعلق بلیٹن نہیں چھپتے۔

بے رنگ و بُو

سکھ دکاندار نے جو آٹا۔ نون۔ تیل بیچتا تھا۔ آہستہ سے کہا ”میرے مکان میں تھوڑی سی جگہ خالی ہے۔ آپ خود چل کر دیکھ لیجئے، کرایہ بھی کم ہے۔ صرف نو روپیہ ماہانہ۔ میں خود آپ کے ساتھ گلی میں چلتا ہوں۔“

سکھ دکاندار نے سائیکلوں کی دکان کے مستری کو آواز دی ”اور حمو! ذرا میری دکان کا خیال رکھنا۔“

”کوئی فکر نہ کرو سردار صاحب“

سکھ دکاندار جہاں رہتا تھا۔ وُہ چھوٹا سا مکان تھا ’ایک ہی منزل، ایک ہی نہانے کا کمرہ، سیڑھیوں کے قریب ایک چھوٹا سا تنگ کمرہ خالی تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف کُھلتا ہُوا ایک چھوٹا سا آنگن۔“

”بس اس چھوٹی سی جگہ کے لئے نو روپیہ ماہانہ کرایہ۔

سکھ دکاندار نے ایک پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا ”تو اور کیا ہم بھی نو روپیہ ہی دیتے ہیں۔ بجلی پانی کے نل کا کرایہ ملا کہ بارہ روپے ہو جاتے ہیں۔ مہینہ بھر میں بمشکل تیس پینتیس روپیہ کماتا ہوں۔ بارہ روپیہ مالک مکان کو دے دیتا ہوں۔ آٹھ دس روپیہ حکیم صاحب کی نذر

کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں۔ بیوی بچوں والے گھر میں آٹھ دس روپے کچھ زیادہ نہیں، باقی — باقی — مشکل سے گزر ہوتی ہے۔

سکھ دکاندار کی زرد رو بیوی الگنی پر دُھلے ہوئے فراک لٹکانے کو نکلی، ایک بچہ اس کی دھوتی کا گوشہ پکڑے روئے جاتا تھا۔ ایک بچہ وہ گود میں اٹھائے تھی جو اپنے ننھے ہاتھوں میں کھانڈ کے بتاشے پکڑے ہوئے تھا، ایک بچہ اس کے پیٹ میں تھا۔

سکھ دکاندار نے کھانستے ہوئے کہا "تو یہ گھر — آپ — آپ کو پسند نہیں؟"

"جگہ تو اچھی ہے لیکن ذرا — اس کمرے میں اندھیرا بہت ہے"

سکھ دکاندار کی کھانسی تیز تر ہوتی گئی۔ آخر رُک کر بولا "ہاں...... اندھیرا...... اندھیرا نو روپے ماہانہ میں اندھیرا نہ ملے گا۔ تو اور کیا روشنی مِل سکتی ہے؟"

یہ گلی پکی تھی، صاف ستھری، سہ منزلہ مکان، دہرے دروازے، مچھروں اور مکھیوں کو روکنے کے لئے۔ جگہ جگہ قہقہوں کی آوازیں، — گراموفونوں کے ریکارڈ، ہارمونیم کی صدائیں، ایک مکان دیکھا، بہت بڑا مکان سرخ سیمنٹ کا فرش، تین چار کرایہ دار پہلے ہی سے رہتے تھے صرف ایک حصّہ جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ خالی تھا۔ کرایہ پندرہ روپے۔

مجھ سے کسی نے کہا "مالک مکان عقب کی گلی میں رہتے ہیں۔ آپ ان سے معاملہ طے کر لیجئے۔"

عقب کی گلی کے آخری کونے پر جنوب کی طرف ان کا مکان تھا گھنٹی بجائی تو ہنستے ہوئے باہر نکلے۔

"نمستے"

جی نمستے، آپ اس (ہاتھ سے اشارہ کر کے) کمرے میں تشریف رکھئے۔ میں ابھی کھانا ختم کر کے آتا ہوں۔ بس ایک منٹ میں آجاؤں گا۔ مجھے دفتر بھی جانا ہے"

دوسرے کمرے میں ایک تنگ پرانی وضع کے صوفے پر جس پر نیلی چھینٹ کا غلاف چڑھا ہؤا تھا۔ بابو صاحب کی بیوی لیٹی ہوئی تھی۔

"مجھے زکام ہے، معاف کیجئے گا۔ میں اُٹھ نہیں سکتی"، مالکہ مکان نے لیٹے لیٹے اور کشمیری شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔

میں نے مسکرا کر کہا "کوئی ہرج نہیں، مجھے بھی زکام ہے"۔

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ بابو صاحب کمرے میں داخل ہوئے ہمیں ہنستے دیکھ کر ان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"آپ نے مکان دیکھ لیا؟ پسند ہے؟" ان کے لہجے میں خفیف سی درشتی تھی۔

"دیکھ لیا، پسند ہے"۔

"کرایہ ہر مہینے ہم پیشگی لے لیتے ہیں!"

"اچھی عادت ہے"۔

"لیکن" بابو صاحب" میری بات پر ہنسے نہیں، بولے کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آپ اکیلے تو نہ ہوں گے؟ آپ کے ساتھ عورتیں ہوں گی؟ اور بچے بھی، دیکھئے نا یہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں؟

وہ اِن دو فقروں میں اپنی معاشرت کی پوری داستان کہہ گیا۔ "یہاں جس مرد کے پاس عورت نہیں۔ اس کی نہ تو منگنی ہو سکتی ہے۔ اور نہ اُسے کوئی مکان کرایہ پر مل سکتا ہے، اور جس عورت کے پاس بچے نہیں۔ اس کا خاوند دوسرا بیاہ کر لیتا ہے۔ اور دوسری عورت بھی بچے نہ جنے تو تیسرا بیاہ......

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

بابو نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "معاف کیجئے گا یہ بہو بیٹیاں والا محلہ ہے"۔

بابو کی بیوی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا، دروازے کے

قریب ایک نوجوان لڑکی بغل میں کتابیں لئے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے گال تمتما گئے۔ اونچی آواز میں بولی "ودے منڈو، جلدی کر، کالج دیر ہو گئی"۔
"آیا بی بی جی" نوکر ہنستا ہوا سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ کوئی سولہ سترہ برس کا ہو گا۔ بھیگی بھیگی مسیں سڈول اعضاء

یہاں نئے مکان بن رہے تھے۔ ابھی بہت سی جگہ خالی تھی۔ یہاں ریت اُڑ رہی تھی۔ اور شور مچاتے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر مٹی پھینک رہے تھے۔ ننھی منی لڑکیاں ریت پر بطخوں کی طرح چلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یا ایک لمبی رسی پر کودنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ بھنے ہوئے چنے بیچنے والا یاس انگیز نگاہوں سے بچوں کی طرف دیکھتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس ریتلے میدان سے پرے دور سامنے ایک مکان پر موٹے حروف میں لکھا تھا "کرایہ کے لئے خالی ہے"۔
دروازہ کھلا، ایک چھوٹا سا دالان، اس کے آگے کھلا آنگن، جس میں پانی کے نل کے نیچے بیٹھی ہوئی ایک بدصورت فربہ اندام عورت نہا رہی تھی بغیر کسی جھجک کے بولی "آپ مکان دیکھنے آئے ہیں؟"
میں نے دل میں کہا "اور کیا تمہیں دیکھنے آیا ہوں" جیسے اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہو۔ بولی۔ "اچھا آپ ذرا دالان میں ٹھہریئے میں ابھی آتی ہوں"۔
وہ ایک سفید دھوتی پہنے ہوئے آئی۔ یہ سونے کا کمرہ ہے، یہ بیٹھک، یہ ایک اور کمرہ یہ بھی ایک کمرہ ہے۔ یہ رسوئی ہے۔ ذرا ناصاف ہے لیکن کل تک بالکل ——— (سر ہلا کر) ہو جائے گی۔ کرایہ بیس روپے، ہم پیشگی لیتے ہیں۔ اچھے کرایہ داروں کو دیتے ہیں، دوسری منزل میں ایک رائے صاحب کے "گھر والے" رہتے ہیں۔ ان کی تین لڑکیاں ہیں، کالج میں پڑھتی ہیں۔ تیسری منزل میں ایک پروفیسر صاحب اور ان کی بیوی اور بچے ......"
میں نے پوچھا "اور تیسری منزل سے اوپر؟"

وُہ حیران ہو کر بولی "تیسری منزل سے اُوپر؟ ——— اس سے اوپر چھت ہے سونے کے لئے کھُلی جگہ، اور ایک طرف رفع حاجت کے لئے تین کمرے۔"

"ہوں!" میں نے کچن کے فرش کو ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ فرش ذرا ناصاف ہے کل تک ——— (سر ہلا کر) ———" پھر میری طرف دیکھ کر بولی "آپ شادی شدہ ہیں نا؟"

"نہیں۔ لیکن میرے ساتھ میری خالہ ہوں گی اور خالہ کی لڑکی اور خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں"

"او، اچھا ——— پھر تو ٹھیک ہے۔ لیکن کرایہ پیشگی دینا ہوگا۔ کم از کم ایک دو مہینوں کے لئے۔ کئی کرایہ دار بغیر کرایہ ادا کئے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں بہن نہیں ابھی پچھلے مہینے ہی آٹھ روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔"

اب یہ ایک جوان عورت چپکے سے کہیں سے نکل آئی تھی۔ اچھے نقش تھے۔ لیکن چہرہ کچھ اُترا ہوا، کچھ اداس سا، بڑی بڑی آنکھیں لیکن ملول، رنجیدہ، لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ لیکن پھیکی، تاسف انگیز، گویا کہہ رہی تھی۔ اس سے کیا فائدہ، وُہ دن بھر دفتر میں کلرکی کرتے ہیں۔ اور میں لبوں پر سرخی لگا کر برتن مانجھتی ہوں۔ آخر اس زندگی سے کیا فائدہ وہ شام کو تھکے ماندے آتے ہیں۔ اور پھر دفتر کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں، اور رات کو ——— میرے لبوں کی سرخی دیکھتا ہی کون ہے؟ ہائے، یہ زندگی کس قدر پھیکی اور بے مزہ ہے۔

"یہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہتی ہیں" مالکہ مکان نے مجھے بتایا "ان کے ——— بجلی کے دفتر میں نوکر ہیں۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "جی بہت اچھا، نمستے جی۔"

کلرک کی بیوی نے خوش ہو کر کہا "آپ ——— یہ مکان کرایہ پر لے رہے ہیں؟"

"جی سوچ رہا ہوں، میرے ساتھ خالہ ہوں گی، خالہ کی لڑکی، خالہ کی لڑکی کی لڑکیاں اور ———"

"تو پھر جی کیا ہے"؟ اس نے خود بخود ہنستے ہوئے کہا۔ "ہم سب بہنیں مل جل کر گزارہ کر لینگی
گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے نا، اور پھر یہ بڑا اچھا مکان ہے" اس لئے کچن کے فرش کو
پاؤں سے بجاتے ہوئے کہا۔ "یہ فرش ذرا نا صاف ہے" بدعورت فربہ اندام عورت ایک کل
کی طرح بول اٹھی "کل تک (سر ہلا کر) ——"

میں آہستہ آہستہ باہر دالان کی طرف مڑنے لگا، نوجوان عورت کی آنکھیں کہہ رہی تھیں
کیا ہی اچھا ہوتا، اگر تم یہ مکان لے لیتے، مجھے تمہاری محبت تو درکار نہ تھی۔ اور میں اس قسم
کی باتوں کو پسند بھی نہیں کرتی، لیکن یوں ہی دل بہلا رہتا۔ وہ دن بھر دفتر میں رہتے ہیں۔ صبح
سے لے کر شام تک۔ تم کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا کرتے اور میرے لبوں کی سرخی چمک
اٹھتی۔ کیا ہی اچھا ہوتا، افسوس یہ زندگی کتنی بھدی اور بے رنگ و بو ہے"

"میں کل تک آپ کو پتہ دوں گا" نمستے"

"نمستے" دونوں عورتوں نے کہا۔

ریتلے میدان میں ایک گوری رنگت کا مزدور لکڑیاں چیر رہا تھا، کھٹ کھٹ، کھٹا
کھٹ، مجھے گزرتے دیکھ کر رُک گیا "سلام صاحب"

"سلام کہاں کے رہنے والے ہو، کشمیری ہو"

"نہیں صاحب کلو کا گدی ہوں"

گورا رنگ، تنے ہوئے پٹھے، بہت میلی نیکر، میلی پھٹی ہوئی قمیص، کشادہ چھاتی، اور ہاتھ
میں ایک مضبوط کلہاڑی۔

"کلو، کلو؟"

"جی سرکار"

"بیوی ہے؟"

گدی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جی سرکار" بیوی کے نام پر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ کیا ہوا، اگر وہ غلام ہے، کم از کم اس کا بھی تو ایک غلام ہے!

گدی اپنی خوش قسمتی پر نازاں مسکرا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے میلے دانت سرخ مسوڑھوں میں نقلی طور پر جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"بچے بھی ہوں گے؟"

"جی سرکار، ایک لڑکا ہے، ننھا سا (ہاتھ سے اشارہ کر کے) اتنا سا"

"انہیں بھی ساتھ لائے ہو؟"

گدی کی مسکراہٹ جیسے کسی نے پاؤں تلے مسل دی ہو۔ اس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔ بولا "صاحب کوئی کام دیجئے میں لکڑیاں خوب چیرتا ہوں"

"ایک من کا کیا لیتے ہو؟"

"ایک آنہ"

"ایک آنہ؟ صرف ایک آنہ؟ ارے ——————— صرف ایک آنہ؟ آدھے دن کی کمائی"

"سرکار لوگ ایک آنہ بھی نہیں دیتے"

"تم واپس کلو کب جاؤ گے؟"

لکڑی چیرنے والا ریت پر بیٹھ گیا اور حقہ پینے لگا۔ شاید وہ دھوئیں کے حلقوں میں کلو کے سرسبز مرغزار، برفانی چوٹیاں، کالی سلیٹ کی چھتوں والے گاؤں اور اپنی بیوی اور ننھے منے بچے کی تصاویر دیکھ رہا تھا۔

میں آگے بڑھ گیا۔ لکڑہارے نے یاس انگیز لہجہ میں کہا "صاحب کوئی کام بتلائیے"

شام کو میں پھر اپنے سرائے نما ہوسٹل کے دروازے پر پہنچ گیا۔ قید خانے کی طرح تنگ کموں

کی قطاریں، بھُنی ہوئی پیاز کی بُو۔ بڑے سے آنگن میں بے ترتیبی سے بچھے ہوئے پنچ، آٹھ دس لڑکوں کے مجمع میں راج ہنس چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ "ہم انقلاب چاہتے ہیں۔ انقلاب، بورژوا عمومی انقلاب، اور پھر اشتراکی انقلاب، اور پھر خالص سو فیصدی مارکسی انقلاب، ہم ایک نئے تمدّن، ایک نئی تہذیب، ایک نئی معاشرت کی بنا پر ایک نئے انسان کی تخلیق چاہتے ہیں۔ ہم ...." بیچارہ راج ہنس۔

مطبخ کا ملازم میرے قریب سے گزر گیا۔

میں پکارا۔ "او دینے! آج کیا پکا ہے"

"ساگ، دال، اور کانشی پھل"

۹۷ نمبر میں رہنے والا برہمن لڑکا رام نام کی دھوتی پہنے باتھ روم میں نہانے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور بستر پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

راج ہنس اپنی پتلی آواز میں اب تک چلا رہا تھا۔ "ہم اس استعماری نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اسے پیس کر رکھ دیں گے۔ اس کے پرخچے ......"

بھیا لال کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اُداس لہجے میں پوچھا۔ "تم نے مکان لے لیا اب تم ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ اپنے سب رفیقوں کو!"

میں نے جواب دیا۔ "میرے لئے یہ سرائے ہی بہتر ہے۔"

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام سیّد بشیر ہندی پرنٹر پبلشر چھپکر

اُردو محل لاہور

۵ ٹمپل روڈ لاہور سے شائع ہوا

